U10992 10-12-09

Title - DEEWAN MOMIN MAY SHIREH

Creator - MOMIN Khan Momin Dehelvi; Murattiba Zia Ahmad Zia.

Publisher - Shanti Press (Allahabad).

Date - 1962

Pages - 267.

Subjects - Urdu Shayari - Kulliyaat-o-Dawaween. Momin Dehelvi, Momin Khan Momin - Sawaneh-o-Tanqeed.

کَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝

تصنیفِ عشق معنی و ترکیب دیگر است
ما شرحِ نکتۂ ز صد افسانہ می کنیم

الحمد للہ

کہ

دیوان مومن

مع شرح

...میں رئیس المتغزلین حکیم محمد مومن خاں مرحوم دہلوی
...زلیات و فردیات و معمیات مکمل تصحیح و تحشیہ اور مفصل مقدمہ
کے ساتھ شامل ہیں

مرتبہ

...یاء احمد ضیا ایم اے، بدایونی لیکچرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
(مع تعارف از ڈاکٹر سید محمد حفیظ ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ لیکچرار الہ آباد یونیورسٹی)

شانتی پریس الہ آباد میں طبع ہوا

۱۹۴۷ء

قیمت للعہ

فہرست مندرجات

تقدمہ

گُل آورد سعدی سوئے بوستاں
بہ شوخی چو فلفل بہ ہندوستان

اگر بوستاں میں ہدیۂ گُل لیجانے کی شوخی پر سعدی کو معذور رکھا جاسکتا ہے تو مجھے توقّع ہے کہ اس ناچیز ادبی نذر کو ادب نواز علم پرور نواب مسعود یار جنگ ڈاکٹر سر سید راس مسعود وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کی خدمت والا میں پیش کرنے کی جسارت پر میں بھی موردِ ملامت نہ ٹھہروں۔

خطا نمودہ ام وچشمِ آفریں دارم

نیاز آگیں ضیاء

دیباچہ

طبع ثانی

دل نشیں شد سخنم تا تو قبولش کردی
آرے آرے سخنِ عشق نشانے دارد

خدا کا شکر ہے کہ شرح دیوان مومن کو ملک میں قبول عام حاصل ہوا۔ ممتاز ارباب فضل نے تحسین فرمائی۔ مشہور اہل قلم نے تعریفی ریویو لکھے۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ اور تلامذہ نے شوق کے ہاتھوں سے لیا اور قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ مسلم یونیورسٹی اور بعض دوسرے اداروں نے شامل نصاب کیا۔ شرح مذکور میں تین خصوصیات کا التزام رکھا گیا تھا۔ شروع میں تحقیقی مقدمہ۔ متن میں تصحیح شدہ کلام۔ اور ذیل میں تشریحی حواشی۔ اب جب کہ طبع ثانی کی نوبت آئی تو کتاب پر نظر ثانی کا خیال ہوا۔ چنانچہ ہر ممکن سعی کی گئی ہے کہ زیر نظر ایڈیشن سابق سے بہتر اور مفید تر ثابت ہو۔ اس دوران میں کلام مومن کے کچھ اور قدیم اور صحیح نسخے دستیاب ہوئے۔ جن میں سنہ ۱۸۳۴ء (موجودہ لٹن لائبریری علی گڑھ) سنہ ۱۸۴۸ء (مملوکہ خود) اور سنہ ۱۸۵۶ء (مقبوضہ محمود میاں زبیری مارہروی) کے مخطوطات قابل ذکر ہیں۔ اُن سے دیوان کی تصحیح اور مقابلہ کیا گیا۔ علاوہ بریں شرح اشعار میں جا بجا توضیح یا ترمیم سے کام لیا گیا۔ قصد تھا کہ مقدمے میں بھی ایک باب کا اضافہ کیا جائے جس میں شاعر کے طرز فکر کی نفسیاتی تشریح اور اُس کے تاریخی پس منظر کی کامل تنقیح ہو۔ مگر اہل مطبع کو عجلت ہے اور یہاں فقدان فرصت، اس لئے یہ ارادہ فی الحال معرض التوا میں رکھا گیا۔ اِس جگہ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ عرصہ ہوا ملک کے بعض رسائل میں چند اشعار کی شرح پر ایرادات شائع ہوئے تھے۔ اُن پر غور کرنے کے بعد اگرچہ بعض جگہ راقم کو اپنی رائے میں ترمیم کرنی پڑی۔ لیکن بیشتر مقامات پر سابق تشریح کی صحت پر مزید شرح صدر بہم پہنچا۔ بہر حال راقم سطور نے دونوں قسم کے ایرادات سے یک گونہ فائدہ اُٹھایا۔ اور اسلئے دونوں کا شکر لازم آیا۔

علی گڑھ۔ یکم فروری سنہ ۱۹۴۷ء

ضیاء احمد

پروفیسر ضیاء احمد ضیا بدایونی

حیرت زدۂ جلوۂ نیرنگ خیالم
آئینہ مدارید بہ پیش نفس ما

تعارف

(از ڈاکٹر سید محمد حفیظ، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ)

ہمارے سامنے دنیا کی کون شے ہے جو ایک مستقل موضوع کی حیثیت نہیں رکھتی اور پھر کون سا موضوع ہے جس پر کچھ نہ کچھ ہر شخص اظہار خیال نہیں کر سکتا لیکن واقعہ یہ ہے کہ حقیقی طور پر اظہار خیال کا وہی شخص حق رکھتا ہے جو اُس موضوع سے مناسبتِ خاص کی بنا پر ایک مخصوص ذہنیت اور مخصوص بصیرت کا حامل ہو۔ تصنیف و تالیف کی اس وبائے عام میں اس نکتہ کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ پریس اور مشینوں کی لگاتار تگ، و دو کے باوجود شاذ و نادر ہی کوئی کتاب ہمارے سامنے ایسی آتی ہے جسے صحیح معنوں میں ہم ایک علمی و ادبی کارنامہ کہہ سکیں۔

یہ کلیہ علوم و فنون سے لیکر تنقید ادب کے ہر شعبہ پر یکساں طور پر محتوی ہے شیلی کی شاعری پر جب فرانسس ٹامسن نے قلم اُٹھایا تو انگلستان کو معلوم ہوا کہ شیلی کا شمار اُس کے غیر فانی شعرا میں ہے۔ میر انیس عام طور پر ایک مرثیہ گو اور مرزا دبیر کے ،مقابل سمجھے جاتے تھے مگر علامہ شبلی مرحوم نے جب "موازنہ انیس و دبیر" لکھا تو لوگوں کو اُن کی شاعری کی صحیح قدر و قیمت آنکھوں سے نظر آنے لگی، غالب کی نظم و نثر صرف نظم و نثر تھی مگر اس کی اہمیت و خصوصیت اُس وقت معلوم ہوئی جب حالی نے "یادگار غالب" لکھکر اُسے عالم آشکارا کر دیا۔ مذکورہ مثالوں میں "مخصوص بصیرت و مناسبت" کی کارفرمائیاں نہیں تو اور کیا ہے؟

مومن کی شاعری اپنی چند در چند خصوصیات کی بنا پر اُردو شاعری
میں ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ تراکیب کی جدّت، خیالات کی نزاکت
کے علاوہ اُن کی اصل چیز اُن کے محذوفات شعری ہیں جن سے اگر ایک طرف
نُدرت اور لطافت پیدا ہوئی ہے تو دوسری طرف ایک طرح کا اشکال و
ابہام بھی پیدا ہوگیا ہے جس سے عام طور پر اُن کے کلام سے لطف اندوز
ہونا دشوار ہوگیا ہے۔ دوسری چیز جو مومن کو شعرائے اُردو سے ممتاز کرتی
ہے وہ اُن کا مخصوص طرزِ تغزل ہے۔ اُنھوں نے غزل میں حُسن عشق و
محبت کی ترجمانی کی ہے وہ ترغیبات جنسی سے آگے نہیں بڑھتی۔ اُنھوں
نے فلسفہ یا مابعد الطبیعیات کی وادیوں میں قدم نہیں رکھا بایں ہمہ جرأت و
انشا کی سی بیباکی و عریانی اُن کے کلام میں بہت کم ہے۔ اُنھوں نے
فطرت انسانی کی گہرائیوں سے موتی نکالے ہیں اور ایسے لطیف کیفیات
وحسیات کو برافگندہ نقاب کیا ہے جو لفظ و بیان کی خفیف سی ٹھیس کے
بھی متحمل نہیں ہو سکتے۔ عشق و محبت کے وہ نازک واردات جن کا تجزیہ و
استقصاء صرف ایک حسّاس فطرت ہی کا حصّہ ہے۔ مومن کے کلام میں
اس کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ اُن سے نفسیات محبت کی ایک مستقل
و مکمل تفسیر تیار ہو سکتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ شعر میں اخلاق و تصوّف
نہ ہو یا وہ دنیاوی عشق و محبت کے جذبات سے آلودہ نہ ہو۔ شعر اور ایک
عمدہ شعر کی پہلی اور شاید آخری شرط کیفیت۔ لطافت اور بداعت اسلوب
ہے۔ اگر یہی چیزیں نہ ہوئیں تو صرف موضوع و مضمون کے اعتبار سے
کوئی شعر حقیقی معنوں میں شعر کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ اگر ایک ناظم

نے اخلاق، فلسفہ اور تصوّف کو نظم کر دیا یا دوسرے نے ہوس پرستانہ امور کو ردیف اور قافیے میں جکڑ دیا لیکن اس میں طرزِ بیان کی لطافت نہ ہوئی تو یہ دونوں باتیں یکساں طور پر صحیح شعر کی تعریف میں نہیں آسکتیں۔ اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو اس اعتبار سے بھی اُردو شاعری میں مومن کا کلام ایک بہت ہی مخصوص و منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اسلئے اس کا پورا لطف اُس وقت تک نہیں اُٹھایا جاسکتا جب تک اُن کے کلام کی شرح اور اُن کی خصوصیات شعری کو تفصیل و بسط کے ساتھ پیش نہ کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ کام مناسبت طبع، صحت مذاق اور جگر کاوی کا محتاج ہے۔ علم و فضل اور ایک مخصوص ذہنیت کے علاوہ ضرورت ہے بالاستیعاب مطالعہ کی جس کے بغیر مومن کے کلام کی تشریح و توضیح بوجوہ احسن انجام نہیں پاسکتی اس کی تصدیق موجودہ شرح غزلیات مومن مرتبہ جناب ضیاء احمد صاحب ضیا بدایونی سے بخوبی ہوسکتی ہے۔

مولوی ضیاء احمد صاحب ضیا کا خاندان علم و ادب کے لحاظ سے بہت ممتاز ہے۔ آپ کے والد ماجد مولوی محمد رفیع احمد صاحب عالی مرحوم نہایت ذی علم اور صاحب مذاق بزرگ تھے۔ جو فن شعر میں کافی دستگاہ رکھتے تھے اور صاحب دیوان تھے۔ خود جناب ضیا نے الہ آباد یونیورسٹی سے درجہ اوّل میں ایم۔اے کیا اس کے بعد ریسرچ اسکالر رہے۔ آپ کا شمار نہایت ذہین وطباع طالب علموں میں تھا۔ آپ نے فارسی کے علاوہ عربی میں بھی قابل قدر استعداد بہم پہونچائی تھی۔ الہ آباد یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تین سال تک

شعبۂ اُردو میں بحیثیت لکچرار کام کیا اور اب آپ وہاں شعبہ فارسی میں لکچرار ہیں۔ آپ کو اُردو ادب اور شعر و شاعری سے بغایت دلچسپی ہے۔ آپ نے ایک مجموعۂ نظم "تذکارِ سلف" کے نام سے شائع کیا تھا اس کے علاوہ آپکے مضامین اُردو کے مشہور رسائل و جرائد میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں جن سے انشا و ادب میں آپ کی صحت مذاق اور ژرف نگاہی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ کلام مومن سے آپ کو ابتدا ہی سے خاص شغف رہا ہے چنانچہ ۱۹۲۵ء میں آپ نے قصائد مومن کی شرح شائع کی تھی۔ موجودہ دور میں مومن پر سب سے پہلا مضمون آپ ہی کے قلم سے نکلا اور رسالہ اُردو میں مومن کی تصویر کے ساتھ شائع ہوا۔ اس کے بعد ملک کے مختلف رسالوں میں مومن پر دیگر اہل قلم کے مضامین شائع ہوئے۔ اسلئے کلام مومن کی احیا یا نشاۃ ثانیہ کے لئے اردو زبان خاص طور پر آپ ہی کی مرہون و ممنون ہے۔

مومن کے کلام کے اصلی محاسن کو نمایاں کرنا دراصل خود شاعر کو قعر گمنامی سے نکالکر منظر عام پر لانا ہے۔ مولوی ضیاء احمد صاحب کی یہ شرح دیوان مومن اس اعتبار سے تنقید ادب میں ایک گرانقدر اضافہ بلکہ خود اُردو ادب پر ایک احسان عظیم ہے۔ آپ نے کلام مومن کی تصحیح و تشریح میں جس جانفشانی اور دقت نظر سے کام لیا ہے اس کا صحیح اندازہ صرف کتاب کے مطالعہ ہی سے ممکن ہے۔ مزید شرح و بسط میں اُلجھا کر میں ناظرین کا وہ وقت جسے اصل کتاب کے مطالعہ میں صرف ہونا چاہئے ضائع کرنا نہیں چاہتا۔

۴۸۶

سخنہائے گفتنی

سخنِ دوست گراں بود فراواں کردم
جاں بہ پیمانہ بیاریدکہ ارزاں کردم

سنہ ۱۹۲۸ء میں جب میں نے قصائد مومن[1] شائع کئے تھے تو وعدہ کیا تھا کہ اگر وقت نے مساعدت کی تو غزلیات کا حصہ بھی جلد پیش کیا جائے گا۔ مگر کسی نے سچ کہا ہے۔ اَلْاُمُوْرُ مَرْھُوْنَۃٌ بِاَوْقَاتِھَا آٹھ برس کے قریب ہونے آئے اور دیوان غزلیات کو پریس میں بھیجنے کی نوبت نہ آئی۔ اس غیر معمولی تعویق کا سبب میرے ذاتی افکار و مکروہات تھے جنھوں نے اب تک سر اُٹھانے کی مہلت نہ دی۔ ان امور کی تفصیل سے قارئین کرام کے لمحات عزیز کو ضائع کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ بارے آج خدا کے فضل سے یہ دن نصیب ہوا کہ غزلیات مومن کو تصحیح اور تشریح کے بعد پریس میں بھیجا جا رہا ہے اور حق تعالیٰ سے اُمید ہے کہ یہ حصہ بھی جلد شائع ہو کر حسن قبول حاصل کرے گا۔

یہاں پر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کلام مومن کے نسخے عام طور پر بازار میں ملتے ہیں۔ تو پھر مجھے اس جانفشانی اور جگر کاوی کی کیا ضرورت تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مجھے شعرائے اُردو میں مومن سے غیر معمولی شغف رہا ہے اور میں (میر کو چھوڑ کر) نفس تغزل میں کسی کو اُن کا ہم پایہ نہیں سمجھتا۔ اور یہ اُردو کی بدقسمتی اور حامیان اُردو کی بے اعتنائی کہ اتنے بڑے باکمال استاد کی

[1] ملاحظہ ہو مجموعہ قصائد مومن۔ مرتبہ راقم۔ مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ۔

کلیات - طباعت کے ظاہری محاسن تو درکنار - زیور صحت سے بھی آراستہ نہیں - کاتبوں کے نسخ و مسخ نے اُس کی صورت اس قدر بگاڑ دی ہے کہ جی کڑھتا ہے پھر طرہ یہ کہ فکر کی بلندی اور خیال کی نزاکت کے ساتھ اُن کے یہاں اشکال و اغلاق کی اس قدر فراوانی ہے کہ اشعار کا معتد بہ حصہ نہ صرف عوام بلکہ اکثر خواص کے نزدیک بھی مُعمّا بنکر رہ گیا ہے - اسی لئے میں عرصہ سے سوچ رہا تھا کہ اُردو کے اس قادر الکلام شاعر کے دیوان کا ایک صحیح ایڈیشن ضروری مطالب کے ساتھ اس طرح شائع کر دیا جائے کہ مذاق جدید کی رعایت بھی مد نظر رہے - للہ الحمد کہ یہ ارادہ آج قوۃ سے فعل میں آ رہا ہے، یورپ میں ہر ناظم و نثّار سے متعلق نقد و نظر - شرح و تحشیہ کا اس قدر مواد فراہم ہو جاتا ہے اور ہر مصنف کی تصانیف کے متعدد ایڈیشن اس صحت و صفائی کے ساتھ شائع کئے جاتے ہیں کہ اُس کے مقابلے میں ہم کو اپنے ملک اور اپنی زبان کا نام لیتے بھی شرم آتی ہے - نواب[ؔ٭] مسعود یار جنگ ڈاکٹر سر سید راس مسعود بالقابہ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ ایک فرنچ یا جرمن مستشرق جو میرا دوست تھا سیر و سیاحت کی غرض سے ہندوستان آیا - دہلی پہونچکر وہ میری معیت میں وہاں کے مشہور مقامات کو دیکھنے کی غرض سے نکلا - اثنائے راہ میں اُس نے دریافت کیا کہ آپ کی زبان کا سب سے بڑا شاعر کون ہے - جب اُس کو بتایا گیا کہ اُردو کا سب سے بڑا شاعر

٭ اُردو زبان کی خدمت کے سلسلہ میں شعبۂ تصنیف و تالیف قائم کرنے اور مشہور تصانیف کو صحت و صفائی کے ساتھ طبع کرانے کی ایک زبردست اسکیم ڈاکٹر صاحب ممدوح کے زیر غور ہے اور اُمید کیجاتی ہے کہ جلد عملی صورت اختیار کرے گی -

غالب ہے تو اُس نے دیوان غالب دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ بازار قریب ہی تھا۔ ایک کتب فروش کی دُکان پر جاکر دیوان غالب طلب کیا گیا۔ چنانچہ ایک معمولی نسخہ قلیل قیمت پر دستیاب ہوگیا۔ واپسی پر برسبیل تذکرہ میں (نواب مسعود جنگ) نے اُس سے پوچھا کہ ہندوستانیوں کی تہذیب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ اُس نے چھوٹتے ہی جواب دیا کہ میرے نزدیک ہندوستانیوں کی زندگی جانوروں کی زندگی سے کچھ ہی بہتر ہو تو ہو۔ وجہ دریافت کرنے پر اُس نے کہا کہ کسی مُلک کی تہذیب کا اندازہ وہاں کے ذوق ادب کو دیکھکر بہ آسانی کیا جاسکتا ہے۔ کیا یہ افسوس کا مقام نہیں کہ آپ کی زبان کا بہترین شاعر اس کس مپرسی کے عالم میں ہو کہ اُس کا کلام ادنیٰ کاغذ اور ذلیل طباعت کے ساتھ اس قدر ارزاں قیمت پر بازار میں ملتا ہو۔

اس واقعہ کو تقریباً بیس برس ہوئے مگر اُس کی واقعیت اُردو کے اکثر بڑے اساتذہ و مصنفین کے معاملہ میں آج بھی اُسی طرح آشکار ہے۔ مومن ہی کو دیکھئے جو حُسن تخیّل کے اعتبار سے یوسف مصر معانی کہے جانے کا مستحق ہے لیکن کیا آج اہل مُلک کی بے اعتنائی کے ہاتھوں شروہ بثمن بخس دراہم معدودۃ وکانوا فیہ من الزاہدین کا مصداق نہیں ہے؟ وللہ درّہٗ حیث قال۔ یوسفم را بہ کلاوۂ پیرزال نمی خرند واز چاہ کنعانی بسیم قلب ہم نمی برند۔

؎ اس عبرت آموز واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ ڈاکٹر صاحب باقابہ کی تحریک وسعی سے مرزا غالب کے دیوان کا ایک نہایت صحیح و دیدہ زیب ایڈیشن پہلی بار نظامی پریس۔ بدایوں سے شائع ہوا اور اُسکے بعد ملک کے طول وعرض میں غالب پرستی کی لہر دوڑ گئی۔ شکر کا مقام ہے کہ دہلی کے دوسرے اُستاد اور غالب کے معاصر (مومن) کے کلام کے نشر و احیار کا کام بھی جناب موصوف کے انتساب کے ساتھ بدایوں ہی سے ظہور میں آیا۔

یہ خیالات تھے جو زیر نظر ایڈیشن کے وجود میں آنے کے ذمہ دار ہوئے۔

اب ذرا اُس "جانفشانی اور جگر کاوی" کی حقیقت بھی سُن لیجئے جس کا اوپر کی سطور میں ذکر آیا ہے ۔ یہ امر واقع ہے کہ کلیات مومن کے جس قدر نسخے بھی دستیاب ہوتے ہیں تصحیف و تحریف کی بدولت اغلاط سے لبریز ہیں اور اگرچہ آپس میں مختلف ہیں مگر غلط ہونے میں سب متفق ہیں۔ اس لئے ضرورت تھی کہ کوئی صحیح نسخہ بہم پہنچایا جائے اور صحیح نسخہ نہ ہونے کی صورت میں (جیسا کہ فی الواقع ہوا) مختلف نسخ کے مقابلہ اور ذاتی اجتہاد کے بعد ایک صحیح نسخہ مرتب کیا جائے۔ اس غرض سے الہ آباد یونیورسٹی اور مسلم یونیورسٹی کی لائبریریوں اور اپنے بعض ذی علم احباب کے پرائیوٹ کتبخانوں سے مختلف سنوں اور طبعوں کے کلیات حاصل کئے گئے۔ مگر سب کے سب کم و بیش اغلاط سے مملو تھے۔ ریاست ٹونک اور ریاست رامپور کے کتبخانوں کے قلمی نسخوں سے بھی استفادہ کا موقع ملا یہ دونوں نسبتہً صحیح تر تھے لیکن مطلب ان سے بھی حاصل نہ ہوا۔ سب سے قدیم نسخے جو دستیاب ہوئے اون میں سے ایک (رامپور کا ناتمام قلمی نسخہ) سنہ ۱۸۵۹ء کا لکھا ہوا اور دوسرا (سید ناصر حبیب نبیرہ مومن کی عطا کردہ مطبوعہ کلیات) سنہ ۱۸۷۲ء کا چھپا ہوا تھا لیکن اس کا کیا علاج کہ کاتبوں کے دستبرد سے یہ بھی محفوظ نہ پائے گئے۔ مجبوراً بیس نسخوں سے مقابلہ کرنے اور اختلاف کی صورت میں ذاتی فیصلہ سے کام لینے کے بعد موجودہ ایڈیشن مرتب کیا گیا۔ یہ دعویٰ ہرگز نہیں کہ یہ تمام تر اغلاط سے پاک ہے۔ البتہ تعلّی نہ ہوگی اگر کہا جائے کہ

۱؎ طوالت کے خوف سے (جدید روش کے برخلاف) اختلاف نسخ کو فٹ نوٹ میں دکھانے کی کوشش نہیں کی گئی۔

متداول نسخوں میں اس سے صحیح تر نسخہ نہیں مل سکتا (بشرطیکہ کاتبوں کی
قطع و برید سے محفوظ رہے)

تصحیح کے بعد دوسرا مرحلہ اضافہ حواشی کا تھا۔ اغلاط کتابت سے قطع نظر
مومن کا اسلوب ادا خود اس قدر پیچیدہ ہے کہ تقریباً ہر غزل کے نصف
شعر محتاج شرح ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ مومن کے یہاں تغزل کی رنگینی اور
خیال کی نزاکت اس حد تک پہونچی ہوئی ہے کہ جو مومن کا نقطہ آغاز ہے وہ
دوسرے شعرا کا منتہائے رسائی ہے اور یقیناً غزل ہی وہ صنف ہے جہاں
اُن کا آفتاب کمال پوری درخشانی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ مگر اس میں بھی
شک نہیں کہ وہ اُردو تغزل میں ایک طرز خاص کے مالک ہیں جس کے
خود ہی موجد ہیں خود ہی خاتم ہیں اور اپنے مطالب کو پیچ سے ادا کرنا اور بات کو
پھیر سے کہنا اس طرز خاص کی خصوصیت ہے۔ یہی سبب ہے کہ عوام تو درکنار
کبھی کبھی خواص بھی اُن کے مفہوم تک پہونچنے سے قاصر رہتے ہیں۔ میرے خیال
میں تمام اُردو شعرا میں صرف غالب اور مومن ہی ایسے ہیں جن کا کلام شرح طلب
ہے۔ فرق یہ ہے کہ غالب کے یہاں فلسفہ و تصوف ہے اور مومن کے یہاں
عشق و تغزل۔ بلکہ یہ حیرت ہے کہ مومن نے تغزل جیسے محدود موضوع میں
اس قدر تنوع خیالات کیونکر پیدا کر دیا ہے۔ بہر حال مومن کے کلام کا اغلاق[۵]
ایک کھلی ہوئی بات ہے۔ جس کو مومن کا ہر مطالعہ کرنے والا جانتا ہے۔ اس
مشکل کو دور کرنے کے لئے ضرورت تھی کہ ان کے طرز و انداز سے طبیعت کو

۵ کلام مومن کے اغلاق کے اسباب مقدمہ میں ملاحظہ ہوں۔

بخوبی آشنا کیا جائے ۔ اس کا ذریعہ اُن کی سیرت کا غائر مطالعہ تھا یا اُن کے کلام پر کافی عبور ۔ سیرت کے لئے گلشن بیخار ۔ آب حیات ۔ گلِ رعنا شعر الہند اور دوسرے تذکروں کے علاوہ اپنے محب مکرم فنا فی المومن حضرت عرش گیاوی کی حیاتِ مومن اور مخدوم و معظم سید ناصر جلیب دہلوی نبیرۂ مومن اور محترمہ کنیز فاطمہ بنت سید صاحب موصوف کے ارسال کردہ حالات سے استفادہ کیا اور اس کے بعد کلیات کو متعدد بار بالاستیعاب پڑھا۔ اس تمام تجسس اور تفحص کا نتیجہ یہ حواشی ذیلی ہیں جو اشعار کے نیچے دیدیئے گئے ہیں۔ اکثر اشعار کی تحقیق میں بحث و تمحیص اور غور و فکر کی بیشمار قیمتی گھڑیاں صرف کی ہیں۔ تب کہیں یہ "تراوش خونناب" ظہور میں آئی ہے ۔

خونناب آتشیں ز سرِ من گذشتہ است

ویں سیل آتش از جگرِ من گذشتہ است

اس تفصیل سے خودستائی مقصود نہیں۔ محض گذارش احوال واقعی منظور ہے ۔ اسی کے ساتھ اس کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ بعض مقامات پر شاعر کے مفہوم کی تہ تک پہونچنے میں شاید خود میں بھی کامیاب نہ ہوسکا ہوں۔

اس جگہ نامناسب نہ ہوگا اگر اس شرح کی بعض خصوصیات بیان کردیجائیں ۔

(۱) صرف مشکل اشعار کے مطالب لکھنے کی ضرورت سمجھی گئی۔ اشعار کے محاسن یا قبایح اور ہم معنی شعر محض ضمناً بیان کردئے گئے ہیں۔

(۲) اگر کوئی شعر محتمل الوجوہ ہے تو بیشتر ایک اور کمتر دو معنی پر اکتفا کی گئی ہے اور کثرت معانی کی صورت میں اُس معنی کو ترجیح دی گئی ہے جو طرز مومن سے اقرب ہے ۔

(۳) اس مجموعہ کے مخاطب صحیح نہ مبتدی طلبا ہیں نہ منتہی علماء۔ اسی لئے حد سے زیادہ اطناب یا ایجاز سے پرہیز کیا گیا ہے۔

(۴) بعض مواقع پر حسب ضرورت ترتیب نثر یا خفیف تصرّف پر اقتصار کیا گیا ہے۔

(۵) صنائع کے بیان میں ہر جگہ تفصیل کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ اکثر جگہ "رعایت یا مناسبت شاعرانہ" (غیر اصطلاحی مفہوم میں) لکھ کر چھوڑ دیا گیا ہے۔

بہر حال یہ خاکہ ہے میری ناچیز خدمت کا جس کی بنیاد ڈالدی گئی ہے۔ تکمیل عمارت دوسرے اہل فن کے ذمے ہے۔

تا بہارِ دوستی کے بر دہد
حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

اس التماس کے ختم کرنے سے پیشتر میرا فرض ہے کہ حضرۃ الاخ المعظم مولوی رضی احمد صاحب رضیؔ مدظلہ الاقدس کی بزرگانہ شفقت اور علمی اعانت کا تہ دل سے اعتراف کروں۔ رسم پرستی اور تصنّع میرا شیوہ نہیں۔ ظاہر داری اور تکلّف کا مَیں قائل نہیں مگر باللہ العظیم نہ صرف میری جبین نیاز۔ بلکہ میرا دل عقیدت کیش ہر لحظہ آپ کے آستانِ کمال پر جُھکنا معراجِ شرف سمجھتا ہے۔ کیونکہ میرا ذوقِ ادب اور مذاقِ شعر تمامتر آپ ہی کے فیضِ تربیت کا رہینِ کرم ہے۔ حضرت ممدوح فضل و تبحر۔ مذاقِ شعر گوئی و پایۂ شعر فہمی۔ وسعتِ نظر اور علوّ فکر کے اعتبار سے ہندوستان کے اُن معدودے چند مایۂ ناز اساطین علم و شعر میں ہیں جن کو زمانہ مدتوں میں پیدا کرتا ہے۔ آپ کو "عرضِ متاعِ ہنر" سے اس قدر اجتناب ہے کہ مرزا غالب کا یہ شعر سرتا سر

آپ پر صادق آتا ہے۔

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

تاہم جن چند اصحاب کو آپ سے نیاز حاصل ہے وہ آپ کی بالغ نظری اور نکتہ رسی کے معترف و معتقد ہیں۔ غزلیات مومن کی شرح کے دوران میں ایسا اتفاق ہوا کہ بعض شعر باوجود سعی و فکر حل نہ ہو سکے۔ آخر مختلف ذی علم احباب سے مشورہ کیا گیا مگر پھر بھی عقدہ لاینحل رہا لیکن جب کبھی حضرت قبلہ سے رجوع کی گئی معاً آپ کے ناخن فکر نے اس آسانی سے گرہ کشائی کر دی کہ گویا سرے سے کوئی دشواری تھی ہی نہیں۔ یہ امر بالکل بدیہی ہے کہ اگر خدا کے فضل کے بعد آپ کی عنایت و اعانت شامل حال نہ ہوتی تو میں اس ناچیز خدمت کو منظر عام پر لانے کی جرأت ہرگز نہ کر سکتا۔

ممکن ہے کہ کوئی ناواقف فقیر کی اس دراز نفسی کو بیجا مبالغہ یا بے محل عصبیت پر محمول کرے لیکن اگر اظہار حق میں بے باکی کوئی محمود صفت ہے تو ہر منصف مزاج شخص فقیر کو اس اعتراف میں معذور اور فیضی کی طرح اس اعلان میں حق بجانب سمجھے گا۔

در فضل مفتخر ز گرامی برادرم

اس کے ساتھ حق ناشناسی اور ناسپاسی ہوگی اگر ان ذی علم اور لائق احترام بزرگوں اور عزیزوں کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جنھوں نے کمال نوازش و محبت سے اپنے مطبوعہ یا قلمی نسخے مستعار عنایت کیے یا اُن کے [illegible] کی نقل عطا کی یا مومن کے سوانح حیات ارسال فرمائے۔ ان حضرات

میں عالی جناب نواب محمد اسمٰعیل خاں بالقابہ (میرٹھ) حافظ احمد علی خاں (رامپور) - حضرت اختر مینائی - جناب احسن مارہروی - ڈاکٹر محمد حفیظ سید (الہ آباد یونیورسٹی) - جناب سید یعقوب الحسن فرخ آبادی - مولوی مختار احمد بدایونی - حضرت عرش گیاوی - جناب سید ناصر حبیب دہلوی نبیرۂ مومن اور محترمہ نبیرۂ ... دہلوی کے اسمائے سامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں - اس موقع پر جب میں خیال کرتا ہوں کہ میرے عزیز اور دوست قاضی حضور الرحمٰن بدایونی آج دنیا میں موجود نہیں تو میرا قلب جذبات غم والم سے لبریز ہو جاتا ہے - مرحوم (خدا اُن کی تربت کو عنبریں کرے) جوان صالح و سعید تھے اور خلوص و محبت میں بے نظیر - کلام مومن کو ایڈٹ کرنے کا خیال جب پہلے پہل اُن سے ظاہر کیا گیا تو انھوں نے نہایت سرگرمی سے اس تحریک کی تائید کی - اور بعد کو بھی برابر اپنی مستقل مزاجی سے میرا دل بڑھایا - کاش آج وہ جواں مرگ اپنی دیرینہ آرزو کو پورا ہوتے دیکھتے

دلم بر رنجِ نا برداریٔ فرہاد می سوزد

خداوندا بیامرز آں شہیدِ امتحانے را

آخر میں مَیں اپنی اس سبک مایہ خدمت کو پبلک کے سامنے پیش کرتے ہوئے حق تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ میری کوشش کو مقبول اور سعی کو مشکور فرمائے

غزلیات کے بعد قطعات، رباعیات و مثنویات وغیرہ کا نمبر ہے - مگر وہ حصہ صحیح بھی ہے اور آسان بھی - اس لئے غالباً اُس کے ایڈٹ کرنے کی ضرورت نہ پڑے -

مسلم یونیورسٹی - علی گڑھ - ۱۵ / جون ۱۹۳۳ء

ضیاء احمد

فہرست اغلاط النسخ متداولہ

جو دیوانِ غزلیاتِ مومن کے تقریباً تمام متداولہ نسخوں میں کم و بیش موجود ہیں اور جن کی زیرِ نظر ایڈیشن میں فکر و مقابلہ کی کاوشوں کے بعد تصحیح کردی گئی ہے

حوالہ	غلط	صحیح
صفحہ ۱ شعر ۳	اعتراض	اعتراف
″ ″ ″ ۴	جیب جنوں کی شاں	جیبِ جنوں کیشاں
″ ″ ″ ۷	لکھتا ہے	لکھنا ہے
″ ۲ ″ ۵	ہر جراحت سے	ہر جراحت ہو
″ ″ ″ ۵	عبادت	عیادت
″ ″ ″ ۸	اصحاب نفاق اہل بدعت	اصحاب نفاق و اہل بدعت
″ ″ ″ ۹	بنا ہے	بُلا ہے
صفحہ ۳ ″ ۳	خیرہ چشمہ	خیرہ چشمی
″ ۴ ″ ۱۰	افسانہ سنانا	اتنا نہ ستانا
″ ۴ ″ ۱۳	کہہ سناتے ہو	کیا ستاتے ہو
″ ۴ ″ ۱۳	احسان	آسان
″ ۵ ″ ۱	اُس کا	اُس کو
″ ۶ ″ ۲	کوئی دن یہ	کوئی دن میں
″ ۶ ″ ۶	وہ کرے گا	مَیں کروں گا
″ ۷ ″ ۳	اچھا	رسوا

حوالہ	غلط	صحیح
صفحہ ۷، شعر ۵	آپ کے	آپ نے
؍ ۸	—	وہ حال زار ہے میرا کہ گاہ غیر سے بھی تمہارے سامنے یہ ماجرا بیاں نہ ہوا (یہ شعر اکثر نسخوں میں موجود نہیں)
صفحہ ۹، شعر ۶	تو بھی وہاں	تو بھی نہ واں
؍ ۱۰ ؍ ۱	صبح کو	صبح کہ
؍ ۱۰ ؍ ۱۱	سیہ رو نہ	سیہ روز
؍ ۱۰ ؍ ۱۲	نعش پر	نعش پہ
؍ ۱۳ ؍ ۲	ایسا	ایسا ہے
؍ ۱۱ ؍ ۴	ہے طعنہ	طعنہ
؍ ۱۲ ؍ ؍	—	وقت جوشِ بجز گریہ میں جو گرم نالہ تھا حلقۂ گرداب رشکِ شعلۂ جوالہ تھا (یہ مطلع اکثر نسخوں میں نہیں)
صفحہ ۱۶، شعر ۶	دیتے ہیں	دیتے ہی
؍ ؍ ۹	پرکالالہ	پرکالہ
؍ ۱۷ ؍ ۸	دعوت فرہاد	دعوت فریاد
؍ ۱۸ ؍ ۱۲	داغہائے اشک	داغہائے رشک
؍ ۱۹ ؍ ۱۰	یہ کہنا	نہ کہنا
؍ ۲۲ ؍ ۱	تشنہ	نشہ

حوالہ	غلط	صحیح
صفحہ ۲۲، شعر ۱۱	دل کے قلق کے	دل کے قلق کا
" ۲۳ " ۲	ہو	ہوں
" " " ۱۱	پر وحشت	وحشت پر
" ۲۴ " ۴	دل آزار	دل زار
" " "	—	روزِ جزا خدا بتِ جلّاد کو ملا گویا کہ خونِ ناحق مومن صواب تھا (یہ مقطع اکثر نسخوں میں موجود نہیں)
صفحہ ۲۷، شعر ۸	نازک آرام	نازک اندام
" ۲۷ " ۱۳	خود آلود	خون آلود
" ۲۹ " ۲	خود چھپانے کو	خوں چھپانے کو
" " " ۴	بسمل	سائل
" ۳۰ " ۵	کسکا ڈر ہے	کسکا در ہے
" ۳۱ " ۱۰	پُر ہواب بھی	ہو - پر اَب بھی
" ۳۲ " ۲	تمنے	ہمنے
" ۳۳ " ۱	جزا کے بعد	جزا کے دن
" " " ۴	نگاہ خیر	نگاہ خیرہ
" ۳۴ " ۴	جستجو ئے	جستجو سے
" ۳۵ " ۶	بہل جانا	پھسل جانا
" ۳۴ " ۸	نہیں	یہیں

حوالہ	غلط	صحیح
صفحہ ۳۶۔ شعر ۳	ہوں	ہو
〃 〃 〃 ۶	بیمار محبت میں	بیمار محبت ہے
〃 ۳۹ 〃 ۷	پردہ نو پرتو	پردۂ تو بر تو
〃 ۴۱ 〃 ۱	تپ	تب
〃 〃 〃 ۷	ملجاتے ہی	ہلجاتے ہی
〃 ۴۲ ۳	جو رحم آیا	تو رحم آتا
〃 ۴۲ 〃 ۸	عدو کے	عدو کا
〃 ۴۳ 〃 ۶	در و دیوار	درِ دلدار
〃 〃 〃 ۸	بولوں گا	لوگوں کا
〃 ۴۴ 〃 ۹	پر	پھر
〃 ۴۵ 〃 ۷	استادوں کو	استادوں کا
〃 ۴۹ 〃 ۲	ہیں	تھے
〃 ۵۰ 〃 ۹	اُسکو	ہمکو
〃 ۵۳ 〃 ۷	تازگی	نازکی
〃 ۵۶ 〃 ۲	اُنکو	دل کو
〃 ۵۹ 〃 ۳	انتیار	اعتبار
〃 〃 〃 ۵	جاں پکڑتا	جا پکڑتا
〃 ۶۰ 〃 ۱	جنگ میں	جنگ بن
〃 ۶۰ 〃 ۶	طول عمل	طول امل

حوالہ	غلط	صحیح
صفحہ ۶۰ شعر ۱۰	رحم پر	رحم کر
〃 ۶۱ 〃 ۲	عرض مضطرب مومن	عرض مضطر اے مومن
〃 ۶۲ 〃 ۵	حال کہا	حال کیا
〃 ۶۳ 〃 ۱۱	ہے جنگ	تھم جنگ
〃 ۶۴ 〃 ۵	وہاں جمال صنم کو نفرت	وہاں ترقی جمال کو ہے
〃 ۶۴ 〃 ۶	خفت القلم	جف القلم
〃 ۶۴ 〃 ۷	خرام نازک قدم	خرام ناز اک قدم
صفحہ ۶۵ 〃 ۳ و ۴	۳ و ۴	۴ و ۳ (یہاں تقدم و تاخر ہوگیا ہے)
〃 ۶۷ 〃 ۱۳	رنگین ہیں	رنگین ہے
〃 ۶۸ 〃 ۱	نالوں سے	تالو سے
〃 ۶۸ 〃 ۹	آہ و فغاں کے بے اثر	آہ و فغان بے اثر
〃 ۶۹ 〃 ۸	زرد چہرہ	زرد چیرہ
〃 ۷۰ 〃 ۱	کہ یہ یرقان کا ہے طبیب	یرقان کا ہے اے طبیب
〃 ۷۰ 〃 ۸	سوتے نہیں اب وہ	سوئے نہیں آپ
〃 ۷۳ 〃 ۷	خاک پر	چرخ پر
〃 ۷۳ 〃 ۳	کام کرتا ہے	کام آیا ہے
〃 ۷۴ 〃 ۲	ہوئی	ہوا
〃 ۷۵ 〃 ۱	شعلہ مزاج	شعلہ عذار
〃 ۷۵ 〃 ۳	انتظار اثر نالہ شبگیر	انتظار اثر اے نالہ شبگیر

حوالہ	غلط	صحیح
صفحہ ۷۵ شعر ۵	اب	آ
″ ۷۶ ″ ۱	بادہ نو بہار	بادِ نو بہار
″ ۷۷ ″ ۳	کسی طرح	تری طرح
″ ″ ″ ۹	خفا	خفہ
″ ۷۸ ″ ۶	دوروز	ورود
″ ۸۰ ″ ۱	سنگ دل پر شکن	سنگ دل دلشکن
″ ۸۱ ″ ۴	اُڑ جائے گا	اُڑ جانے گا
″ ″ ″ ۵	رنگ گل	رگ گل
″ ۸۲ ″ ۳	ہو زمزمہ پرخوب	ہو زمزمہ پرداز
″ ″ ″ ۵	یہ یہ کر	تہ تہ کر
″ ۸۳ ″ ۸	حیرت	حسرت
″ ۸۴ ″ ۵	جو ہے	ہے ہے
″ ۸۴ ″ ۷	دکھاتی ہے	دلاتی ہے
″ ۸۶ ″ ۳	زعفراں ہی	زعفراں کی
″ ″ ″ ۵	ناتواں ہیں	ناتواں ہیں
″ ۸۶ ″ ۶	خوشش	خمش
″ ۸۷ ″ ۸	بکھر گئیں	پھر گئیں
″ ۸۹ ″ ۵	چشم پوشی	چشم بند
″ ۹۰ ″ ۷	جور کیا	جو رہے کیا

حوالہ	غلط	صحیح
صفحہ ۹۴ شعر ۳	وفا کے سبب	وفا کا سبب
״ ״ ״ ۹	تفا دل	تفِ دل
״ ״ ״ ۱۰	سیر دکھائیگا	سیر دکھا لگا
״ ۹۵ ״ ۱	پوجے گبر جسکو	پوج گبر جسکو
״ ״ ״ ۸	غش آگیا	ہوش آگیا
״ ۹۶ ״ ۵	ابتک	شب ہجر
״ ۹۸ ״ ۲	غنچہ کے درسے	غنچہ کے زرسے
״ ״ ״ ۴	ہوا	نہیں
״ ۱۰۰ ״ ۳	ہے شوخ	اے شوخ
״ ۱۰۱ ״ ۱	اب ذرا سُننے دے تو	اب ذرا جاں رہی
״ ۱۰۲ ״ ۶	زُبان شمع	زبان شمع
״ ۱۰۴ ״ ۹	غم خامہ	غم خانہ
״ ۱۰۶ ״ ۵	مت گر	مست مکر
״ ۱۰۸ ״ ۲	تجھے	مجھے
״ ۱۱۲ ״ ״	گرد ہاں کی	گرد وان کی
״ ۱۱۵ ״ ״	پیچ وتاب ہے دل	پیچ وتاب نپوچھ
״ ۱۱۶ ״ ۴	شوخ نیلی فام	شوخ لیلی فام
״ ۱۱۹ ״ ۶	خجل ہیں	خجالت
״ ۱۲۱ ״ ۸	شاید	شاہد

حوالہ	غلط	صحیح
صفحہ ۱۲۳ شعر ۱۷	سُرخی	شوخی
" ۱۲۴ " ۷	اشک چشم یار	رشک چشم یار
" ۱۲۵ " ۸	زنگ	رنگ
" ۱۲۸ " ۹	چھیڑ تو دیکھے	چھیڑ تو دیکھو
" ۱۳۳ " ۲	بیقراری میں جفا	بیقراری بن جفا
"		قیس شوخ اب کسو تکمہ دعوی ملک جنیت کا کرے مہر محضر ہو گیا نقش سم آہو ہمیں (یہ شعر بعض نسخوں میں نہیں)
" ۱۳۴ " ۴	وہی اے چارہ گر	الٰہی چارہ گر
" ۱۳۵ " ۵	جئیں	جلیں
" " " ۱۱	گو ہو رسوائی	اس توقع پر
" ۱۳۷ " ۱۰	واں یہ حالت ہے	واں بھی جیتی ہے
" ۱۳۹ " ۴	نگاہ	گناہ
" ۱۴۰ " ۵	میں تری بزم سوز میں ہیں یہ قیامتیں	بن ترے بزم سور میں میں یہ قیامتیں
" ۱۴۱ " ۳	اب	آپ
" ۱۴۲ " ۶	کیا گیا	کیا کیا
" ۱۴۳ " ۲	بوالہوس نہیں	بوالہوس سہی
" ۱۴۴ " ۴	—	درد بے درماں جراحت کش مرہم نہیں داغ تو ہے چارۂ داغ کہن کی فکر میں (یہ شعر بعض نسخوں میں نہیں)

حوالہ	غلط	صحیح
صفحہ ۱۴۴ شعر ۹	کام و دہان یار	کام و دہانِ یار
؍ ۱۴۵ ؍ ۲	بھیجتے ہیں	بھیچتے ہیں
؍ ۱۴۶ ؍ ۹	ہو جان بھی جو کچھ	ہو جان بھی جا کے کچھ
؍ ؍ ؍ ۱۱	ہر وقت	ہے وقت
؍	—	کیونکر پھرے دل اُس سے کہیں فرقِ فروغ نمائش ناصح دیا نہ تھا کہ میں دعوائے دل کروں (یہ شعر کئی نسخوں میں غائب ہے)
؍ ۱۵۲ ؍ ۴	آتشِ تن	آتش زنِ تن
؍ ۱۵۶ ؍ ۹	داغِ زخم	داغ و زخم
؍ ۱۵۸ ؍ ۳	دل کا کیا حال کوئی دیکھے کہ یہ گرمیِ حُسن	دل کا کیا حال کرے دیکھئے یہ گرمیِ حُسن
؍ ۱۶۰ ؍ ۵	اتنے سبک نظر ہیں یہ اوضاع روزگار	اتنے سبک نظر میں ہیں اوضاع روزگار
؍ ۱۶۱ ؍ ۴	فتحیاب	فتحِ باب
؍ ۱۶۲ ؍ ۱	ابھی	تو ہے
؍ ؍ ؍ ۵	شوقِ شراب	شوقِ ثواب
؍ ۱۶۳ ؍ ۱۰	اُس کو	اُس نے
؍ ۱۶۷ ؍ ۹	بجا ہے	جائے
؍ ۱۶۸ ؍ ۴	مہ کے اوپر	مہ کے مُنہ پر
؍ ۱۶۸ ؍ ۹	روزِ ہجراں	روزِ ہجراں سے
؍ ۱۷۰ ؍ ۳	بیداد	بیدرد

حوالہ	غلط	صحیح
صفحہ ۱۷۱ شعر ۹	ہے	ہیں
″ ۱۷۳ ″ ۶	بھیجیو تم	بھیجو جو تم
″ ۱۷۴ ″ ۸	ہم کو کہتے تھے	ہم کو تو کہتے تھے
″ ۱۷۵ ″ ۱	بستگان دام	رستگان دام
″ ″ ″ ۵	سوے دام	سوذے دام
″ ۱۷۶ ″ ۶	سر مشق تو	سر مشق نو
″ ۱۷۷ ″ ۴	نالہ اندیشہ کام	نالہ اندیشہ گام
″ ۱۷۹ ″ ۷	ہو خانماں خراب	ہوں خانماں خراب
″ ″ ۱۳	ہے	ہیں
″ ۱۸۰ ۳	ہم بھی	ہم ابھی
″ ۱۸۲ ″ ۷	یار نے	یار سے
″ ۱۸۸ ″ ۳	زار ہو	زار ہوں
″ ″ ″ ۶	کو	مت
″ ۱۸۹ ″ ۲	آئینہ خانہ میں گیا	آئینہ خانہ بن گیا
″ ″ ″ ۳	اے باد دست دامن مژگاں نچوڑ دیکھ	اے یاد دوست دامن مژگاں نچوڑ دیکھ
″ ۱۹۱ ″ ۳	کی	کہیں
″ ۱۹۶ ″ ۲	پھوڑ چل	پھوڑ جلد
″ ۱۹۷ ″ ۲	ثابت کیا	ثابت ہے کیا
″ ″ ″ ۳	عشق کے آزار سے	عشق کے اظہار سے

حوالہ	غلط	صحیح
صفحہ ۲۰۸ شعر ۱	کہ یہ جتنا زمیں کے نیچے ہے اُتنا زمیں پر ہے	کہ یہ اُتنا زمیں کے نیچے ہے جتنا زمیں پر ہے
۲۱۰ ۴	گردوں	گردن
۲۱۲ ۵	انجس	بے حس
۲۱۳ ۶	تماشا دکھائے	تماشے دکھائے
۲۱۳ ۱۱	آئیں	آمین
۲۱۵ ۷	آج	کہ آج
۲۱۵ ۹	اشک غماز بھی آنکھوں میں جو گھر کرتا ہے	اشک غماز بھی کیا آنکھوں میں گھر کرتا ہے
۲۱۷ ۳	پڑی حوریں	پڑیں حوریں
۲۱۷ ۷	بگڑتا	بگڑنا
۲۱۸ ۲	رم جانباز	رم جانانہ
۲۱۹ ۲	کہتے ہیں حال	کہتی ہے حال
۲۲۱ ۴	جو اور کو تو ہدایت	ہو اور کو تو ہدایت
۲۲۲ ۷	روز وصل ہیں اور	روز وصل ہیں ـ لو!
۲۲۲ ۹	کینہ زور	کینہ ورز (اس غزل کی ترتیب اشعار اکثر نسخوں میں غلط ہے)
۲۲۵ ۳	تار سبحۂ زنار کے لئے	تار سبحہ کے زنار کے لئے
۵	نکتہ	نقطہ
۷	بزم غیر	بزم عیش
۲۲۷ ۲	اُمید انفعال تو ہے	اُمید انفصال تو ہے
۲۳۱ ۶	نہ کہیں	یہ کہیں

حوالہ	غلط	صحیح
صفحہ ٢٣١ شعر ٨	دلِ وابستۂ احوال	دلِ وابستہ کا احوال
″ ٢٣٣ ″ ٦	حُسن گلہ سوز	حُسن گلو سوز
″ ٢٣٤ ″ ٥	آس تو نے شکستہ پائی کی	آس ٹوٹی شکستہ پائی کی
″ ٢٣٦ ″ ٣	ذکر و مہر قیامت	ذکر مہر قیامت
″ ٢٣٧ ″ ٢	یاد آگیا زبس کہ مہروسے مہروش	یاد آگیا زبس کوئی مہروسے مہروش
″ ″ ″ ٥	اشک ریزہ	اشک ریز
″ ″ ″ ٦	کیونکر نجات عاشقِ ہجراں کو ہو	کیونکر نجات آتشِ ہجراں سے ہو
″ ٢٣٩ ″ ٢	اسکی یہ یاد دلاتے ہیں مجھے	اُسکی خو یاد دلاتے ہیں مجھے
″ ٢٤٠ ″	اُس دہن کو غنچۂ دل کیا کہوں	اُس دہن کو غنچہ اے دل کیا کہوں
″ ٢٤١ ″ ٥	ہر جا	ہر مُو
″ ″ ″ ٥	رو کردہ پارہ کردہ	رم کردہ
″ ٢٤٣ ″ ١٠	صدا	سدا
″ ٢٤٥ ″ ٣	ویرانہ ہو	ویراں ہوا
″ ٢٤٦ ″ ٤	احتراق زہر	احتراق زہرہ
″ ″ ″ ٨	تقدیر	تعزیر
″ ٢٤٨ ″ ٢	پاس محوِ راز ہے اور شوق بیتابی جواب	پاس محو قطع آز اور شوق بیتاب جواب
″ ٢٤٩ ″ ١	غیر کے لکھنے کو تم نے کیا	غیر کے خط لکھنے کو تم نے
″ ٢٥٥ ″ ١٠	ستاتے ہو	سُناتے ہو
″ ٢٥٦ ″ ٢	قتلِ آسماں	مَیلِ آسماں

حوالہ	غلط	صحیح
صفحہ ۲۵۶ شعر ۷	ہوئے ہو	ہوے وہ
" ۲۵۷ " ۱	زباں کیلئے	زیاں کیلئے
" " " ۱۱	دام قفس	امن قفس
" " " ۴	جنون عشق ازل	جنون عشق ازلی
" " " ۵	ویرانہ	ویرانی
" ۲۶۰ " ۱۱	آغاز کا بد	آغازِ بد کا
فردیات۔ الف	یہ کیونکر چارۂ پند خردمنداں ہوش آیا	یہ کیونکر چارۂ پند خردمنداں کا ہوش آیا
ن	مضمون قتل ... عتاب میں	مضمون بسمل ... عتاب میں
"	بے طور ہم دیکھیں	یہ طور ہم دیکھیں
ہ	مری نظروں میں پھرتا ہے وہ شاد آباد کا نقشہ	مری نظروں میں ہے شادِ جہاں آباد کا نقشہ
ی	دیکھ اثر ہو جاے	کچھ اثر ہو جاے
معمیات معما ۲	نم سرشک	یم سرشک

نوٹ۔ جزوی اغلاط یا معمولی اختلافات نسخ جن سے معنی یا وزن میں فرق نہیں آتا یہاں درج نہیں کئے گئے۔

۷۸۶

مقدمہ

مایۂ مہر و محبت از رواج افتادہ بود
صحبتِ ماروز بازارِ وفا راگرم ساخت

یہ بات نفسیاتِ انسانی میں داخل ہے کہ جب ہم محفل میں کسی واعظ یا خطیب کا بیان سنتے ہیں تو ہماری خواہش یہ ہوتی ہے کہ اُس کے چہرے مہرے، خدوخال اعضا کی حرکات و سکنات کو بھی دیکھتے رہیں جس سے بیان میں دلچسپی پیدا ہو اور مطالب کے سمجھنے میں مدد ملے۔ یہی حال تصانیف کا ہے۔ تصنیف کو پڑھ کر قصداً صاحبِ تصنیف کے حالات دریافت کرنے کا جذبہ بروے کار آتا ہے۔ جب تک اس جذبۂ شوق کی تسکین نہیں ہوتی ہمارا مطالعہ ناقص رہتا ہے۔ مصنّف کون تھا۔ کس عہد اور کس مقام سے تعلق رکھتا تھا۔ کس ماحول میں پرورش پائی تھی اور کن مزعومات و معتقدات سے متاثر تھا۔ یہ اور اسی قبیل کے سوالات لامحالہ اس موقع پر پیدا ہوتے ہیں جن کا حل تصنیف کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اسی نقطۂ خیال کو مدنظر رکھ کر ضروری معلوم ہوا کہ کلام مومن کی خصوصیات بیان کرنے سے پیشتر خود مومن کے سوانح زندگی اجمالاً عرض کر دیے جائیں۔

حکیم مومن خاں

سرگذشتِ عہد گل را از نظیری بشنوید ✢ عندلیب آشفتہ تر گفت است ایں افسانہ را

خاندان۔ ولادت۔ نام۔ مومن کے والد حکیم غلام نبی خاں ولد حکیم نامدار خاں جن کی اصل نجبائے کشمیر سے تھی شہر دہلی کے شرفا میں سے تھے۔ حکیم نامدار خاں اور حکیم کامدار خاں دو بھائی سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں شاہی طبیبوں میں داخل ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ تیموری

حکومت کا چراغ ٹمٹا رہا تھا مگر پھر بھی بڑوں کی بڑی باتیں۔ چنانچہ شاہ عالم کی سرکار سے پرگنہ نارنول میں جاگیر عطا ہوئی لیکن آخر میں نواب فیض طلب خاں نے ان کی جاگیر ضبط کر کے ہزار روپیہ سالانہ پنشن حکیم نامدار خاں کے وارثوں کے نام مقرر کر دی۔ زمانہ کی بوالعجبی اور دہر کی نیرنگی میں عقل کام نہیں کرتی۔ عین اُسوقت جبکہ حکومت مغلیہ کے گلزار پر خزاں آرہی تھی۔ اُردو شاعری کا گلشن بہار پر تھا۔ اس پرآشوب دور میں بلبل گلستان شیوہ بیانی طوطی بوستان سخندانی فخر شعرائے دوراں امام الشعراء حکیم محمد مومن خاں نے اس "جہان خراب" میں قدم رکھا اور اپنے ترانوں سے دلی کے "اُجڑے دیار" کو نغمہ زار بنا دیا۔

ان کی ولادت کوچہ چیلان میں ۱۲۱۵ھ میں واقع ہوئی جب یہ پیدا ہوئے تو انکے والد جو رئیس المحدثین حضرت شاہ عبدالعزیزؒ دہلوی سے کمال عقیدت رکھتے تھے شاہ صاحب کو لے آئے۔ انھوں نے اُن کے کان میں اذان دی اور محمد مومن نام رکھا۔ اسی اعتبار سے بعد کو مومن تخلص ہوا۔ گھر والوں نے حبیب اللہ نام رکھا مگر شاہ صاحب کا تجویز کردہ نام ہی مقبول ہوا۔

تعلیم[1]۔ بچپن کی تعلیم کے بعد حضرت شاہ عبدالقادرؒ دہلوی سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھتے رہے۔ حافظہ اور ذہن خداداد تھا۔ اکثر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی مجلس وعظ میں حاضر ہوتے اور تمام مطالب و نکات از بر سنا دیتے۔ فہم و ذہانت[2] میں وہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور اپنے خسر خواجہ محمد نصیر نبیسہ میر درد کے سوا کسی ہم عصر کو اپنا مدمقابل نہ مانتے تھے۔ عربی میں کامل استعداد حاصل کرنے کے بعد اُنھوں نے اپنے والد اور چچا حکیم غلام حیدر خاں اور غلام حسن خاں سے طب پڑھی اور اُنھیں کے مطب میں نسخہ نویسی کرتے رہے۔ نجوم اہل فن سے سیکھا اور اس میں اسقدر دستگاہ بہم پہنچائی کہ اُن کے احکام سے لوگ حیران رہ جاتے

---

[1] ملاحظہ ہو آب حیات مولی بخش قلق کا واقعہ۔ [2] آب حیات۔

تھے۔ ایک شعر میں اپنی نجوم دانی کو عجیب اسلوب سے ظاہر کرتے ہیں۔

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

رمل[۵۲] میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے اور شہر کے متعدد شرفا اس فن میں اُن کے شاگرد تھے۔ علاوہ بریں ریاضی[۵۳] میں بھی اُن کو مہارت تامہ حاصل تھی اور خواجہ محمد نصیر کے سوا اس میں کوئی اُن کا ہم پلہ نہ تھا۔

علمی[۵۴] اور دیگر مشاغل۔ نجوم و رمل میں اُن کے توغل اور مہارت کے واقعات برابر تذکروں میں ملتے ہیں۔ شطرنج سے ان کو کمال مناسبت تھی اور نہایت انہماک سے کھیلتے تھے۔ آزاد نے لکھا ہے کہ وہ دلّی کے مشہور شاطر کرامت علی خاں سے قرابت قریبہ رکھتے تھے اور شہر کے ایک دو شاطروں کے سوا کسی سے کم نہ تھے۔ وہ اکثر مولانا فضل حق کو شطرنج میں مات دیتے تھے۔ مرزا غالب نے مولانا سے اس کا سبب پوچھا تو انھوں نے کہا کہ مومن بھیڑیا ہے جسے اپنی قوت کی خبر نہیں۔ اگر وہ عشق و عاشقی کے قصوں کو چھوڑ کر علمی مشغلے میں پڑتا تو اُس کے ذہن کی حقیقت معلوم ہوتی (ارواح ثلثہ) محترمہ کنیز فاطمہ صاحبہ اپنے والد سید ناصر حبیب صاحب ناصر دہلوی نبیسۂ مومن کے حوالہ سے بیان کرتی ہیں کہ مومنؔ مرحوم کی رنگین مزاجی نے موسیقی کے فن لطیف کی طرف توجہ کی تو وہ نام پیدا کیا کہ لوگ اُن کے کمال کے معترف ہو گئے۔ نظیر[۵۵] بین باز نے جو اُس زمانہ میں اُستاد تھا اُن کے انتقال پر بین اُٹھا کر رکھ دی کہ اب دلّی میں کوئی اس کا قدر داں نہیں رہا۔ بعض تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ فن عملیات میں بھی دخل تھا۔ اُن[۵۶] کے

---

۵۳ ملاحظہ ہو رسالہ اردو بابت اکتوبر ۱۹۴۲ء حکیم سکھانند شاگرد مومن کا قطعہ۔

۵۴ منقول از گرامی نامہ سید ناصر حبیب صاحب دہلوی بنام راقم الحروف۔

۵۵ غالباً صحیح نام میر ناصر احمد ہے جو مشہور بین باز اور خواجہ محمد نصیر کے مرید تھے۔ (میخانۂ درد) ۵۶ ملاحظہ ہو قصیدہ نعت۔

کلام سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

شاعری[۶] اور تلامذہ۔ اگرچہ انھوں نے دوسرے علوم و فنون کی طرح شاعری کو بھی پیشہ یا کسب معاش کا ذریعہ نہیں بنایا تاہم شاعری جس سے اُن کی عاشق مزاج طبیعت کو خاص لگاؤ تھا اُنکے تمام کمالات پر غالب آگئی۔ شروع میں شاہ نصیر کو کلام دکھایا مگر پھر اصلاح لینی چھوڑ دی۔ ان کے مشہور شاگرد نواب محمد مصطفٰے خاں شیفتہ نواب محمد اکبر خاں اکبر نواب اصغر علی خاں نسیم۔ میر حسین تسکین۔ میر عبدالرحمٰن آہی۔ [illegible] آشفتہ مرزا [illegible] بیگ سالک۔ شاہزادہ مرزا خدا بخش قیصر۔ غلام علی خاں وحشت۔ امۃ الفاطمہ بیگم المتخلصہ صاحب۔ اور نصیرالدین یاس تھے۔ غزل درد ناک آواز سے دلپذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اُردو کے باکمال اُستاد اور صاحب طرز ہونے کے علاوہ فارسی نظم و نثر پر بھی یکساں قدرت رکھتے تھے۔ اُن کی تصانیف میں کلیات اُردو۔ کلیات فارسی۔ انشائے فارسی۔ اس وقت تک موجود اور ارباب سخن کے لئے شمع راہ ہیں بعض رسائل[۵] طب وغیرہ پر بھی لکھے تھے مگر اب نایاب ہیں۔

معاش۔ جو پنشن حکیم نامدار خاں کے وارثوں کے نام ہوئی تھی اس میں سے مومن خاں نے بھی اپنا حصہ پایا تھا۔ اُس کے علاوہ کچھ پنشن سرکار انگریزی سے بھی ملتی تھی۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا اُن کی آزاد اور مستغنی طبیعت نے شاعری یا طبابت وغیرہ کو ذریعہ معاش کبھی نہیں بنایا جو دلّی میں میسّر تھا ہمیشہ اُسی پر قناعت کی اگرچہ بعض ضرورتوں سے چار پانچ مرتبہ دلّی سے باہر نکلے اور جہانگیر آباد۔ بدایوں۔ سہسوان[۵]۔ رامپور اور سہارنپور گئے۔ اس استغنا کے باوجود امیرانہ انداز سے بسر کرتے تھے۔

تاہل[۶] اور اولاد۔ مومن کی شادی دہلی کے نامور خاندان ارشاد و ہدایت یعنی خواجہ

---

[۶] از حیات مومن مرتبہ عرشی گیاوی۔ [۵] حکیم مومن خاں بغرض ملاقات نواب محمد سعید خاں بہادر ڈپٹی کلکٹر سہسوان بعدہٗ والی رامپور وارد سہسوان (ضلع بدایوں) ہوئے تھے اور وہیں مولانا سید تاج الدین نقوی کی خدمت میں بھی حاضر ہوکر معتقدانہ مستفید ہوئے (حیوٰۃ العلماء)

میر درد کے گھرانے میں ہوئی تھی۔ اُن کے خسر خواجہ محمد نصیر خواجہ میر درد کے نواسے اور اُن کی خوشنام میر درد کی پوتی تھیں۔ خواجہ محمد نصیر رنج ولد میر کلّو اکبر آبادی۔ زینت النساء بیگم بنت خواجہ میر درد کے بطن سے ہیں۔ موسیقی و ریاضی وغیرہ میں کامل تھے اور مومن اُنکے کمال کے معترف۔ خواجہ محمد نصیر کی دوسری بیوی سے دو صاحبزادیاں ہوئیں۔ انجمن النساء بیگم (انجم النساء بیگم ۶) اور اشرف النساء بیگم۔ اول الذکر بڑی لڑکی مومن کے عقد نکاح میں آئیں (ماخوذ از میخانۂ درد) اُن کی اولاد میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی یادگار رہے۔ بیٹے کا نام احمد نصیر خاں تھا۔ اُن کے فرزند محمد نصیر اور صاحبزادی عزیز بیگم موجود ہیں۔ مومن مرحوم کی بیٹی محمدی بیگم کا عقد مولوی عبدالغنی وکیل سیتاپور سے ہوا۔ یہ وہی صاحبزادی ہیں جن کی تاریخ ولادت مومن نے اس طرح کہی تھی۔

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے
کہی تاریخ دختر مومن

۱۳۴۰ - ۸۱ = ۱۲۵۹ھ

اُن کا انتقال ۱۲۹۲ھ میں ہوا۔ اُن کی اولاد میں سید ناصر حبیب صاحب ہیں جنھوں نے اور جن کی دختر نیک اختر کنیز فاطمہ بیگم صاحبہ نے حالات مومن کے فراہم کرنے میں راقم الحروف کی گرانقدر امداد فرمائی۔

وضع و انداز۔ مومن کا طرز بود و باش، شکل و صورت، وضع و لباس معلوم کرنا ہو تو اُن کی وہ تصویر دیکھئے جو مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے قلم جادو رقم سے الفاظ میں کھینچی ہے۔ پڑھئے اور لطف اٹھائیے "... آغا جان کے چھتے کے سامنے خاں صاحب کا مکان تھا۔ بڑا دروازہ ہے۔ اندر بہت بڑا صحن ہے۔ صحن کے چاروں طرف عمارت ہے۔ دیوانخانہ [illegible] سیڑھیاں ہیں اور سامنے [illegible] دالان در دالان پہلے دالان کے اوپر کمرہ ہے۔ سامنے کے دالان کی چھت کو کمرے کا صحن کر دیا ہے

لیکن منڈیر بہت چھوٹی رکھی ہے دالانوں میں چاندنی کا فرش ہے۔ اندر کے
دالان میں بیچوں بیچ قالین بچھا ہوا۔ قالین پر گاؤ تکیے سے لگے حکیم صاحب بیٹھے
ہیں۔ سامنے حکیم سکھانند المتخلص بہ رقم اور مرزا رحیم الدین حیا مودب دوزانو
بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دربار ہو رہا ہے کہ کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے اور
اور بلا ضرورت بولنے کا یارا نہیں۔ حکیم مومن خاں کی عمر تقریباً چالیس سال
کی تھی۔ کشیدہ قامت۔ سرخ و سفید رنگ تھا جس میں سبزی جھلکتی تھی۔ بڑی بڑی
روشن آنکھیں۔ لمبی لمبی پلکیں۔ کھنچی ہوئی بھنویں۔ لمبی ستواں ناک۔ پتلے پتلے ہونٹ
ان پہ پان کا لاکھا جما ہوا۔ مسی آلودہ دانت۔ ہلکی ہلکی مونچھیں۔ خشخاشی داڑھی
بھرے بھرے ڈنڈ۔ پتلی کمر۔ چوڑا سینہ۔ اور لمبی انگلیاں۔ سر پہ گھونگھر والے لمبے
لمبے بال کاکلوں کی شکل میں کچھ تو پشت پر اور کچھ کندھوں پر پڑے ہوئے۔
کان کے قریب تھوڑے سے بالوں کو موڑ کر زلفیں بنا لیا تھا۔ بدن پر شربتی
ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا تھا۔ لیکن اس کے نیچے کرتہ نہ تھا۔ اور جسم کا کچھ حصہ
انگرکھے کے پردے میں سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ۔ اس میں
چھوٹا سا سنہری تعویذ۔ کاکریزی رنگ کے دوپٹے کو بل دے کر کمر میں لپیٹ لیا
تھا اور اس کے دونوں کونے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا خار پشت
پاؤں میں سرخ گلبدن کا پاجامہ۔ مہریوں پر سے تنگ۔ اوپر جا کر کسی قدر ڈھیلا؛
کبھی کبھی ایک برکا پاجامہ بھی پہنتے تھے۔ مگر کسی قسم کا بھی ہو ہمیشہ ریشمی اور بیش
قیمتی ہوتا تھا۔ چوڑا سرخ نیفہ۔ انگرکھے کی آستینیں آگے سے کٹی ہوئی۔ کبھی لٹکتی
رہتی تھیں کبھی پلٹ کر چڑھا لیتے تھے۔ سر پر گلشن کی بڑی دو پلڑی ٹوپی۔ اسکے
کناروں پر باریک لیس۔ ٹوپی اتنی بڑی تھی کہ سر پہ اچھی طرح منڈھ کر آگئی تھی۔
اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے۔ غرض یہ کہ نہایت

خوش پوشاک اور جامہ زیب آدمی تھے۔

عاداتؔ و اخلاق۔ مومن رنگین طبع اور رنگین مزاج تھے۔ شباب کی جنون انگیزیاں اور ولولہ خیزیاں کون نہیں جانتا۔ ایک مرتبہ سیرسے ایک ذی علم دوست نے اکبر مرحوم سے اُن کی لائف مرتب کرنے کے لیئے کچھ حالات مانگے جس پر اُنھوں نے بیساختہ یہ جواب دیا۔

میری لائف لکھو ایام جوانی کے سوا
سب بتاؤنگا تمھیں اقتدوائی کے سوا

مومن جیسی طبیعت والے انسان کو بھی اُفتدہ وائی والے واقعات سے کام پڑنا ناگزیر تھا مگر جوانی ہی میں سید احمد صاحب رائے بریلوی سے بیعت کرلی اور اُس کے بعد صلاح و تقویٰ میں زندگی گزاردی۔ تاہم بقول ناصر صاحب بہت خوش اخلاق اور نہایت ظریف تھے۔ زاہد خشک نہ تھے۔

خودداری اور استغناء کا یہ حال تھا کہ کسی سے طلب کرنا یا احسان لینا گوارا نہ تھا۔ مدح کو ہمیشہ گداگری اور ہجو کو دنی الطبعی سمجھا کیئے۔ فارسی اور اُردو میں متعدد قصیدے لکھے مگر حمد و نعت و منقبت کے سوا اہل دنیا کی تعریف سے اپنی زبان کو ملوث نہیں کیا۔ مدح تو درکنار وہ کسی کو ہجو کا اہل بھی نہ سمجھتے تھے۔ اسی بے نیازی اور آزادہ روی کی بدولت اُنھوں نے رامپور۔ ٹونک۔ بھوپال۔ جہانگیر آباد۔ کپورتھلہؔ کی ریاستوں کی دعوت قبول نہ کی اور ملازمت کے علائق میں پھنسنا گوارا نہ کیا۔ سر ٹامسن نے چاہا کہ اُنکو سررشتہ تعلیم میں سَو روپئے مقرر کرکے اپنے ساتھ لیجائیں مگر اُن کے دل نے

ؔ آب حیات میں مہاراجہ کپورتھلہ کی دعوت اور مومن کے استغنا کے سلسلے میں جس گویّے کا حوالہ ہے اُس سے مراد میرزا احمد ہیں جن کو مہاراجہ ڈھائی سو روپئے کے مشاہرے پر دہلی سے اپنے یہاں لیگئے تھے۔ (جمانہ دورہ)

فرمایا کہ دلی کو اتنا سستا نہیچ ڈالیں"۔ طبیعت میں نازک خیالی کے ساتھ
نازک مزاجی غالب تھی۔ اور اسی وجہ سے امراء و سلاطین کی تعریف کرنا یا مدح لکھنا پسند نہ تھا
مذہب جس ماحول میں انھوں نے پرورش پائی اُس کا اقتضا یہ تھا کہ ان کو
مذہب سے خاص شغف ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ شاہ صاحب کے علمی اور
مذہبی خاندان سے اُن کے تعلقات رہے۔ خود مولوی محمد اسمٰعیل اُن کے
ہم صحبت و ہم جلسہ تھے۔ اس لیے اگر مومن اُن کے ہم خیال تھے تو تعجب
کی بات نہیں۔ تاہم اُن کی طرح متشدد اور متقشف نہ تھے۔ متعدد تذکرے متفق
ہیں اور خود اُن کے اشعار موید ہیں کہ وہ ہمیشہ عمل بالحدیث کے قائل اور کتاب
و سنت پر عامل رہے۔ اب اختیار ہے کہ اُن کو جو چاہو کہو۔ مقلدین اور شیعہ
پر اکثر اشعار میں چوٹ بھی کر گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

یہ کچھ رہِ سنت نہ طریقِ توحید پھر کیا ہے ضرور سب کی یکساں تہدید
ہم سمجھے ہیں معنی حقیقی یعنی حیواں ہیں حقیقت میں یہ اہلِ تقلید

اور سنئے۔ منہ کو مومن سے چھپانا کافر یہ تقیہ تو نہ بھایا مجھ کو

صوفیوں کی تردید میں ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

مومن ہے اگرچہ سب اُسی کا یہ ظہور توحیدِ وجودی کا نہ کرنا مذکور
یعنی کہ بنائے ہیں خدا نے بندے بندے کو خدا بنائے کس کا مقدور

سید احمد صاحب رائے بریلوی ایک بزرگ تھے جو انتہائی محض مگر پابندِ شریعت تھے
مولوی محمد اسمٰعیل نے اُن کی امامت تسلیم کی اور اُن کی سرکردگی میں کفار سے جہاد کیا
مومن نے بھی سید صاحب سے بیعت جہاد کی تھی اور مثنوی جہادیہ لکھی تھی۔ اگرچہ عملی
شرکت کا کوئی موقع نہ ملا تاہم مومن خاں آخر وقت تک انھیں کے معتقد رہے۔

لله صاحب سوانح احمدی کا بیان ہے کہ مومن نے مولوی ولایت علی عظیم آبادی خلیفہ سید صاحب سے بیعت کی تھی۔

مولانا فضل حق خیرآبادی سے مراسم تھے۔ تاہم اختلاف عقائد کی بنا پر بحث ہو جاتی تھی۔ ایک بار دونوں میں مناظرہ ہوا۔ مومن غالب رہے۔ چونکہ مزاج مکدر ہو گیا تھا اس لئے یہ شعر کہہ کر چل دئے۔

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں :: مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

(مولانا فرقتی اور آرزد تخلص کرتے تھے) پھر مولانا خود منانے کو گئے اور بالآخر صلح ہو گئی جس پر مومن نے یہ شعر پڑھا۔

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم :: پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

(ارواح ثلثہ)

اسی کے ساتھ یہ ملحوظ رہے کہ بزرگان دین کی عقیدت و محبت کو وہ ہمیشہ جزو ایمان سمجھتے تھے اگر اُن کے والہانہ جوش مذہب کا نمونہ دیکھنا ہو تو اُن کے قصائد نعت و منقبت ملاحظہ ہوں۔

وفات و مدفن - حکیم صاحب نے ۱۲۶۸ھ میں کوٹھے سے گر کر ۵ مہینے کے بعد انتقال کیا جیساکہ خود حکم لگا یا تھا۔ ۵۲ سال کی عمر پائی۔ گرنے کی تاریخ خود کہی تھی۔ "شکست دست و بازو"۔ انتقال کی تاریخ اُن کے شاگرد آہی نے کہی "ماتم مومن خاں"۔ مزار زیر احاطہ دیوار مقبرہ شاہ عبدالعزیز باہر کی سمت بجانب شرق واقع ہے۔ مرزا غالب نے اُن کے انتقال پر یہ رباعی کہی۔

شرط است کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر :: خونابہ بہ رخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر

کافر باشم اگر بمرگ مومن :: چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

ف ۔ حال میں پروفیسر سید احمد علی دہلوی کے اہتمام سے مومن کی قبر پختہ بن گئی اور کتبہ نصب ہو لیا ہے۔

کلام مومن

تصنیفِ عشق معنی و ترکیب دیگر است
ما شرحِ نکتۂ ز صد افسانہ می کنیم

مومن کی جامعیت علوم و فنون اور قدرت نظم و نثر اردو و فارسی کا تقاضا تو یہ تھا کہ ملک کے اہل قلم اس باکمال استاد فن کے کمالات کو تمام دنیائے عرض ہند میں اجاگر کرتے مگر بعض وجوہ[1] سے ایسا نہ ہوسکا اور مومن کی روح آج بھی زبان حال سے اس طرح شکوہ سنج نظر آتی ہے کہ "یوسف در گم گشتہ گورا بہ کلاوہ پیرزال نمی خرند وازچاہ کنعانی بسیم قلب ہم نمی برند۔ بااعجاز ید بیضا تہی دستم و بادم عیسوی آزار پرست[2]" بارے بعض دردمند خادمان اردو کی بمساعی قدرے بارآور ہوئیں اور ملک کے جمود میں کمی آئی۔ اگرچہ ابھی اوس سے پیاس نہیں بجھتی تاہم غنیمت ہے کہ اب ارباب قلم اس طرف اعتنا کرنے لگے ہیں۔

فقیر کو خدمت اردو کا دعویٰ نہیں۔ پھر بھی اپنی بساط کے موافق لکھنا[3] لکھاتا اور اساطین ادب کو توجہ دلاتا رہا ہے۔ آج کی صحبت میں قصد ہے کہ مومن کے تمام اصناف شعر پر اجمالاً اور غزل پر تفصیلاً روشنی ڈالی جائے۔

مومن کی کلیات اردو جو اس وقت مابہ البحث ہے۔ تمام اصناف سخن پر

---

[1] ملاحظہ ہو "مومن کی عدم مقبولیت کے اسباب"۔ [2] انشائے فارسی مومن۔ [3] ملاحظہ ہو دل، ترجمانِ مومن مرتبہ راقم و رسائل اردو، الناظر و ہمایوں وغیرہ۔ اس مقدمہ میں اپنے سابق مقالات مطبوعہ رسائل مذکورہ سے بھی مدد لی ہے

مشتمل ہے۔ موضوع کے اعتبار سے دیکھو تو مدح۔ تغزل واسوخت۔ مرثیہ۔ داستان۔ اور ساخت کے لحاظ سے غور کرو تو قصیدہ۔ غزل۔ فرد۔ قطعہ۔ رباعی۔ مستزاد۔ مسمط۔ ترجیع بند۔ ترکیب بند۔ مثنوی۔ غرض کون رنگ ہے جو اس چمن میں نہیں۔ اُن کے معاصرین تو درکنار تمام اساتذہ اُردو میں صرف گنتی کے افراد نکلیں گے جن کے یہاں قدرت کلام کے ساتھ اس قدر ہمہ گیری ہو۔ البتہ اس کا افسوس ہے کہ ذوق و غالب کی طرح اُن کے کلام پر کاٹ چھانٹ کا عمل نہ کیا گیا ورنہ یہ چند خار بھی جو اس گلزار پر بہار میں کہیں کہیں دامن سے اُلجھتے ہیں ہرگز نظر نہ آتے۔ موجودہ مجموعہ اشعار جو اس وقت دستیاب ہوتا ہے وہ ہے جو نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے مرتبہ نسخہ سے مومن کے شاگرد اور عزیز عبدالرحمن آہی خلف میر حسین تسکین نے صاف کرکے اور بعد کا کلام شامل کرکے مومن کے مرض الموت میں اُن کو سنایا تھا ظاہر ہے کہ اس بے اطمینانی کے عالم میں ترتیب و تہذیب اشعار پر کما حقہ توجہ کیونکر ممکن تھی۔ پھر بھی یہ اُنکی قدرت کلام اور زور کمال کا نتیجہ ہے کہ آج دوسرے ہمعصر اساتذہ کے برخلاف وہ صاحب طرز اُستاد تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اسکی مفصل بحث تو غزل کے عنوان کے ماتحت آئے گی۔ سردست اُن کی ہر صنف شعر کی بابت جس ترتیب سے کہ کلیات میں پائی جاتی ہے چند خیالات ظاہر کئے جاتے ہیں۔

الف۔ خصوصیات اصناف کلام

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

(۱) قصائد

اُردو کی مطبوعہ کلیات میں ۹ قصیدے ہیں اگرچہ بعض مطبوعہ دیوانوں

اور ریاست رامپور کے قلمی نسخے میں سرے سے کوئی قصیدہ نہیں۔ اس اختلاف کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ آخرالذکر اُن کی صحت کے زمانہ میں مرتب کیئے گئے ہیں۔ جبکہ ہنوز آں قلزم فیض در روانی وآں ابر رحمت در گہر فشانی بود" یااُن کی نقل در نقل ہیں۔ اس کے برخلاف اول الذکر کی ترتیب و تدوین اُن کے مرض و فات میں ہوئی۔" قصائد کی بابتہ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ان میں سے کوئی ارباب دُنیا کی مدح میں بہ اُمید صلہ نہیں لکھا گیا۔ آج کل جبکہ ہر خورد وکلاں کم وبیش نشۂ حریت سے سرشار ہے اور قصیدہ نگاری کا افادی پہلو بھی تقریباً مفقود ہے اگر کوئی شخص اپنی خودداری کی آن قائم رکھے تو تعجب نہیں۔ مگر غدر سے پہلے کہ قلعہ دہلی میں تیموری و بابری خاندان کی آخری شمع ٹمٹما رہی تھی صورت حالات مختلف تھی اُن حالات میں مومن کا استغنا دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ذوق غریب سے جن کی تمام عمر لابہ گری اور باد خوانی میں بسر ہوئی کوئی کیا توقع کرے کہ غلامانہ ذہنیت ہمیشہ ایسے ہی نتائج پیدا کرتی ہے۔ افسوس تو غالب پر ہے جو نسبتہً خوددار و غیور تھے۔ مگر عمر بھر نہ صرف اُمرائے اسلام بلکہ انگریز حکام کی چاپلوسی کو طغرائے امتیاز سمجھتے رہے۔ اگر ایک "الہامی کتاب" کا سرمایہ کمال یہی مضامین ہیں تو وا اسفا بر جان شاعری۔ اس سے بڑھکر تاسف اُن اہل قلم پر ہے جو اس قسم کی متاع کاسد کے ہوتے ہوئے مرزا صاحب کے کلام کو سرمایہ حریت وطن اور صحیفہ آزادی ملک قرار دیتے ہیں۔

اس کے برخلاف مومن کے یہاں ایسے خیالات کی کمی نہیں جو اُن کے

سے دیباچہ ڈاکٹر محمود بر دیوان غالب دیکھیئے۔

درد قوم و ملت کے یقیناً آئینہ دار ہیں۔ جو شخص اردو میں مثنوی جہادیہ اس طرح لکھ سکتا ہو کہ

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب   یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں   مری جاں فدا ہو تری راہ میں
میں گنج شہیداں میں مسرور ہوں   اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں"

اور فارسی کے قصیدہ نعت میں یوں استغاثہ کر سکتا ہو کہ

ایں عیسویاں بلب رسانند   جان من و جان آفرینش
نکشود گرہ زکار و فرسود   ناخن کہ بسنان آفرینش
تا چند بہ خواب ناز باشی   فارغ ز فغان آفرینش
برخیز کہ شور کفر برخاست   اے فتنہ نشان آفرینش

اُس کے یہاں جذبات حریت کی فراوانی نہ ہو گی تو کس کے یہاں ہو گی۔ تاہم اُن کے قصائد اُردو میں یہ خیالات مستقلاً نہیں ملتے۔ البتہ ایک چیز جو قصائد کا امتیازی وصف ہے ہر جگہ نمایاں ہے یعنی حُسن عقیدت و جوش مذہب جس سے ایمان تازہ اور دل شگفتہ ہوتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوش اعتقاد کا دریا ہے کہ اُمڈا چلا آرہا ہے۔ اُنھوں نے جس مذہبی ماحول میں تربیت پائی تھی اُس کا نتیجہ حتماً یہی ہونا چاہیے تھا۔ اوپر عرض کیا گیا کہ اُن میں زاہدان خشک کی سی سختی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام و اہلبیت عظام رضی اللہ عنہم کی نعت و منقبت میں فرط عقیدت اور جوش محبت کا اوقیانوس لہریں مارتا نظر آتا ہے۔ البتہ اسی کے ساتھ بعض جگہ وہ دوسروں پر مذہبی نوک جھوک بھی کر جاتے ہیں جو اُن کی شایان شان نہیں معلوم ہوتی

نعت و منقبت کے علاوہ صرف دو قصیدے ہیں جو ارباب دنیا کی مدح کہے جا سکتے ہیں لیکن اُن کی حقیقت یہ ہے کہ اُن میں سے ایک نواب وزیرالدولہ رئیس ٹونک کی شان میں (جن سے مومن کو روحانی نسبت بھی تھی) تحریر کیا ہے اور حاضری دربار سے معذرت کی ہے۔ دوسرا راجہ اجیت سنگھ برادر راجہ کرم سنگھ رئیس پٹیالہ (مقیم دہلی کے شکریہ میں لکھا ہے جنھوں نے ان کو خود بلا کر انعام و اکرام سے سرفراز کیا تھا۔

قصائد کی ترتیب حسب ذیل ہے۔ (۱) حمد۔ (۲) نعت۔ (۳) منقبت حضرت ابوبکر صدیقؓ (۴) منقبت حضرت عمر فاروقؓ (۵) منقبت حضرت عثمان ذی النورینؓ (۶) منقبت حضرت علی مرتضیٰؓ (۷) منقبت حضرت حسن مجتبیٰؓ (۸) مدح وزیرالدولہ امیرالملک نواب محمد وزیر خاں نصرت جنگ والی ریاست ٹونک۔ (۹) مدح راجہ اجیت سنگھ برادر راجہ کرم سنگھ رئیس پٹیالہ۔

مومن سے پہلے جس قدر شعرا گذرے ہیں قصیدہ میں (بہ استثنائے سودا) اُن کا کوئی ہمسر نہیں۔ اگرچہ پختگی اور صفائی میں قصائد ذوق کا پایہ کہیں برتر ہے تاہم زور اور ندرت میں مومن کا جواب نہیں۔ اُن کی تشبیب عموماً نادر اور پرلطف ہوتی ہے۔ تشبیب میں شعرائے سلف بالعموم بہاریہ مضامین یا مناظرے وغیرہ سے ابتدا کرتے تھے۔ مومن نے تشبیب کو اُس کے حقیقی معنی میں منحصر کر دیا۔ گویا اُن کی تشبیب میں سرتاپا تغزل کی شان نظر آتی ہے۔
مثلاً قصیدہ (۲) میں لکھتے ہیں۔ دل ابکی بار ہوا ایسی بے جگہ مائل + کہ جان کو بھی ٹھکانے لگا کے چھوڑا دل

فغاں کہ دلبر خود کام سے پڑا مجھے کام + حصول کار ہے بیکار سعی بے حاصل

یا قصیدہ (۵) میں - نیکنامی نہ سہی مجھکو ہے تم سے سروکار + چھوڑ دوں آج وفا گر ہو وفا سے بیزار

یا قصیدہ (۷) میں۔ چاہنا خلق کو صہبا و صنم سے محروم + ایسی نسبت پہ بہشت آپ کو وا غذ معلوم

اسی کے ساتھ ہر قصیدہ میں تعلّی اور شکایت زمانہ کہ سنت الشعرا رہے اس شکوہ و زور کے ساتھ پائی جاتی ہے کہ عرفی کا دھوکا ہوتا ہے۔ ایک آدھ قصیدے کے سوا کوئی اس رنگ سے خالی نہیں۔ چند شعر مثال میں لکھے جاتے ہیں۔

ملے ہیں خاک میں کیا کیا مرے علوم و فنون ۔ خدا کسی کو نہ دے ایسے طالع منکوس

شہا کسی نے نہ دی یاں مرے ہنر کی داد کہ نکتہ فہم نہ تھا ایک سرورِ باذل

وحید عصر ہوں میں عقل اولیں ہے گواہ فرید دہر ہوں میں صفحۂ زمان ہے سجل

یہی صلہ یہی ممدوح مجھکو زیبا تھا یہی سخن یہی مداح تھا ترے قابل

نہ ہنر کی مرے پرسش نہ سخن کی مرے قدر نہ گہر کی مرے ارزش نہ طلا کی معیار

کٹتی ہے میری تیغ زباں سے زبانِ تیغ کیونکر سخن فروش ہوں سوداگرانِ تیغ

مہر افلاک عقل و دانش ہوں فطرتی ہے مری درخشانی

نسر طائر کو سمجھے ہے بے پر مرغ فکرت کی بال جنبانی

میرے گوہر تمام ناسفتہ میرے یاقوت سب بدخشانی

البتہ تخلص یا گریز کہیں کہیں کمزور ہے۔ جس سے تکلف و تصنع ٹپکتا ہے اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ بات میں بات نکل آئی ہے۔ مثلاً

قصیدہ (۵) اے صنم چاہئے مومن کی فراست سے حذر + کیا نہیں تو نے سنا قصۂ شاہ ابرار

قصیدہ (۷) سبزہ رنگی نے تری قتل کیا ہے ظالم + یاد آتا ہے مجھے حال امام مسموم

بزرگان دین کے ساتھ والہانہ عقیدت کے پہلو بہ پہلو مخالفوں پر طعن بھی کرجاتے ہیں جو ایک ایسے شاعر کے لئے نا زیبا ہے جس کا کلام پبلک کے سامنے پیش ہو مثلاً قصیدہ (۳) میں

وہ شوخ بے سبب آزار و بیگنہ خونریز کہ جرم قاتل عثمان کا نہ ہو قائل

وہ نکتہ داں کہ تقیہ کو اصل دیں کہیے تا ——— دمِ شکایتِ عاشق نہ ہو جفا سے خجل
وہ دور بیں کہ خدا پر کرے بدا ثابت ——— نہیں ہے غیر زبس اعتماد کے قابل
وہ فتنہ گر بہ بیتِ حق ناشناس ناانصاف ——— جو فرضِ عین گنے کینِ داور عادل

مومن کو متعدد علوم میں دستگاہ حاصل تھی - یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں بلاقصد علمی اصطلاحات آجاتی ہیں جو قصیدہ کے شکوہ کے لئے تو مناسب ہیں - مگر اغلاق کلام کی بڑے حد تک ذمہ دار ہیں - قصیدہ نعت کے آخر میں فرماتے ہیں

حکیم وہ ہوں کہ جاتے رہیں حواس اگر ——— کرے معارضہ سر رفتہ عقول و نفوس
طبیب وہ ہوں کہ ہو سوز سینۂ بلبل ——— نظارۂ رخِ گلفام سے مجھے محسوس
جو ہوں معالجِ مبطوں تو قابضِ ارواح ——— کرے دعا سے رواجِ طریقِ جالینوس
درم ہو چارہ گرِ قبض تا بدستِ لئیم ——— کیا ہو میں نے جو تجویز وزنِ مغز فلوس
کروں جو گردشِ انجم کی میں رصد بندی ——— فدا ہو وجد میں آ کر روانِ بطلموس
گواہ عصمتِ مریم ہو کثرتِ اولاد ——— عقیمہ مجھ سے سنے گر بیانِ شکلِ عروس
طلسم ماہ لکھوں گر پئے زباں بستن ——— بنا سے مہرِ دہن پیچ پیچ نکتۂ جاسوس
یقیں کہ زہرہ و خورشید میں مقابلہ ہو ——— پڑھوں جو میں پئے دوریٔ تماجہ بطلیوس

(قصیدہ ۴) جو شمس شمسۂ قصر اس کا ہو تو ہندسہ داں ——— کریں نہ مدخلِ ظل سے تمیز مخرجِ ظل
رواجِ حسنِ عمل تیرے دور میں یہ ہوا ——— کہ گفتگو میں بھی مرفوع ہو گیا فاعل
وہ داد و چشم ترا صوفیوں نے دیکھا ہے ——— جبھی تجدد امثال کے ہوئے قائل

(قصیدہ ۵) سپہرِ اقبال کا آ جائے اگر دور قریب ——— تو ثوابت سے گراں تر وہ ہوں نجومِ سیار
ذروۂ اوج سے برجیس کو رجعت ہو جائے ——— ثور میں زہرہ کرے مہ کے قران سے انکار
زیست اپنی ہے تو تربیع و تقابل کے سوا ——— بھول جائیں گے منجم جو ہیں باقی انظار

کہیں کہیں تلمیحات یا آیات و احادیث کی طرف اشارات بھی ہیں جن میں سے بعض اجنبی ہونے کی وجہ سے بعید الفہم ہوگئے ہیں مثلاً

ترے عدو کی خرابی کا کچھ علاج نہیں
نہ ہو قبول دعا سے بھی از رعت لبسوس

اگر کہے مدد ے یا محمدؐ عربی
سفیر مرگ ہو رستم کو نعرۂ الکوس

ہیں گدا پر غرور شیرویہ
بے گنہ جو کیا ہے خون پدر

جب اولو الفضل منکم لے حاسد
اُس کے حق میں کہے جہان داور الخ

سُن کے لایحتسب کا مژدہ ہوا
کافروں کو بھی گو نہ گونہ خطر

(۲) غزلیات

چونکہ اس حصہ میں غزلیات ہی کو ایڈٹ کیا گیا ہے۔ اسلئے غزلیات کے محاسن پر مفصل بحث علیحدہ ہوگی۔ اس وقت صرف اتنا یاد رکھنا کافی ہے کہ غزل ہی مومن کی معراج الکمال ہے اور اسی کے بدولت وہ صاحب طرز مانے گئے۔

(۳) فردیات

اس موضوع میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں۔ جو اُن کا عام رنگ ہے فردیات میں بھی موجود ہے۔ چند معمے بھی لکھے ہیں جو نہایت دلچسپ اور غور طلب ہیں

(۴) قطعات

اُنھوں نے ۲۳ قطعے لکھے ہیں جن میں سے بعض کافی طویل الذیل ہیں اور عشقیہ انداز میں ہیں۔ ہر قطعہ دلکش اور اُن کی اُستادی فن کا شاہد عدل ہے

جو قطعاتِ تاریخی ہیں وہ بھی اپنے رنگ میں لاجواب ہیں۔ ان کی نادرہ کار طبیعت
نے تعمیہ و تخرجہ میں وہ وہ باریکیاں پیدا کی ہیں کہ باید و شاید چند مثالیں ملاحظہ ہوں

شاہ عبد العزیزؒ کی وفات کی تاریخ

دستِ بیدادِ اجل سے بے سروپا ہوگئے فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

مصرعۂ ثانی کے الفاظ کے سروپا (اول و آخر) دور کرنے سے ق ۱۰۰ - ی ۱۰ - ض ۸۰۰ - ن ۵۰ - ط ۹ -
ر ۲۰۰ - ل ۳۰ - م ۴۰ حاصل ہوتے ہیں جن کے اعداد ۱۲۳۹ھ ہوئے۔

اپنے والد کے مرنے کی تاریخ

جنازہ اٹھایا فرشتوں نے آ تو قد فاز فوزاً عظیما کہا

قد فاز فوزاً عظیما کے عدد ۱۳۰۷ ہیں اُن میں سے جنازہ کے اعداد (۶۶) خارج
کرنے پر ۱۲۴۱ھ باقی رہتے ہیں جو مطلوب ہیں۔

بیٹی کی ولادت کی تاریخ

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے کہی تاریخ دخترِ مومن

دخترِ مومن (۱۳۴۰) سے نال کے اعداد (۸۱) دور کردو۔ سنہ مطلوب
(۱۲۵۹) برآمد ہونگے۔ سادہ تاریخیں بھی اپنی سادگی میں بے مثل ہیں۔ جیسے
اپنی جدّہ کی وفات کی تاریخ۔ دخلت بالنعیم۔ گلشن بیجار کی تاریخ۔ گلدستۂ گلستانِ معنی
قطعات کے عنوان کے ماتحت بعض چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی ہیں جن میں
کسی واقعہ کی تاریخ ہے اور سہولت کے خیال سے اُس عنوان کے
ذیل میں درج کی گئی ہیں۔

(۵) رباعیات

رباعیاں لکھنا بظاہر بہت آسان ہے مگر درحقیقت نہایت دشوار۔

ایک اچھے رباعی نگار کا فرض ہے کہ ایک منفرد خیال کو چار مصرعوں میں نہایت موثر اور لطیف انداز میں بیان کرے کہ اس سے بہتر پیرایہ متصور نہ ہو سکے۔ چوتھا مصرع عموماً حاصل رباعی اور زبان کے اعتبار سے چست تر ہونا چاہئے مومن کی رباعیاں اس معیار پر پوری اُترتی ہیں اور اگرچہ اُردو کے مشہور رباعی نگاروں یعنی انیسؔ و دبیر و حالی کی رباعیات کی طرح بلند نہیں تاہم ہماری زبان کی عمدہ رباعیوں میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ یہ عشق و محبت۔ توبہ و مناجات۔ ولاے اہلبیتؓ۔ مذہبی مطاعن کے مضامین پر مشتمل ہیں اور ردیف وار مندرج ہیں۔ تعداد ۱۳۱ ہے چند مثالوں سے رنگ کا اندازہ ہوگا۔

رباعی

کیا گوشہ خفا میں انجمن میں بھی تو تھا
کیا وحشت کہ تنگدل چمن میں بھی تو تھا
کچھ اور نہیں سفر میں ایذا لیکن
اک درد ہے دل میں جو وطن میں بھی تو تھا

دیگر

اے خواجۂ خواجگاں دم خشم و عتاب
کیا تاب کہ دے سکے کوئی تجھکو جواب
گر جرم کا میرے وزن کرنا ٹھیرا
انصاف سے کر اپنے کرم کا بھی حساب

دیگر

تابندگی عذار سے فرق امامؑ
تھا جلوہ نما سناں پہ جوں ماہ تمام
یہ حجت ساطع کرامات حسینؑ
افزوں ہوئی تیرہ روزی لشکر شام

دیگر

خالص ہوں محمدی مرا دین اسلام
گو راستہ صواب ہو نہیں مجھکو کلام
تقلید کی ٹھیری تو ہونگا شیعہ
کس واسطے چھوڑ دیجئے فضل ترا مام

بعض رباعیاں مستزاد کی شکل میں بھی لکھی ہیں - اور اپنے رنگ میں خاصی ہیں -

(۶) مستزادات

ذکر اوپر گذرا -

(۷) مسمّطات

اس عنوان کے ماتحت مثلث - مخمس - مسدس - مثمن سبھی کچھ ہیں اور خوب ہیں - یہ سب تعداد میں ۱۹ ہیں - بعض میں دوسروں کے اشعار کی تضمین کی ہے اور بعض خود اُن کی مستقل نظمیں ہیں - تضمین کی خوبی یہ ہے کہ مصرعے اس طرح دست و گریبان ہوں کہ اُن میں اور اصل اشعار میں مشکل سے امتیاز ہو سکے ہر شخص بلا خوف تردید کہہ سکتا ہے کہ مومن کی اکثر تضمینیں اس معیار کی مصداق ہیں - ایک آدھ بند سے صحیح اندازہ تو دشوار ہے - تاہم بخوف طوالت صرف دو مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے -

یارانہ بتاں پہ بھلا اعتماد کیا　　یا تو کسی کو دخل نہ تھا واں کے ہر سوا
یا اس قدر وہ شکل سے بیزار ہو گیا　　گر بیم سرگرانی او نیست غیر را
منعم چرا ز ہمرہی خویشتن کند

دیگر

ناصح ذلیل گننے لگے مجھکو شیخ و شاب　　ملنے سے میرے کرنے لگی خلق اجتناب
اب تو خوشی ہوئی تری آخانماں خراب　　رسوا تیم رسید بجائے کہ از حجاب
دیگر بپیش او نتوانم کشاد چشم

ہماری رائے میں مصرعوں کے تسلسل اور زبان کی صفائی کے اعتبار سے مومن کا کلام اس قدر بلند ہے کہ اس کو [illegible] انتہائی اونچا کہنا چاہئے -

اس عنوان کی جو مستقل نظمیں ہیں وہ سب کی سب واسوخت ہیں۔ واسوخت یا واسوز اس نظم کو کہتے ہیں جس میں شاعر تنگ آ کر معشوق کو ترکِ محبت کی دھمکی دے یا دوسرے سے عشق کا ارادہ ظاہر کرے۔ مومن کو جو قدرۃً عاشق مزاج واقع ہوئے تھے واسوخت سے لازمی طور پر مناسبت ہونی چاہیے تھی چنانچہ اُن کے واسوخت صحیح معنی میں "جلی کٹی" سنانے اور چھیڑ چھاڑ کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ اور ہر ایک میں ملاحت۔ گلہ، طعن اور جوش کی وہ افراط ہے کہ داد نہ دینا ظلم ہے۔ تو سنتا وہ اپنے مُحبوب کو کیونکر ... صاف صاف سنا رہے ہیں۔

وہ جو ہمدم ہے تیری سیپارہ — شوخ جیسے نجوم سیّارہ
وہ بھی ہونی چلی ہے آوارہ — تازہ تازہ ہے شوقِ نظارہ

مژہ سے شوخیاں ٹپکتی ہیں
آنکھیں زہرہ نمط جھپکتی ہیں

بسکہ ہے ولولہ جوانی کا — لطف ڈھونڈے ہے زندگانی کا
قصہ سن میری جانفشانی کا — شیوہ سیکھا ہے مہربانی کا

گم شدہ دل کی جستجو ہے بہت
مجھ سے عاشق کی آرزو ہے بہت

ڈھب پہ اپنے اُسے لگا لونگا — حسرت و آرزو نکالوں گا
تجھ سے بے باک تر بنا لوں گا — ناز و انداز سب سکھا لوں گا

چاہے جو آفتِ زمانہ بنے
غیر نا آشنا یگانہ بنے

ایک بند اور سنیئے اور لطف اُٹھائیے۔

چھوڑ دینا تھا نہیں جھوٹ قسم کو نہ مجھے | دل سے کھونا تھا اس انداز ستم کو نہ مجھے
بھول جانا تھا جفائے پئے ہم کو نہ مجھے | نیست کر دینا تھا اندوہ والم کو نہ مجھے

قابلِ ترک تھی خو سے ستم آرا نہ کہ میں
لائق مہو تھی یہ رنجشِ بیجا نہ کہ میں

(۸) ترجیع بند

تمام کلیات میں ایک ترجیع بند ہے جس میں ۱۴ بند ہیں اور اپنے انداز میں بے مثل۔ مضمون عاشقانہ ہے اور رنگ متغزلانہ۔

(۹) ترکیب بند

ترکیب بند بھی صرف ایک ہے اور زور کمال کے اعتبار سے یکتا۔ عنوان ملاحظہ ہو۔

ترکیب بند بہ مضمون مرثیہ معشوقہ حور ملک شیم حسنہا وصالہا فی جنت النعم۔
یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اُس قسم کا مرثیہ" اُردو میں مشکل سے ملیگا جو ایک طرف نازک خیالی اور بدیع الاسلوبی کا مکمل مرقع ہو اور دوسری طرف سوز و گداز کی سچی تصویر۔ مرزا غالب نے بھی ایک آدھ مرثیہ لکھا ہے مگر مومن کے یہاں درد و اثر زیادہ ہے۔ یوں تو کل ۱۲ بند ہیں مگر کہیں کہیں سے صرف چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

سر پیٹتا ہے شانہ پڑا دونوں ہاتھ سے | کیا جانے اُس کی زلف پریشاں کو کیا ہوا
شبنم کو کیوں ہے جانبِ خورشید التفات | شرمندہ ساز مہر درخشاں کو کیا ہوا
دل میں شکن ہے زلف مسلسل کدھر گئی | برہم ہے حال کاکل پیچاں کو کیا ہوا
لذت فزا نہیں الم اُس لب پہ کیا بنی | کچھ زخم بے مزہ ہیں نمکداں کو کیا ہوا

بوئے قبائے یوسف گل ہے نسیم میں | اس کی شمیم عطر گریباں کو کیا ہوا
گردش پہ اپنی ناز ہے پھر روزگار کو | اس چشم رشک فتنۂ دوراں کو کیا ہوا

بند دیگر

افسوس کوئی پردہ نشیں پردہ در نہیں | وہ حسن جس سے عشق ہو رسوا نہیں رہا
دل میں جگہ نہ ہونے کا کس سے گلا کروں | وہ قدرداں شکوۂ بیجا نہیں رہا
اب کس کو دیکھئے کسی کو دیکھئے | وہ پردہ سوز چشم تماشا نہیں رہا

غرض کہاں تک لکھا جائے۔ ہر ایک شعر تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے

از دل می خیزد بر دل می ریزد

(۱۰) مثنویات

اس عنوان کے تحت میں دو منظوم خط اور چند مستقل مثنویاں ہیں جنکی تفصیل حسب ذیل ہے۔ (۱) شکایت ستم۔ (۲) قصہ غم۔ (۳) قول غمیں۔ (ذکر عشق مومن با امتہ الفاطمہ بیگم معروف بہ صاحب جی)۔ (۴) تف آتشیں۔ (۵) حنین مغموم۔ (۶) آہ و زاری مظلوم۔ (۷) مثنوی ناتمام۔ (۸) مثنوی دیگر۔ (۹) مثنوی دیگر۔ (۱۰) مثنوی جہادیہ۔ ان مثنویوں کو پڑھ کر ان کی استادی و قادر الکلامی کا کلمہ پڑھنا پڑتا ہے۔ ان میں سے شروع کی چھ مثنویاں جن کے نام تاریخی ہیں۔ عشقیہ ہیں اور جگ بیتی نہیں بلکہ آپ بیتی ہیں۔ مومن کی شاعری میں عام طور پر داخلی رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مثنوی بھی جو عموماً خارجی مضامین کے لئے مخصوص ہوتی ہے اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ دقت پسندی۔ مضمون آفرینی۔ تکلف۔ معاملہ بندی۔ پیچ الاسلوبی جو اُن کی غزلیات کا وصف ہیں۔ مثنویات میں بھی علی وجہ الکمال نظر آتی ہیں۔ اکثر موقعوں پر زبان کی سلاست اور

جدید تراکیب کی لطافت دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے - البتہ بیان میں کہیں کہیں عریانی پیدا ہو گئی ہے جس سے بقول شمس العلما امداد امام اثر کوچہ گردی کی بو آتی ہے - "یہ صحیح ہے کہ اُن کا عشق "مجازی ہی نہیں - بوالہوسانہ بھی ہے - مگر پرواز داستان لطف سے خالی نہیں - جب تک کوئی مثنوی یا لااستیعاب نہ پڑھی جائے اُس کی نسبت صحیح رائے قائم کرنا - یا اُس سے پورے طور پر محظوظ ہونا مشکل ہے" تاہم بہ فحوائے مالا یدرک کلہ لایترک کلہ چند شعر نقل کئے جاتے ہیں -

تمہید - اب عشق ہوا ہے مہرباں پھر ... ہے تاب ہے جان ناتواں پھر
پھر دل کو تپش سی ہو رہی ہے ... سینے میں خلش سی ہو رہی ہے
پھر داغ کہن ہے تازہ و تر ... پھر زخم جگر ہنسے ہے گل پر
پھر ناوک درد دل شکن ہے ... پھر سینہ کا زخم خندہ زن ہے

معاملہ بندی - آئینہ کو رکھتی آگے لاکر ... اور کہتی یہ منہ سے منہ ملاکر
لو دیکھو ذرا کرو خود انصاف ... ہم دونوں میں کس کا رنگ ہے صاف
ہے دونوں میں کون خوبصورت ... ہے دونوں میں کون ماہ طلعت
پھر اپنے غرور میں جو آتی ... خاطر میں کسی کو بھی نہ لاتی
خود بینی سے ہوش میں نہ رہتی ... آئینہ کو پھینک مجھ سے کہتی
دیکھو تو بغور چشم بد دور ... یوسف کہ وہ ہے جہاں میں مشہور
کیا اُس کی بھی صورت ایسی ہی تھی ... کیا اُس کی بھی طلعت ایسی ہی تھی
مانا بھی کہ یہ ہی رنگ رو تھا ... ایسا ہی وہ چہرۂ نکو تھا
یہ چشم سیاہ تو نہ ہو گی ... یہ شوخ نگاہ تو نہ ہو گی
یہ فتنہ خرام چلن نہ ہوگا ... ہر بات میں بانکپن نہ ہوگا

کیفیت عاشق۔ گرمی شوق سوز پنہانی — آہ سحر کی شعلہ فشانی

چشم سحر آلودہ کا شکوہ — بخت بخواب آسودہ کا شکوہ

قوت فزائی غصہ و غم کی — آب دہی خونناب ستم کی

ہجر قیامت زا کی شکایت — مرگ قدم فرسا کی شکایت

عرض حجابِ رسوا کردن — عذر امیدِ بیجا کردن

حرف زباں زد ہجر کی کاوش — عرض مکرر وصل کی خواہش

عشقیہ مثنویوں میں بھی کہیں کہیں دوسرے فرق اسلامیہ پر طعن کرجاتے ہیں ممکن ہے کہ یہ ناسخ کے مذہبی مطاعن کا جواب ہو۔ تاہم ایک پبلک شاعر کے شایان شان نہیں معلوم ہوتا۔

باقی مثنویوں میں حمد۔ نعت ۔ مناجات اور جہاد کے مضامین ہیں۔ یہ سب تلاش مضمون اور جوش اعتقاد کے لحاظ سے ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ مضمون طویل ہوا جاتا ہے مگر جی نہیں مانتا کہ قارئین کرام کو اپنے ساتھ اس لطف میں شریک نہ کیا جائے اس لئے مشتے نمونہ از خروارے ملاحظہ ہو۔

حمد۔ وہ حافظ کہ آتش سے خس کو بچائے — تپ عشق سے بوالہوس کو بچائے

وہ ناصر کہ گر اس کی امداد ہو — فغاں سے مری چرخ برباد ہو

وہ عادل کہ دے زلف کو پیچ و تاب — اگر جان عاشق کو ہو پیچ و تاب

وہ قادر کہ گر چاہے اُس کا کرم — مٹا دے مرے دل سے عشق صنم

نعت۔ وہ اُمی وسلے نقشبند علوم — کلام اُس کے سب دلپسند علوم

کہاں ایسا علامۂ روزگار — کہ حکم کواکب ہو تقویم پار

نہیں عقل اول کو بھی یہ مجال — اُسی کو ہے معلوم آخر کا حال

ز بس سایہ تھا ہم شمار گناہ	نہ حاصل ہوا قرب عصمت پناہ
مناجات عشقیہ۔ الٰہی مجھے دل دے اور دل کو داغ	جلے صبح محشر تلک یہ چراغ
مری چشم دریا بہاتی رہے	مری آگ عالم جلاتی رہے
مرا دلولہ خوں تراوی کرے	نہانی خلش سینہ کاوی کرے
سلاسل پہ زور آزماتا رہوں	سدا بیڑیاں میں تڑاتا رہوں
کبھی ہرزہ گردی ٹھکانے لگے	کسی شوخ کو رحم آنے لگے

انصاف سے کہنا یہ مضمون - یہ بندش - یہ زورِ بیان یہ لطف ادا کسی اور کے یہاں بھی ہے - کون کافر ہے جو اس قادر الکلامی کو دیکھ کر بھی مومن کے کمال پر ایمان نہ لائے۔*

(ب) غزل

آمدم بر سرِ مطلب

دلم از پردہ بشد حافظِ خوش لہجہ کجاست
تا بہ قول و غزلش سازِ و نوائے بکنیم

اوپر آپ پڑھ آئے ہیں کہ غزل مومن کا سرمایہ کمال ہے اور اسی کی بدولت آج وہ صاحب طرز اور مجتہد فن مانے جاتے ہیں - اب ذرا اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو -

۱ - یہ امر قابل لحاظ ہے کہ مومن ہمیشہ روش عام سے علیحدہ رہتے تھے - اُن کی مشکل پسند اور جدت طراز طبیعت کسی شعبہ میں بھی "تقلید" کرنا عار سمجھتی تھی -

---

* ذرّی نہاد یہ کے اشعار اوپر منقول ہوئے - اسلئے اعادہ بیکار -

پھر شاعری اس کلیہ سے کیونکر مستثنیٰ رہتی۔ اسی لئے اُنھوں نے اس میں نئی طرز ایجاد کی۔ جو معاملہ بندی کے باوجود جرات کے انداز سے بلند تر ہے اور مضمون آفرینی کے باوصف غالب کی طرز سے نازک تر۔ مومن نے چندروز شاہ نصیر کو جو بقول صاحب شعرالہند دہلی کے ناسخ تھے اپنا کلام دکھایا تھا پھر جب ناسخ کا دیوان لکھنؤ سے دہلی پہونچا تو مومن و غالب دونوں نے اُن کا تتبع کرنے کی کوشش کی مگر شکر ہے کہ یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ ورنہ اُردو کو مومن کا انفرادی رنگ کیونکر نصیب ہوتا اور غالب کے فلسفیانہ حقائق کیسے عالم وجود میں آتے۔

چند شعر نصیرؔ و ناسخ کے پڑھئے اور غالب و مومن کے ابتدائی کلام سے موازنہ کیجیے۔ بہت کم تفاوت ہوگا۔

نصیر۔ لَو لگ رہی ہے جس سے وہ شمع رو نہ آیا
بل بے تری شرارت یاں تک کبھو نہ آیا

ہو اُس دہن سے روکش سیلی صبا کی کھائی
غنچہ کے آہ مُنہ سے کس دن لہو نہ آیا

دنداں دکھا کے مت ہنس لے بخیہ گریباں
چاکِ جگر کا ہم کو طورِ رفو نہ آیا

اپنی بھی بعد مجنوں یارو ہوا بندھی ہے
لے گرد بادِ خیمہ کب کو بکو نہ آیا

ناسخ۔ مُنہ کو دامن سے چھپا کر جو وہ رقصاں ہوتا
شعلۂ حُسن چراغِ تہِ داماں ہوتا

نکہتِ کاکلِ پیچاں سے جو دیتے تشبیہ
عطرِ مجموعہ کا ہر جز و پریشاں ہوتا

خوں رُلاتا وہیں ناسور بنا کر گردوں
زخم بھی گر مرے تن پر کبھی خنداں ہوتا

کون ہے جو نہیں مرتا ہے ترے قامت پہ
کیوں نہ ہر سروِ چمن قالبِ بیجاں ہوتا

غالب۔ نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے
لگا دے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

فروغِ حُسن سے ہوتی ہے حلِ مشکلِ عاشق
نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خار آتش

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

بیاں کیا کیجئے بیداد کاوش ہائے مژگاں کا ۔۔۔ کہ ہر اِک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیح مرجاں کا

مومن۔ لے اُڑی لاشہ ہوا لاغر بس تن ہو گیا ۔۔۔ ذرۂ ریگِ بیاباں اپنا مدفن ہو گیا

بن ترے اے شعلہ رو آتشکدہ تن ہو گیا ۔۔۔ شمع قد پر میرے پروانہ برہمن ہو گیا

تاش کا ہمدم کفن لانا کہ بس میں مر گیا ۔۔۔ چلونوں سے جلوۂ خورشید سیما دیکھکر

یاد آیا سوے دشمن اُس کا جانا گرم گرم ۔۔۔ پانی پانی ہو گیا میں موج دریا دیکھکر

یہ طرز جس کی بڑی خصوصیت آورد تھی زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہی اور دونوں اُستادوں (غالب و مومن) کے ذوق سلیم نے اس کو نباہنے سے اِبا کیا۔ آخر غالب نے رنگ میر اختیار کیا اور مومن اپنے ذاتی طرز پر آگئے۔ اس سلسلہ میں یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ اُن کے ہم عصروں میں ذوق و غالب دونوں "مقلد" ہیں یعنی ایک[1] کے کلام میں سودا۔ نصیر۔ معروف مصحفی۔ انشا۔ جرات کا تتبع پایا جاتا ہے اور دوسرے کے یہاں بیدل و میر کا۔ صرف ایک مومن ہیں جنکو مجتہد فن کہا جا سکتا ہے۔ ابتداے مشق میں ضرور ان کے کلام میں بھی ناسخ و نصیر کا رنگ جھلکتا تھا۔ علاوہ بریں کہیں کہیں بیدل کا انداز بھی نظر آتا تھا۔ راقم الحروف کے کرم فرما جناب سید یعقوب الحسن نے جو شعر فہمی اور نکتہ شناسی میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں مومن کی شاعری کا نہایت گہرا مطالعہ کیا ہے اور ان کے کلام کے بیحد معترف ہیں۔ راقم نے اُن کا ذاتی نسخۂ دیوان مومن دیکھا اور اُن کے استقصاے مطالعہ اور دقت نظر کی داد دی۔ غزلیات میں ہر شعر پر نشان لگا ہوا تھا اور اس امر کی صراحت تھی کہ یہ شعر سودا۔ میر۔ ناسخ۔ جرات۔ امانت۔ غالب کے رنگ میں

---

[1] آب حیات۔

لکھا گیا ہے یا مومن کی خاص طرز ہے اور یہ تقسیم ہے بھی درست۔ کیونکہ اُن کے یہاں اِن اساتذہ کے طرز میں بھی کافی اشعار ملتے ہیں۔ اگرچہ زیادہ نہیں۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اِن سب باتوں کے باوجود اُن کی غزلیات ایک خاص طرز کی حامل ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ طرز ہے کیا۔ اس کا جواب آگے آتا ہے۔ اس طرز کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(۱) **تغزل**۔ اُردو شعرا میں مومن نفس تغزل کے اعتبار سے جس نقطۂ عروج تک پہونچ گئے ہیں دوسروں کو اُس کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ فارسی کے شعرائے متاخرین کی غزلوں میں تغزل کے علاوہ فلسفہ۔ اخلاق۔ تصوف سبھی کچھ ہے اور اُردو غزل میں بھی یہی کیفیت عام طور پر پائی جاتی ہے۔ بلکہ جس طرح امام رازی کی تفسیر کی نسبت کسی نے کہا ہے کہ فیہ کلُّ شیءٍ الا التفسیر۔ یہی بعض اساتذہ اُردو و فارسی کا حال ہے کہ اُن کی غزل میں سب کچھ ہے تغزل ہی نہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ایسا کرنا حدود تغزل سے متجاوز ہونا ہے یا نہیں۔ ہمارے خیال میں ایک غزل نگار کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ غزل کی بنیاد صرف اُن واردات پر رکھے جن کا تعلق جذبات عشق و محبت سے ہے۔ دوسرے مضامین بھی ضمناً آجائیں تو مضائقہ نہیں صرف خشک فلسفہ نظم کر دینا یا مسائل تصوف کو موزوں کر دینا تغزل کیونکر کہا جا سکتا ہے اس کے لئے غزل کو چھوڑ کر دوسری اصناف شعر سے کام لیا جائے تو بہتر ہے۔ غزل لکھتے وقت اِن مضامین کی آڑ میں پناہ لینا عجز شاعرانہ تو کہا جا سکتا ہے۔ قدرت کلام کی دلیل ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مومن کا وصف یہ ہے کہ انھوں نے غزل کو اُس کے حقیقی مفہوم میں منحصر کر دیا۔ مانا کہ ایسا کرنے سے شاعری کا میدان تنگ تر ہو گیا۔ لیکن یہ عیب نہیں بلکہ ہنر ہے کہ اُن کی دقیقہ سنج طبیعت

نے "ظرفِ تنگنائے غزل" میں اِن قیود کے باوجود وہ جولانیاں دکھائیں اور اس محدود موضوع میں وہ تنوّعات پیدا کیئے کہ تمام معاصرین پر سبقت لے گئے اور نفس تغزل کے لحاظ سے "بہترین غزل گو" کہے جانے کے مستحق ٹھہرے۔ غزل تو غزل دوسری اصناف میں بھی اُن کے یہاں یہی رنگ چڑھا ہے۔ قصائد کی تشبیب۔ مثنویات۔ قطعات۔ رباعیات وغیرہ وغیرہ سب کی تان اسی پر آکر ٹوٹتی ہے۔ الا ماشاءاللہ۔ ممکن ہے کہ کوئی خردہ بین اس کو وضع الشئ فی غیر محلہٖ سے تعبیر کرے مگر مومن اپنی رنگینیٔ طبیعت سے مجبور ہیں تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مومن دنیا کو اپنی نسبت مغالطہ میں رکھنا نہیں چاہتے۔ کہ عشق کے جذبہ سے ناآشنا ہوں اور "بہ ضرورت شعر" خود کو عاشق ظاہر کریں۔ یا عشق مجاز کی منزل میں ہوں اور متصوف بنیں۔ مومن کی شاعری اکثر اساتذہ دہلی کی شاعری کی طرح تقریباً تمامتر داخلی ہے۔ لکھنؤ کے شعرا خارجی متعلقات حُسن وعشق پر زیادہ زور دیتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کا کلام پھیکا اور بے اثر ہو کر رہ گیا۔ اُس رنگ کے چند شعر سُنئے۔

(ناسخ) یہ میرے پاؤں ہوں زنجیر کے کبھی شاکی — جو اُس کی کاکل پیچاں کی اتھ میں لٹ ہو

کبود رنگ ہے مسّی کا تیرے ہونٹوں میں لال — ملیں جو دونوں تو پیدا نہ کیوں اُداہٹ ہو

نسیم آہ کے جھونکے سے کہ دلبروں نے تم نے بیا — بھرا ہوا ترے دروازے کا اگر پٹ ہو

ہجوم رکھتے ہیں جانبازیوں ترے آگے — جواریوں کا دِوالی کو جیسے جمگھٹ ہو

اس کے برخلاف مومن کے یہاں مضامین وصل۔ ہجر۔ رشک۔ رندی۔ جنون۔ نازو ادا سب میں داخلی انداز نمایاں ہے۔ مثالوں اور اُن کی تشریح میں طوالت کا اندیشہ ہے زیر نظر ایڈیشن آپ کے روبرو ہے۔ پڑھئے اور لطف اُٹھائیے۔ اگر مثالوں ہی بہا پر

اصرار ہو تو تین چار شعر سن لیجئے۔

یارب وصال یار میں کیونکر ہو زندگی — نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ

شب ہجر میں کیا ہجوم بلا ہے — زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

سمجھتا کیونکہ دیوانے کی باتیں — نہ پایا محرم اپنے رازداں کو

عیش میں بھی کبھی جاگے نہیں تم کیا جانو — کہ شب غم کوئی کس طور بسر کرتا ہے

چھٹ کر کہاں اسیر محبت کی زندگی — ناصح یہ بند غم نہیں قید حیات ہے

اس قسم کے اشعار پڑھ کر (جن کی تعداد کلیات میں بہت کافی ہے) ان کے صدق جذبات۔ جوش قلب۔ سوز و گداز درد و اثر کی بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے۔

مومن کی شاعری کے بحث میں یہ سوال اکثر اٹھایا جاتا ہے کہ ان کے عشق کی نوعیت کیا ہے اور ان کا مخاطب صحیح کون ہے۔ جو شخص ان کے کلام کا مطالعہ کریگا وہ بیک نظر بتادیگا کہ ان کا "عشق" نہ صرف مجازی بلکہ گونہ ہوسناکی کا انداز لئے ہوئے ہے اور ان کا روئے سخن بیشتر کسی "پردہ نشین" کی طرف ہوتا ہے ان کا عشق وصل و ہجر کی کشمکش میں مبتلا ہے اور ان کا دل امید و بیم کے دوراہے پر حیران ان کے معشوق کو گلہ "رقیب" کا بھی خیال ہے اور "طعن اقربا" کا بھی اندیشہ۔ ملاحظہ ہو

اے پردہ نشین چلوں اٹھا دے کہ نہ جائے — کرتا ہوں میں سوز غم ہجراں کی شکایت

کیسے گلے رقیب کے کیا طعن اقربا — تیرا ہی دل نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

عشق پردہ نشیں میں مرتے ہیں — زندگی پردہ ور نہ ہو جائے

یارب کوئی معشوقہ دلجو نہ ملے آپ — جو اُن کی دعا ہے وہی اپنی بھی دعا ہے

پردہ نشین کا لفظ جس تکرار سے انھوں نے استعمال کیا ہے کسی دوسرے استاد نے نہیں کیا اس حقیقت پر نظر کرتے ہوئے ان کی صحت مذاق اور صدق جذبات میں

کسی شبہہ کی گنجایش نہیں رہتی - البتہ یہ کہنا[۵۵] درست نہیں کہ اُن کا محبوب ہمیشہ جنس لطیف سے ہوتا ہے - "مالک کی پست مذاقی اور بے اصولی کے اثر سے وہ کہیں کہیں "بُت پردہ نشیں" کو چھوڑ کر "طفل برہمن" سے بھی چھیڑ چھاڑ کرنے لگتے ہیں - مثلاً

دلِ مومن آتشکدہ کیوں بنے	لگاوٹ یہ طفلِ برہمن سے ہے
رقیبوں پر ہوئی کیا آج فرمایش جواہر کی	کہ ہیرا عاشق خطِ زمردفام لیتا تھا
یادِ خطِ نگار میں ہم زہر کھا موے	کیا آب زندگی کا ہوا ہے خضر سے فیض
غم خط میں ترے مرجائیں تو کچھ کیا عجب ہے	زہر کو جو کوئی کھاتا ہے ضرر کرتا ہے

مگر یہ اُن کا عام رنگ نہیں -

یہاں ایک نکتہ قابل لحاظ ہے - اکثر ارباب فن کسی شعر کو اس بنا پر کہ اُسمیں محبت مجازی کی کوئی ایسی واردات بیان کی گئی ہے جس سے کوچہ گردی کی بو آتی ہے قطعاً مسترد کر دیتے ہیں - یہ طریق انتقاد صحیح نہیں معلوم ہوتا شعر اور اخلاق کو ملا دینا خلط مبحث نہیں تو اور کیا ہے اگر محقق دوانی شعر گوئی سے عاری ہوں یا حافظ شیرازی اخلاق پر مقالہ نہ لکھ سکیں تو دونوں کے کمال فن میں کیا فرق آتا ہے - کسی شعر میں عشق کی روداد ہے یا اخلاق و تصوف کا فقدان ہے تو اس سے شعر میں کوئی نقص نہیں - دیکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ عشق یا حُسن کی نسبت جو خیال ظاہر کیا گیا ہے سلیقہ سے ظاہر کیا گیا ہے یا نہیں - اگر بیان میں رکاکت ابتذال یا خامی ہے تو بیشک شعر ناقابل قبول ہے - یہ امر موجب اطمینان ہے کہ مومن کے مضامین عشقیہ میں جرات کی سی پستی اور ابتذال نادر الوقوع ہے -

---

۵۵ - برخلاف صراحت نگار (مومن نمبر) جنوری ۲۸ء

(۲) نازک خیالی اور مضمون آفرینی۔ متاخرین شعرائے فارسی کی شاعری کا یہ مابہ الامتیاز وصف ہے کہ وہ ذرا سی بنیاد پر تخیل کی سر بہ فلک عمارت قائم کر دیتے ہیں۔ فغانی اس طرز تازہ گوئی کا بانی گذرا ہے جس کے مقلد ایران میں محتشم کاشی اور شفائی اور ہندوستان میں عرفی و نظیری تھے اس رنگ کو ظہوری، جلال۔ طالب۔ کلیم نے ترقی دی اور علی و بیدل نے انتہا کو پہونچا دیا۔ ان لوگوں کے کلام میں عموماً اغلاق اور دقت پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ یا مبالغہ کا دور از کار ہونا ہے یا ایہام و رعایت پر شعر کا مبنی ہونا۔ یا استعارہ در استعارہ کا استعمال یا بڑے خیال کو مختصر عبارت میں ادا کرنا۔ مومن بھی فارسی کے شاعر تھے اس لیے اس رنگ سے ان کا آشنا ہونا ناگزیر تھا۔ تاہم اردو میں سب سے پہلے اور سب سے آخر انھوں نے ہی اس کو برتا اور اپنی دوسری خصوصیات کلام سے اسکو اپنا لیا۔ اس لئے یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ وہ اردو میں اس طرز کے موجد اور اس انداز میں منفرد ہیں۔ غالب بھی یقیناً ایک نازک خیال استاد ہیں مگر مومن شریک غالب ہیں۔ مثال کے طور پر چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔ جن سے مومن کی خلاقی المعانی طبیعت کا اندازہ ہوگا۔ مثلاً وہ ایک شعر میں شام وعدہ اپنے تھک کر سو رہنے کو کس خوبی سے "شکوہ" قرار دیتے ہیں۔

پھرنے سے شام وعدہ تھکے یہ کہ سو رہے | آرام شکوۂ ستم اضطراب تھا

یا معشوق کے نہ دیکھنے کو کس شوخی سے "نگہ التفات" ثابت کرتے ہیں۔

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے | اس کا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے

اور سنیئے۔

کرۂ خاک ہے گردش میں تپش سے میری | میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد ا

یعنی مجھے حالت اسیری میں بھی آزادی میسر ہے۔ اس واسطے کہ جب میں زنداں

میں تڑپتا ہوں تو میری تپش کے اثر سے تمام کرہ زمین گردش کرنے لگتا ہے اور اُس کے ساتھ میں بھی گردش کرتا ہوں اب آزادی کے لئے اور کیا چاہئے۔"

دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا رقیب | تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا

منجم نے شاعر کا حالِ زار دیکھا اور تاثیر نجوم کے حساب سے اُس کی ناکامی عشق کا پتہ لگا لیا۔ اور خود اُس کا رقیب بن بیٹھا۔ کیونکہ عاشق کی ناکامی دریافت کرکے اُس کو اپنی کامرانی کی توقعات پیدا ہوئیں۔ اس طرح اُس کا طالع ناساز دیکھنا منجم کے حق میں سازگار ہوا۔

اب چند شعر بغیر تشریح نقل کئے جاتے ہیں ورنہ مضمون طویل ہو جائے گا۔ واضح رہے کہ اُن کے خیالات کا دوسرے اساتذہ سے متوارد نہ ہونا اُن کی ندرت فکر کی برہان قاطع ہے۔

واعظ بتوں کو خلد میں لیجائینگے کہیں | ہے وعدہ کافروں سے عذاب الیم کا
بیزار جان سے جو نہ ہوتے تو مانگتے | شاہد شکایتوں پہ تری مدعی سے ہم
لذت جور کشی نے مجھے شرمندہ کیا | طعنے کیا کیا اُسے ارباب ستم دیتے ہیں
مرگ ہے انتہائے عشق۔ یاں ہی ابتدائے شوق | زندگی اپنی ہو گئی رنجش یار بار میں
عدو اس اوج پر شاکی ہے شاید غصہ آجاوے | ملا دے خاک میں یہ تو بھی شکر آسماں کیجئے
تھا مقدر میں اُس سے کم ملنا | کیوں ملاقات گاہ گاہ نہ کی

(۳) ندرت اسلوب اور شوخی ادا۔ صاحب مراۃ الشعر لکھتے ہیں کہ اچھا شعر حسن خیال حسن الفاظ۔ حسن ادا کا مجموعہ ہے۔ مومن کا کلام بڑے حد تک اس وصف کا مصداق ہے۔ اکثر اساتذہ کے کلام کے "تیر و نشتر" ہونے کا راز اسی میں مضمر ہے۔

ے میر کا کلام اس کی بہترین مثال ہے۔

کہ وہ سیدھے اور فرسودہ خیال کو ایسے دلکش اسلوب سے ادا کرتے ہیں کہ سننے والے دل تھام کر رہ جاتے ہیں۔ پھر خیال میں بھی ندرت ہو تو نورٌ علیٰ نور۔ صرف اس قدر احتیاط چاہیئے کہ کلام میں اغلاق اور زبان میں خامی نہ رہ جائے۔

مومن کے یہاں ندرت اسلوب کی اس قدر فراوانی ہے کہ ایک ایک قدم پر دل کھینچتا ہے اور لاریب کہ اس میں اُن کا نظیر محال نہیں تو قریب محال ضرور ہے مثلاً یہ کہنا ہے کہ محبوب کی گالی بُری نہیں معلوم ہوتی۔ اس کو وہ یوں ادا کرتے ہیں۔

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں | اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا

ایک جگہ فرماتے ہیں۔ محفل میں مرے ذکر کے آتے ہی اٹھے وہ | بدنامیٔ عشاق کا اعزاز تو دیکھو

یہ طفل تسلی ہو یا طنز یہ شوخی۔ بہرحال خوب ہے۔

معشوق قتل عام کرتا ہے۔ شاعر کو اسکی عاشق کشی پر کوئی اعتراض نہیں۔ شکایت ہے تو یہ ہے کہ اگر ایک کو دوسرے کے سامنے قتل کیا جاتا تو جذبۂ سفاکی کی تکمیل زیادہ خوبصورتی کے ساتھ ہوتی۔

کیا تم نے قتل جہاں اک نظر میں | کسی نے نہ دیکھا تماشا کسی کا

کس قدر بے پناہ شعر کہا ہے۔ الاماں۔

حرم کی شان یہ ہے کہ اس کا دروازہ ہر خاص و عام کے لئے کھلا ہے۔ نیز یہ کہ وہاں کشت و خون ممنوع ہے اس سے یوں مضمون پیدا کرتے ہیں۔

دربان کو آنے دینے پہ رہے نہ کیجئے قتل | ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم تھا

اور سنئیے۔ تم مرے پاس ہوتے ہو گویا | جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اسی شعر کے متعلق حالی نے یادگار غالب میں لکھا ہے کہ غالب نے اسکو سنکر بیحد تعریف کی اور کہا "کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھکو دیدیتا" اس شعر میں

لطف ادا کے علاوہ نفسیات کا ایسا گہرا مسئلہ حل کیا گیا ہے کہ داد نہ دینا ظلم ہے - چند شعر اور نقل کئے جاتے ہیں -

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری — چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

میرے کوچہ میں عدو مضطر و ناشاد رہا — شب خدا جانے کہاں وہ ستم ایجاد رہا

الجھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں — لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

تفریح نہ کیونکر ہو ہوا آ نہیں سکتی — گویا درِ دلدار نشیمن ہے ہمارا

بجلی گری فغاں سے مری آسمان پر — جو حادثہ کبھی نہ ہوا تھا سو اب ہوا

فکرِ مآل سے ہے وشادہ رہے عزیز — پیری میں موت یاد تھی پیری شباب میں

کثرت سجدہ سے وہ نقش قدم — کہیں پامال سر نہ ہو جائے

پامال سر کی ترکیب جس قدر نادر اور دلکش ہے ارباب فن سے مخفی نہیں - شوخی ادا کی تمثیل کے لئے ذیل کے اشعار پر اکتفا کی جاتی ہے - کلیات مومن سے مذاق سلیم اس قسم کی بیشمار مثالیں اخذ کر سکتا ہے -

نہ جاؤنگا کبھی جنت کو میں نہ جاؤنگا — اگر نہ ہوئیگا نقشہ تمہارے گھر کا سا

ہم چارہ گر کو یونہیں پہنائینگے بیڑیاں — قابو میں اپنے گر وہ پریزاد آگیا

کس دن تھی اسکے دل میں محبت ہوا کبھی — سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

ہم حال کہے جائینگے سنئے کہ نہ سنئے — اتنا ہی تو یاں صحبت ناصح کا اثر ہے

لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شب فراق — ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں

توبہ گنہ عشق سے فرمائے ہے واعظ — یہ بھی کہیں دل دے کے گنہگار ہوا ہے

بعض جگہ کسی امر کو پہلے سے مسلم مانکر اس کی طرف خفیف سا اشارہ کر دیتے ہیں اور اس سے شعر کا حسن بڑھ جاتا ہے - یہ طرز بیان منطقی نہ سہی - شاعرانہ ضرور ہے - مثلاً

واعظ بتوں کو خلد میں لیجائینگے کہیں — ہے وعدہ کافروں سے عذاب الیم کا

یعنی یہ امر طے شدہ ہے کہ اگر بت بھی کافروں کے ساتھ دوزخ میں رہے تو کافروں کو عذاب کیا راحت ہوگی۔

راز نہاں زبان اغیار تک نہ پہنچا — کیا ایک بھی ہمارا خط یار تک نہ پہنچا

یعنی اگر ہمارا خط اس تک پہونچتا تو وہ اغیار کو ضرور آگاہ کر دیتا۔ یا

شب ہجر میں کیا ہجوم بلا ہے — زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

نہ ربط اس سے نہ یاری آسماں سے — جفا بہر عدو لاؤں کہاں سے

کلام میں کہیں کہیں تشبیہات کی ندرت سے خاص لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ جیسے

چھوٹنا دام شکستہ سے بھی آساں نہیں — میں گرفتار خم گیسوئے صیاد رہا

کیا کیا شکن دیئے ہیں دل زار کو مگر — اُس کے خیال میں ورق انتخاب تھا

از بسکہ ثبت نامہ ہے سوز تپ دروں — قاصد کا ہاتھ ہے ید بیضا کلیم کا

آتش آہ بے اثر سے مری — آسماں گلشن خلیل ہوا

آسمان کو گلشن خلیل سے تشبیہ دینا بالکل نئی بات ہے؟

داغ خوں سے میرے وہ حیراں ہوا

دامن اُلجھا ہے گل بے خار سے

(۴) مکر شاعرانہ۔ ندرت اسلوب کے تحت میں ایک اہم نکتہ قابل گذارش ہے۔ جس کو ہم بغرض سہولت مستقلاً علیحدہ بیان کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ مومن اپنے مطلب کو اس خوبی سے ادا کرتے ہیں کہ مخاطب اس میں اپنا فائدہ تصور کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہنا ہے کہ دشمن کی طرف نہ دیکھو۔ اس کے لئے یہ پیرایہ اختیار کرتے ہیں۔

"ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا — جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں"

ذیل کے شعر میں محبوب کو رقیب کے خط کی تعظیم سے روکتے ہیں۔

سرگیں آنکھوں سے تم نامہ لگاتے کیوں ہو   خاک میں نام کو دشمن کے ملاتے کیوں ہو

مسلمہ اصول ہے کہ عادت کے خلاف ہر بات تکلیف دیتی ہے۔ غور کرو اس سے کیونکر فائدہ اٹھاتے ہیں۔

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں   اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

اسی رنگ کے اور چند شعر ملاحظہ ہوں۔

مت رکھیو گرد تارک عشاق پر قدم   پامال ہو نہ جائے سر افراز دیکھنا
خواہش مرگ ہو اتنا نہ ستا او ورنہ   دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا
درباں کو آنے دینے پہ میرے نہ کیجے قتل   ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہ تھا
لذت جور کشی نے مجھے شرمندہ کیا   طعنے کیا کیا اسے ارباب ستم دیتے ہیں
وہ یہ خواہ تجھ سا تو میرا نہیں   عشق دوستی تم کو دشمن سے ہے
گر ذکر وفا سے بھی غصہ ہے تو اب   گو قتل کا وعدہ ہو تقاضا نہ کریں گے

میں اس وصف کو مکر شاعرانہ سے تعبیر کرتا ہوں اور میرے خیال میں یہ مومن کی ملک خاص ہے در اصل وہی اس رنگ کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔

(۵) معاملہ بندی۔ فارسی میں مرزا شرف جہاں قزوینی معاملہ بندی (واقعہ گوئی) کا مستقل موجد کہا جاتا ہے اگرچہ اس کی بنا سعدی و خسرو کے زمانہ ہی میں پڑ چکی تھی۔ عشق مجازی کی حقیقی واردات کا بیان کرنا اس طرز کا مقصد تھا۔ اس کے مقلد وحشی یزدی، علی قلی میلی، علی نقی کمرہ تھے۔ یہ وحشی وہی ہے جو فارسی میں واسوخت کا بانی بھی تھا اور خاتم بھی۔ حکیم مومن خاں جو مدتوں عشق کی گلیوں کی خاک چھان چکے تھے

۵ شعر العجم۔

ممکن نہ تھا کہ اس طرف مائل نہ ہوتے۔ اُن سے پہلے جرأت نے بھی اس رنگ میں بہت کچھ لکھا تھا مگر "بہ سبب کم علمی کے بہت کھل گئے تھے"[۵۶] اس کے برخلاف مومن نے ہر جگہ دہلی[۵۷] کی متانت کو نباہا ہے اور دائرہ تہذیب میں رہکر جذبات عشق کو ادا کیا ہے۔ اشعار ذیل اس دعوی کی تصدیق کرینگے۔

ہر چند اضطراب میں میں نے کمی کی — تو بھی نہ واں تغافل بسیار کم ہوا

ہر ایک سے اس بزم میں شب پوچھتے تھے نام — تھا لطف جو کوئی مرا ہمنام نکلتا

وصل کی شب شام سے میں سو گیا — جاگنا ہجراں کا بلا ہو گیا

مت پوچھ کہ کس واسطے چپ لگ گئی ظالم — بس کیا کہوں میں کیا ہے کہ جی کچھ نہیں کہتا

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں — سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

چین جبیں کو دیکھ کے دل بستہ تر ہوا — کیسی کشود کار کشاد نقاب میں

محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے — منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

بیوفائی کا عدو کی ہے گلہ — لطف میں بھی وہ ستاتے ہیں مجھے

گلہ ہرزہ گردی کا بیجا نہ تھا کچھ — وہ کیوں مسکرا کے بجا کہتے کہتے

(۶) طنز۔ تغزل کے اجزائے ترکیبی میں ایک چیز طنز و اعتراض بھی ہے جو اُردو شعرا کے یہاں مومن کی برابر شاذ و نادر ہی کہیں نظر آتی ہے۔ طنز (طعنہ دینا) اور تعریض (کنایہ میں بات کہنا) کا مقصد کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کو جلی کٹی سنا کر دل کا بخار نکالا جائے اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ اشتعال دلا کر اپنی مطلب برآری کی جائے۔ کلام میں تعریض سے کام لینا ایک طرف تو شاعر کی ذکاوت حس اور ذہانت طبع کی دلیل ہے دوسری طرف اُس کی قدرت زبان کا ثبوت۔ جہانتک

[۵۶] تذکرہ جلوۂ خضر [۵۷] شعر الہند۔

ہمارا خیال ہے اساتذۂ اُردو میں مومن سے زیادہ طنز کا استعمال کسی نے نہیں کیا۔ ہجو طنز سے پست تر ہے اس لئے اُن کی مشکل پسند اور بلند فطرت نے اس کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ہاں طنز میں اُن کے جوہر دیکھنا ہوں تو اشعار ذیل ملاحظہ ہوں۔ یہ ملحوظ رہے کہ طنز میں کبھی متکلم حقیقت کو مستہزیانہ انداز میں بطریق تشکا دیتا پیش کرتا ہے اور کبھی امر غیر حقیقی کو غیرت دلانے کی نیت سے بطور حقیقت بیان کرتا ہے۔ مثلاً محبوب نے اگر عاشق بیمار کو قتل کر دیا ہے۔ شاعر اس پر یوں چٹکی لیتا ہے۔

غیر عیادت سے برا مانتے ۔۔۔ قتل کیا آن کے اچھا کیا

معشوق نے عاشق پر اتنے ستم کئے کہ اب آسمان کو بھی رحم آنے لگا۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر تم اس قدر ظلم نہ کرتے تو چرخ بے مہر کو ہرگز رحم نہ آتا۔

رحم فلک اور مرے حال پہ ۔۔۔ تو نے کرم اے ستم آرا کیا

اور دیکھئے۔ مٹی نہ دی مزار تلک آ کے اس پہ بھی ۔۔۔ کہتے ہیں لوگ خاک میں اُس نے ملا دیا

فرماتے ہیں وصال ہے انجام کارِ عشق ۔۔۔ کیا ناصح شفیق نے مژدہ سُنا دیا

عمر دراز کی ہے رقیبوں کو آرزو ۔۔۔ دیکھو زمان ہجر کے امیدوار ہیں

سُنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں ۔۔۔ کہ سخت چاہئے دل اپنے رازداں کے لئے

کر علاج جوش وحشت چارہ گر ۔۔۔ لا دے اک جنگل مجھے بازار سے

رشک دشمن بہانہ تھا سچ ہے ۔۔۔ میں نے ہی تم سے بیوفائی کی

کیا پسند آئی اپنی جور کشی ۔۔۔ چرخ کے انتخاب نے مارا

دیکھ مضطر کیوں نہ پھیر دشنہ پھر ۔۔۔ یار ہے وہ کچھ تماشائی نہیں

شب ہجر میں کیا ہجوم بلا ہے ۔۔۔ زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں — لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شبِ فراق
اتنا ہی تو یاں صحبتِ ناصح کا اثر ہے — ہم حال کہے جائینگے سُنئے کہ نہ سُنئے

اس قسم کے تیر و نشتر اُن کے کلام میں بہت ہیں اور ادنیٰ تفحص سے مل سکتے ہیں۔ نوک جھوک کرنے اور جلی کٹی سُنانے کے لئے شعرائے واسوخت کا میدان تلاش کیا ہے۔ فارسی والوں کی طرح اساتذۂ اُردو نے بھی اس رنگ میں بہت کچھ دادِ سخن دی ہے اور طعن و تشنیع کی قوت اپنی مجہود موضوع پر صرف کر دی ہے۔ مومن کیونکر پیچھے رہتے بلکہ سچ پوچھئے تو اُن کے واسوختوں نے اصلاً واسوخت کے منشائے ایجاد کو پورا کر دیا۔ واسوخت تو درکنار۔ اُن کی بعض غزلوں پر بھی واسوخت کا گمان ہوتا ہے مثلاً وہ غزلیں جنکے مطلع حسبِ ذیل ہیں:

جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم — اب اور سے لو لگائیں گے ہم
وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کرینگے — توبہ ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کرینگے

(ط) علمیت۔ حکیم صاحب کی مستجمع الصفات ذات متعدد علوم و فنون کی سرمایہ دار تھی۔ اس لئے کلام میں علمی اصطلاحات کا بلا قصد آ جانا ناگزیر تھا۔ قصائد میں تو اس سے چارہ نہیں۔ اُن کی غزلیات میں بھی کہیں کہیں یہ رنگ جھلکتا ہے۔ مگر خوبی یہ ہے کہ تغزل کی شان بدستور قائم رہتی ہے اور ان علمی مسائل کی حیثیت محض ثانوی رہجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ علمی تبحر کے زور سے خشک فلسفہ یا سادہ اخلاق پر قلم نہیں اُٹھاتے۔ رہی تصوف کی مے سرجوش۔ اُس کے تو قریب جانا بھی وہ اعتقاداً برا جانتے ہیں۔ علمیت کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

اشک جانبِ کرۂ آب کی مائل نہ ہوا — آتشِ سینۂ تفسیدہ کو کیا میں رؤوں
رجعتِ قہقری شمس و قمر آخر شب — صبحدم آنے کو تھا وہ کہ گواہی دے ہے

دشمن سگِ کوچہ ہو اس شوخ آہو چشم کا — نادم ہوں لقب گرگ آیا نام پر اپنا جھکر

اتنی بھی تاب دوری خورشید طلعتاں — نقصان کیا کمال سے آیا ہے ماہ میں

اپنے سودے کی نہ پوچھو کہ خریدار کے ساتھ — جنس میں تو ہے دل اور بیع سلم کرتے ہیں

قران انجم سیارہ برج آبی میں — ڈبوئیگی مری چشم ستارہ بار مجھے

کیوں نہ مجھ سے رم وہ مہوش اب زیادہ تر کرے — بدگماں ہے سبعہ سیارہ کی تسخیر سے

(۸) **مذہبیت** - مومن خاں کی مذہبیت کا ذکر اُن کی سیرت میں گزر چکا ہے۔ وہ موحد اور عامل بالحدیث تھے اور بیعت کے بعد تو اُن کا ہر لمحہ مذہبی چرچوں میں گزرتا تھا۔ غزل میں بظاہر صلابت دین و عصبیت مذہب کے اظہار کا کوئی موقع نہ تھا۔ تاہم وہ کہیں نہیں چوکتے۔ ملاحظہ ہو۔

خیالِ خواب راحت ہے علاج اس بدگمانی کا — وہ کافر گور میں مومن مرا شانہ ہلاتا ہے

ہم اور یہ بدعت تپشِ دل کے سبب ہے — مومن مرے سینے پہ رہے بعد فنا ہاتھ

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں — مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

ہے کفر و بدعت ایک نہیں تار سبحہ سے — زنار مومن آسرے ہے کیوں برہمن کی

مومن حسد سے کرتے ہیں ساماں جہاد کا — ترسا صنم کو دیکھ کے ذمیوں میں ہم

ہم بندگی بت سے ہوتے نہ کبھی کافر — ہر جائے اگر مومن موجود خدا ہوتا

بعض اشعار میں آیات و احادیث کی طرف تلمیحات بھی پائی جاتی ہیں جن میں سے اکثر بعید الفہم ہیں جیسے۔

ساتھ نہ چلنے کا بہانہ تو دیکھ — آ کے مری نعش پہ وہ رو گیا

حدیث شریف میں نوحہ کرنیوالوں کو مشایعت جنازہ سے منع کرنے کی تاکید ہے۔

جلتا ہوں اہل نار کی تبدیل جلد سے — مومن غضب ہے آتش لذت فزا داغ

اس میں آیۂ کریمہ "بدلنا ہم جلوداً غیرہا" کی طرف اشارہ ہے۔

واعظ بتوں کو خلد میں لیجائینگے کہیں ہے وعدہ کافروں سے عذاب الیم کا

قرآن پاک میں ہے کہ انسان اور بُت دوزخ کا ایندھن ہونگے۔ جب تک یہ آیت ذہن میں نہ ہو مطلب صاف نہیں ہوتا۔

(۹) تراکیب جدیدہ۔ دہلی کے دوسرے اساتذہ کی طرح مومن فارسی کے استاد تھے۔ اسی فارسیت کا نتیجہ ہے کہ اُن کے اُردو کلام میں فارسی کی دلپذیر ترکیبیں اور دلنشین بندشیں قدم قدم پر نظر آتی ہیں۔ جو انگوٹھی پر نگینے کا حکم رکھتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض تراکیب بقول آزاد اُردو کی سلاست میں اشکال پیدا کر دیتی ہیں تاہم مجموعی طور پر یہ ترکیبیں نہایت دلکش اور مفید ہیں۔ بلکہ انصاف یہ ہے کہ اکثر غالب کی بندشوں سے شوخ تر ہیں۔ اُن کی مجتہدانہ اختراعوں میں ذیل کی تراکیب خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنھیں توسیع زبان کی طرف ایک مبارک اقدام سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان تراکیب میں لطافت کے علاوہ ایک وصف یہ ہے کہ بڑا خیال عموماً دو لفظوں میں ادا ہو جاتا ہے۔

مثلاً خموشی اثر۔ اجل چارہ۔ آشوب گاہ حشر غم۔ جراحت زار۔ رنج کدہ کش۔ زبان بیہدہ سائل۔ رقیب آفرینی۔ اشک واژونہ اثر۔ بیگانہ آشنا۔ چشم ستارہ بار۔ گوشۂ رخ طراز۔ آہوئے نیمخواب۔ نالہ رخنہ ساز۔ رام نزاکت۔ نالہ ہائے غبار۔ سبکروح تجرد۔ شوق سیہ کار زلف۔ تیرہ روز چشم جادو۔ پامال سر۔ زہر نوش غم شیریں۔ تلخکام عشق شیریں لب۔ جان غم مانوس وغیرہ وغیرہ۔

(۱۰) مقطع۔ مومن مقطع میں ہمیشہ اپنے تخلص سے فائدہ لیتے ہیں اور

خاص لطف پیدا کر دیتے ہیں چند مثالیں اوپر مذکور ہوئیں۔ کچھ شعر اور سنئے

دشمن مومن ہی رہے بت سدا — مجھ سے مرے نام نے یہ کیا کیا

ہجر بتاں میں تجھکو ہے مومن تلاش زہر — غم پر حرام خوار تو کل نہ ہو سکا

ترکِ صنم بھی کم نہیں سوزِ جحیم سے — مومن غمِ مآل کا آغاز دیکھنا

جنت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بتوں سے — جورِ اجلِ تفرقہ پرواز تو دیکھو

ج۔ تصویر کا دوسرا رُخ

ساقی مئے ناب دارد اما — درخورد خمار ما ندارد

اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ مومن کا کلام کیف و لطافت میں جواب نہیں رکھتا تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ہمارے موجودہ زمانے کے معیار کی رو سے انہیں کہیں کہیں بعض خامیاں بھی نظر آتی ہیں۔ ایک ناقد کا تلخ فرض یہ ہے کہ تصویر کے روشن رخ کی طرح اُس کے تاریک رُخ کو بھی منظر عام پر لائے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کلام مومن کے نقائص پر بھی مختصر بحث کی جائے۔ اصل یہ ہے کہ عرفی کی طرح مومن کی اُٹھان بھی خوب ہوئی۔ مگر افسوس کہ ترقی کا موقع نہ ملا۔ اگر اُن کی عمر وفا کرتی اور اُن کی مجتہدانہ ایجاد پسندی اور لااُبالیانہ وارستہ مزاجی اتنی مہلت دیتی تو اس میں شک نہیں کہ اُردو شاعری میں اُن کا جواب نہ ہوتا۔ انھوں نے شاعری کو پیشہ کی حیثیت سے کبھی اختیار نہیں کیا۔ البتہ تفریح کی نیت سے پسند کیا اور اپنے دوسرے مشاغل کی طرح سامان دل بستگی سمجھا۔ یہی سبب تھا کہ اُن کے کلام میں چند نقائص رہ گئے۔ یہاں اپنی ذاتی رائے عرض کرنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے

باخبر اور بالغ نظر دوست اسبطین احمد صاحب بی۔اے۔ بدایونی کے خیالات مومن کی نسبت بیان کر دیئے جائیں۔ موصوف شدت سے مومن کے منکر اور غالب کے معتقد واقع ہوئے ہیں۔ انھوں نے کلام مومن کے مطالعہ کے بعد جو فرد جرم مومن پر لگائی ہے حسب ذیل ہے۔

(۱) مومن کے یہاں تصنع آمیز پیچیدگی اور دقت نظر ہے۔ علو تخیل اور بلندی فکر نہیں۔

(۲) اُن کا میدان محدود ہے۔ وہ مناظر و مظاہر عالم سے غیر متاثر نظر آتے ہیں اور معشوق، خود اور رقیب کے سوا سب سے بے تعلق۔

(۳) اُن کا عشق پست اور بے لگام شہوانیت کا مظاہرہ ہے جس میں پردہ۔ چلون۔ روزن اور دوپٹہ کے سوا اور کسی کی گنجایش نہیں۔

(۴) زبان میں خامیاں ہیں اور متروکات کا جو اُسی زمانہ میں ترک ہو رہے تھے استعمال زیادہ ہے۔ مثلاً افغاں (فغاں)۔ جاسے (جا) کبھو (کبھی) مُوا (مَرا) ہو (ہوکر)۔ اظہار نون مضاف الیہ وغیرہ۔

(۵) تعقیدات سے شعر اکثر معما بنکر رہ جاتا ہے

(۶) رعایات و صنائع کی بھرمار سے کلام میں بے لطفی آگئی ہے۔

(۷) مترادفات اکثر بے ضرورت استعمال کئے ہیں اور انتخاب الفاظ اچھا نہیں

اگرچہ راقم کے خیال میں ان میں سے کئی اعتراضات صحیح ہیں۔ تاہم انصاف کے معنی یہ ہیں کہ کسی شاعر یا ادیب کو اُسی کے زمانہ کے مسلّمہ معیار سے جانچا جائے متانت و ثقاہت کا معیار ہمارے زمانہ میں بلند سہی لیکن مومن کے زمانہ میں عام طور پر اس قدر تشدد نہ تھا۔ یہی حال زبان کا ہے۔ اُن کے جو الفاظ و محاورا

آج ہمارے مذاق سماعت پر گراں گذر رہے ہیں۔ دوسرے اساتذہ مثلاً غالب و ذوق وغیرہ کے یہاں بے تکلف پائے جاتے ہیں۔ اس مختصر سی تمہید کے بعد ہم ہر اعتراض کو فرداً فرداً لیتے ہیں۔ اولاً یہ بالکل صحیح ہے کہ(۱) مومن نے اپنی ندرت پسندی اور روش عام سے علحدگی کی بناپر اپنی راہ دنیا سے الگ نکالی نتیجہ یہ ہوا کہ خیالات کی پرواز اور اسلوب بیان کی جدت میں غالب جیسا باکمال بھی اُن سے پیچھے رہ گیا۔ یہی نازک خیالی جب حد اعتدال سے بڑھ جاتی ہے تو شعر چیستاں بنکر رہجاتا ہے۔ اس اغلاق و تکلف کی چند صورتیں ہیں کہیں وہ مسلمات عام سے انحراف کرتے ہیں۔ اسی لئے خیال بعید از فہم ہوجاتا ہے۔ مثلاً

اُن سے پری وش کو نہ دیکھے کوئی　　مجھکو میری شرم نے رسوا کیا
جَور کا شکوہ نہ کروں ظلم ہے　　راز مرا صبر نے افشا کیا
ہرچند اضطراب میں میں نے کمی کی　　تو بھی نہ واں تغافلِ بسیار کم ہوا

یا کہیں محتمل الوجوہ اشعار سے کلام کی وقعت بڑھا دیتے ہیں۔ جیسے۔

نقدِ جاں تھا نہ سزائے دیتِ عاشق حیف　　خونِ فرہاد سرِ گردنِ فرہاد رہا
گر پاس ہے لوگوں کا تو آجا کہ قلق سے　　ہے لاش کہیں اور کہیں دفن ہے ہمارا

یا کسی غیر مشہور واقعہ یا نص یا تجربہ یا رسم پر شعر کی بنیاد رکھتے ہیں۔ مثلاً

تیشہ کچھ دشنۂ شیریں نہیں اے غیرت　　اپنے ہی خوں سے مگر دامنِ فرہاد بھرے
جلتا ہوں اہل نار کی تبدیلِ جلد سے　　مومن غضب ہے آتش لذت فزائے داغ
خیالِ خواب راحت ہے علاج اس بدگمانی کا　　وہ کافر گور میں مومن مرا شانہ ہلاتا ہے
گر نگاہِ ناز کو مشقِ ستم منظور ہے　　دشمن اپنی نرگسِ تربت قلم کیونکر کریں

یا مضمون کی درمیانی کڑیاں حذف کردیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ سامع بھی اس

خلا کو پر کرے گا۔ وسیع خیال کو یوں مختصر عبارت میں ادا کرنے سے شعر دقیق ہو جاتا ہے۔

یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا　　میں الزام اُن کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا
عدو اس اوج پر شاکی ہے شاید غصہ آجاوے　　ملا دے خاک میں یہ تو کبھی شکر آسماں کیجے

یا ضمائر کے فقدان یا ابہام سے شعر کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر بنا دیتے ہیں۔

کیا شاد شاد ہوں کہ وہ ہے تلخ کام تر　　میری جو شور شوں نے عدو کو مزا دیا
شب وصل اُسکے تغافل کی نہیں تاب نہیں　　تلخی مرگ ہے آنکھوں میں شکر خواب نہیں

مثالیں بالقصد غزلیات سے لی گئی ہیں۔ ورنہ اُن کے تمام کلام کا یہی حال ہے چونکہ اس ایڈیشن میں غزلیات کی شرح موجود ہے اس لئے مثالوں کی تشریح غیر ضروری سمجھی گئی۔ رہا علو تخئیل۔ اگر اس سے مراد حقائق فلسفہ و تصوف کا بیان ہے۔ تو درحقیقت کلام مومن اس سے خالی ہے۔

ثانیاً یہ درست ہے کہ اُنھوں نے غزل کو "حکایت با معشوق" کے دائرہ میں محدود رکھا۔ مگر یہ کوئی عیب نہیں۔ تفصیل تغزل کے بیان میں اوپر آپ پڑھ آئے ہیں۔

ثالثاً ابتذال کے داغ سے اُن کا دامن عموماً پاک ہے۔ مزید بحث موازنہ جرأت و مومن میں آئے گی۔

رابعاً اُن کی زبان میں چند خامیاں ضرور ہیں مگر دوسرے ہم عصر اساتذہ سے زیادہ نہیں۔ مثلاً چند شعر غالب کے ملاحظہ ہوں۔

تاک کے جی میں کیوں رہے ارمان　　آئے یہ گوے اور یہ میداں (بجائے گو)
کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے　　یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی (کسی)

عارضِ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ — جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے (دیکھ کر)

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں — فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے (اختفائے نون غنہ)

ذوقؔ کی زبان دونوں سے زیادہ صاف و شستہ ہے۔ مگر اُن کا کلام بھی ایسے اسقام سے پاک نہیں۔ مثلاً

فلک کا رنگ جو اب تک سیاہ ہے اُپر — پڑا تھا سایۂ بختِ سیہ کبھو میرا (کبھی)

سر بوقتِ ذبح میرا اُس کے زیرِ پا ہے — یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جا ہے (پا۔ جا)

تھا تو بہا میں بیش پر اُس لب کے سامنے — سب مول تیرا لعلِ بدخشاں ہی گیا (اختفائے نون غنہ)

لغزشوں کا استقصا مقصود نہیں۔ جو مثالیں یاد آئیں نقل کر دی گئیں۔ درحقیقت مومنؔ اپنی وارستہ مزاجی سے صحتِ زبان اور صفائی بندش کی پروا نہیں کرتے تاہم چھوٹی بحروں میں اکثر اُن کی زبان اس قدر پاکیزہ اور سلیس ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ خاصکر اُن کے کلام میں تعقید زیادہ ہے۔ جس سے ناہمواری اور اشکال پیدا ہو گیا ہے۔ اس باب میں وہ یقیناً بے احتیاط اور غالبؔ سے بھی زیادہ بدنام ہیں۔

غریقِ گریۂ خونیں رہا ہے کر مومنؔ — لباس یعنی پہنتے نہیں مسلماں سرخ

ہے کفر و بدعت ایک نہیں تار سبحے — زنار مومنؔ آئے ہے کیوں برہمن کی یاد

محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے — منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

میں احوالِ دل مر گیا کہتے کہتے — تھکے تم نہ بس بس سنا کہتے کہتے

اُن کی عادت ہے کہ جملے کا ایک ٹکڑا ایک مصرع میں اور دوسرا ٹکڑا دوسرے میں لاتے ہیں۔

بے حجابی کا گلہ کیجے تو کہتا ہے ترے — پردۂ چشم کی تقصیر کہ حائل نہ ہوا

غم خانہ تنگ و تار ہے اور ہم سیاہ روز — جلتے ہیں یعنی چاہیئے آٹھوں پہر چراغ

سادساً یہ اعتراض کہ اُن کے یہاں صنائع کی بھرمار ہے نادرست ہے۔ صنائع کا استعمال اہل لکھنؤ کے یہاں سکہ رائج کی طرح ہے۔ دہلی کے اساتذہ عموماً ان تکلفات سے پرہیز کرتے ہیں۔ مومن کے ابتدائی کلام میں جہاں ناسخ کا تتبع پایا جاتا ہے۔ رعایات ضرور ہیں۔ مگر یہ اُن کا عام رنگ نہیں۔ ایک زمانہ میں رعایات کو سرمایہ آرائش کلام سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب ارباب ذوق صحیح ان باتوں کو معیوب جانتے ہیں۔ اس بارے میں ہمارا خیال یہ ہے کہ رعایت اگر بے ساختہ ہو تو معیوب نہیں بلکہ محمود ہے۔ رہا رعایت کی نوعیت کا فیصلہ یہ مذاق سلیم کے ذمہ ہے۔

سابعاً چند شعروں میں کسی عیب یا حُسن کو دیکھکر کلام کے عام رنگ پر رائے قائم کرنا صحیح نہیں۔ استعمال مترادفات و انتخاب الفاظ کی بابتہ جو فیصلہ قائم کیا گیا ہے اسی قبیل سے ہے۔ جو الفاظ مثالاً دیئے گئے ہیں مثلاً کھسکنا آنکھ دکھانا۔ جی سنسنانا۔ ٹھیک بتانا چنداں معیوب نہیں جبکہ اور ہمعصر اساتذہ کے یہاں بھی یہی حال ہے۔

و۔ معاصرین سے موازنہ

قمریاں پاس غلط کردۂ خودمی دارند ورنہ یک سرو دریں باغ بہ بالائے تو نیست

تنقید نگاروں کا طریقہ ہے کہ جب کسی شاعر پر تنقید کرتے ہیں تو اس کے اور اُسکے ہمعصروں کے کمتر ہم مضمون اشعار اور بیشتر ہم قافیہ اشعار نقل کرتے ہیں اور اس کے بعد محاکمہ کرتے ہیں جس کا فیصلہ عموماً اُن کے ہیرو ہی کے حق میں ہوتا ہے ہمارے خیال میں یہ طریقہ اَن سائنٹفک بھی ہے اور نادرست بھی۔ ہم مضمون اشعار میں تو رائے قائم کرنا ایک حد تک ممکن بھی ہے گو وہ انھیں اشعار تک محدود

ہو سکتی ہے۔ ہم طرح غزلوں اور ہم قافیہ شعروں میں جو شے مشترک ہے وہ محض بحر یا قافیہ ہے۔ اس لئے وجہ ترجیح قائم کرنا اور زیادہ مشکل اور عمل محاکمہ بالکل ہی سطحی ہوتا ہے۔ یہ مشکل اُس وقت اور بھی کھلتی ہے جبکہ وہ اساتذہ جنکے اشعار زیر موازنہ ہیں قطعی جداگانہ طرز کے مالک ہوں۔

یہ ممکن ہے کہ دس بارہ شعر میں فرداً فرداً مومن اپنے معاصروں سے یا اُن کے معاصر اُن سے اظہار خیال و انداز بیان میں قادر تر ثابت ہوں لیکن کیا وہ فیصلہ اُنکے مجموعی طرز اور باقی کلام کو دیکھتے ہوئے بھی صادق اور صحیح ٹھہرے گا۔ ہرگز نہیں اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض غزلیات جن میں مومن۔ ذوق و غالب تینوں کے ہم طرح اشعار ملتے ہیں نقل کی جائیں اور ہم قافیہ اشعار کا موازنہ کرکے کسی ایک کے حق میں منفرداً فیصلہ کیا جائے مگر اس سے بڑھکر سطحی اور محدود طریقۂ تنقید اور کیا ہوگا۔ سب پر مستزاد یہ کہ ان تینوں باکمال اساتذہ فن میں ہر ایک کی طرز جدا۔ اسلوب جدا۔ ماحول جُدا۔ ذہنیت جدا۔ اُفتادِ مزاج جدا۔ وللناس فی ما یعشقون مذاہب، مومن کے معاصر اساتذہ میں یوں تو آزردہ۔ احسان۔ ممنون وغیرہ کئی خوشگوار باب فن ہیں مگر جو مقبولیت و شہرت ذوق و غالب کو نصیب ہوئی کسی کو نہیں ہوئی لیکن جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا۔ ہر ایک کا انداز الگ ہے اس لئے صحیح موازنہ ناممکن ہے۔ ہمارے نزدیک اگر کوئی شخص ان تینوں نامور اساتذہ کے بارے میں درحقیقت کسی صحیح فیصلہ پر پہونچنے کا خواہشمند ہے تو اُس کے لئے ضروری ہے کہ اُن کی کلیات کا بالاستیعاب مطالعہ کرے اور ہر ایک کے انداز سے اپنی طبیعت کو مانوس کرے۔ اسکے بعد یہ ممکن ہوگا کہ وہ کسی صحیح نتیجہ پر پہونچ جائے۔ اگرچہ طرزوں کے تباین کی بنا پر کوئی وجہ ترجیح تلاش کرنا جب بھی بے سود ہوگا

اس طریقہ پر تینوں کے کلیات کا مطالعہ کرنے کے بعد راقم جس نتیجہ پر پہونچا ہے وہ یہ ہے کہ اُردو شاعری کی کائنات کے یہ موالید ثلثہ اپنے اپنے رنگ میں بے نظیر ہیں اور اصلاً قدر مشترک ان میں بہت کم ہے۔ تاہم اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ مومن مثنوی[1] کے بادشاہ ہیں اور ذوق قصیدے کے۔ رہی غزل اس میں تینوں کا رنگ جداگانہ اور اپنی جگہ بے مثل ہے۔ غزل میں نازک خیالی۔ معاملہ بندی اور سوز و گداز میں مومن اپنے تمام معاصرین سے فائق ہیں۔ اسی طرح صفائیٔ زبان اور محاورہ بندی میں ذوق اور فلسفہ[2] و تصوّف کے بیان میں غالب سب ہم عصروں سے برتر ہیں۔

یہاں محض بغرض "تفنن" ذوق و غالب و مومن کی ایک ہم طرح غزل کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔ موازنہ یا محاکمہ منظور نہیں۔

ذوق

نہیں ثبات بلندیِ عز و شاں کے لئے ۔۔۔ کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لئے

نگاہِ ناز نے کی دیر ورنہ میں تیار ۔۔۔ ہوں کب سے بیٹھا ہوا مرگِ ناگہاں کے لئے

حجر کے چومنے ہی پر ہے حج کعبہ اگر ۔۔۔ تو بوسے ہم نے بھی اُس سنگِ آستاں کے لئے

نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شے ۔۔۔ عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لئے

بنایا آدمی کو ذوقؔ ایک جزوِ ضعیف ۔۔۔ اور اُس ضعیف سے کُل کام دو جہاں کے لئے

غالب

نوید امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے ۔۔۔ رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

[1] ذوق و غالب کے یہاں مثنوی کا وجود نہ ہونے کی برابر ہے۔ غزل و قصیدہ کے علاوہ اور اصناف بھی ان دونوں کے کلام میں زیادہ نہیں اور جو ہیں اُن میں کوئی خاص نُدرت نہیں۔ [2] غالب کے مقابلہ میں بعض اہل قلم امتثالاً جناب عجز بسوانی نے کھینچ تان کر فلسفہ و تصوّف کے مضامین مومنؔ کے یہاں تلاش کئے ہیں مگر یہ سعی مشکور نہیں معلوم ہوتی۔

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے — رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونفشاں کے لئے

فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں — درازدستیِ قاتل کے امتحاں کے لئے

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک — بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لئے

ادا سے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا — صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

مومن

دعا بلا تھی شبِ غم سکونِ جاں کے لئے — سخن بہانہ ہوا مرگِ ناگہاں کے لئے

خلافِ وعدۂ فردا کی ہم کو تاب کہاں — امید یک شبہ ہے یاسِ جاوداں کے لئے

سنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں — کہ سخت چاہئے دل اپنے رازداں کے لئے

حجابِ چرخ بلا ہے ہوا کرے بیتاب — فغاں اثر کے لئے اور اثر فغاں کے لئے

رواں فزائیِ سحرِ حلال مومن سے — رہا نہ معجزہ باقی لبِ بتاں کے لئے

ان تمام باتوں کے باوجود اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ اوصاف جو نفسِ تغزل کے لئے ضروری ہیں مومن کے برابر کسی کے کلام میں نہیں ملتے ذوق کا تو انداز بالکل ہی جدا ہے۔ غالب کے یہاں نازک خیالی کی صفت ضرور ایسی ہے جس میں وہ مومن کے شریک ہیں لیکن شریکِ غالب نہیں۔ اس کے علاوہ اکثر ایک ہی بات کو دونوں ادا کرتے ہیں مگر مومن غزلیت کی رنگینی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور غالب کے یہاں وہی مضمون خشک فلسفہ بنکر رہ جاتا ہے۔ مثلاً

غالب۔ قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مومن۔ چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی — ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

غالب۔ خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ — کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

مومن۔ مانگا کرینگے اب سے دعا ہجر یار کی ۔۔۔ آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

غالب۔ بیگانگی خلق سے بیدل نہ ہو غالب ۔۔۔ کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

مومن۔ مومن نہ سہی بوسہ پا سجدہ کرینگے ۔۔۔ وہ بُت ہے جو اوروں کا تو اپنا بھی خدا ہے

شعر کا حُسن و قبح ایک وجدانی شئے ہے اور امور وجدانی میں دو رائیں ہونا تعجب نہیں۔ اس لئے مومن و غالب کے کلام و طرز کی نسبت ناقدین میں اختلاف رائے ہوسکتا ہے۔ البتہ اس سے ہرگز اختلاف نہیں ہوسکتا کہ جامعیت علوم و فنون۔ قدرت نثر و نظم فارسی، ہمہ گیری اصناف شعر۔ جوش مذہب۔ مدح میں خودداری۔ غزل میں طرز خاص کے لحاظ اوصاف مجموعی طور پر مومن کے سوا اردو کے کسی اُستاد کے یہاں نظر نہیں آتے۔

۵۔ جرأت و مومن

خوش بود گر محک تجربہ آید بمیان ۔۔۔ تا سیہ روی شود ہر کہ در او غش باشد

جرأت و مومن میں صرف ایک وصف ہے جو باہم مشترک نظر آتا ہے۔ یعنی معاملہ بندی۔ اسی لئے دونوں میں موازنہ کرنے کی ہمیں جرأت ہوئی۔ مگر موازنہ میں ہم اپنی ناچیز رائے بیان کرنے کے بجائے صفیر بلگرامی کی قابل قدر فیصلے کے نقل کرنے پر اکتفا کرینگے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"جُرأت اس رنگ کے موجد تھے۔ مگر بسبب کم علمی کے بہت کُھل گئے تھے مومن خاں کے علم نے ان واقعات کو مشکل بندش اور نرالی ترکیبوں سے ایسے پردے میں رکھا کہ اداشناس ہی اُسکے مزے کو جانتا ہے" (جلوۂ خضر) اس دعوے کے اثبات کیلئے دونوں کے چند شعر لکھے جاتے ہیں۔

جرأت

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا ۔۔۔ چمپئی رنگ اُس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا

بات ہی اول تو وہ کرتا نہیں مجھ سے کبھی　　اور جو بولے ہے کچھ مُنہ سے تو شرمایا ہوا
بے سبب جو مجھ سے ہے وہ شعلہ خو سرگرم جنگ　　مَیں تو ہوں حیراں کہ یہ کس کا ہے بھڑکایا ہوا
جاؤں جاؤں کیا لگایا ہے اجی بیٹھے رہو　　ہوں مَیں اپنی زیست آگے ہی سے اُکتایا ہوا
حکم بار مجلس اب جرات کو بھی ہو جائے جی　　یہ بچارہ کب سے دروازے پہ ہے آیا ہوا

مومن

کیا قہر طعن بوالہوس بے ادب ہوا　　جرم رقیب قتل کا میرے سبب ہوا
بوسے دم غضب لئے اُلٹی سمجھ تو دیکھ　　بل جو پڑا جبیں پہ تمنّا کو لب ہوا
کس دن تھی اُسکے دل میں محبت جواب نہیں　　سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا
جی طعن وصل حور سے کیسا جلا دیا　　روزِ جزا کا ذکر جو محفل میں شب ہوا
ربطِ بتان دشمنِ دیں اہتمام ہے　　ایسا گناہ حضرتِ مومن سے کب ہوا

ان اشعار ہی پر موقوف نہیں۔ تمام کلام کا یہی حال ہے۔

و۔ فارسی کلام مومن

اینکہ می گویند آں بہتر زحسن　　یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

دہلی کے اکثر اساتذہ اُردو کی طرح فارسی میں بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ غالب۔ رخشاں۔ حسرتی۔ آزردہ کے کمالات کو کون نہیں جانتا۔ مومن کی جامعیت دیکھیے کہ اُنھوں نے فارسی[1] کی طرف توجہ کی تو اُس میں بھی وہ رتبہ پایا کہ غالب سا بلند پایہ ادیب بھی اعتراف کرنے پر مجبور ہوا۔

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود　　باد در خلوتِ شاں مشک فشاں از دمِ شاں

---

[1] فارسی کلام مومن پر مفصل تبصرہ اسی عنوان سے عرصہ ہوا تو راقم نے الناظر (لکھنؤ) میں شائع کرایا تھا۔

مومن و نیر و صہبائی و علوی آبگاہ حسرتی اشرف و آرزدہ بود اعظم شاں
غالبِ سوختہ جاں گرچہ نیرزد بشمار ہست در بزم سخن ہم نفس و ہمدم شاں

مومن کا مجموعہ فارسی نثر و نظم دونوں پر مشتمل ہے اور ۱۲۷۱ھ میں اُن کے عزیز حکیم محمد احسن اللہ خاں کے اہتمام سے مطبع سلطانی واقع قلعہ دہلی میں طبع ہوا ہے

انشائے مومن۔ کلام نثر چند خطوط و مکتوبات اور تقاریظ و خطبات کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً خود یا دوسروں کی فرمایش سے لکھے گئے ہیں اسطرح کُل مجموعہ تین قسم کی تحریروں پر مشتمل ہے (۱) وہ خطوط جو اُنھوں نے خود کسی دوست یا عزیز کو لکھے ہیں اور جو اُن کی طرزِ تحریر کا صحیح نمونہ ہیں (۲) وہ خطوط جو مُخاطب کی "نافہمی" پر نظر کرتے ہوئے معمولی انداز میں لکھے ہیں یا کسی کی فرمایش سے تحریر کئے ہیں (۳) تقریظیں۔ خطبے اور دیباچے نثر کا انداز اُس زمانہ کی عام فارسی نثر سے ملتا ہوا ہے۔ ہر ہر قدم پر مقفّیٰ فقرات۔ صنائع و رعایات تحریر کی رنگینی۔ تشبیہات واستعارات کی فراوانی۔ مبالغہ کی کثرت مضمون کی کمی اور عبارت کی طوالت نمایاں نظر آتی ہے۔ کہیں کہیں آیات قرآنی کی تضمین یا اصطلاحات علمیہ کا استعمال اس خوبی سے کیا ہے کہ اُن کے تبحر علمی کی داد دئے بغیر نہیں رہا جاتا۔ اس کے ساتھ ہی اُن کی تصانیف ہر ہر قدم پر اُن کی طرزِ زندگی اور اُفتادِ مزاج کی پردہ دری کرتی ہیں۔ وہی عاشقانہ چھیڑ چھاڑ۔ وہی شاعرانہ تعلّی و خودستائی جو نظم میں ہے نثر میں بھی موجود ہے بندشوں کی ندرت اور زبان پر قدرت کے ساتھ کہیں کہیں اپنی تعریف میں اظہار جوش اور اربابِ زمانہ کی قدر ناشناسی پر تأسّف اس خوبی سے کیا ہے کہ بے ساختہ دل سے داد نکلتی ہے۔ ذیل کے فقروں سے اُن کے رنگ کا

شاید کچھ اندازہ ہو۔ "از قدر ناشناسی و سخن نافہمی ہیچکسم خریدار نیست و جواہر زواہرم را بہ شبرنگی نیز رونق بازارے گرد کساد آنقدر نشستہ کہ طوفان نوح از متاع تختہ بندم نتواند بردن و زنگار ناروائی آں چناں نہ بستہ کہ غبار صرصر عاد آئینہ ام را بجلا خواہد آوردن۔ یوسفم را بہ کلاوہ پیرزال نمی خرند و از چاہ کنعانی بسیم قلب ہم نمی برند۔ با اعجاز ید بیضا تہی دستم و با دم عیسوی آزار پرست۔"

دیوان مومن (فارسی)۔ کلام نظم فارسی ۱۱ قصائد۔ متعدد غزلیات۔ قطعات تواریخ۔ رباعیات اور ایک مختصر مثنوی پر متضمن ہے۔ مومن کی غیرت نے کبھی اہل دنیا کی مدح کرنی گوارا نہ کی۔ چنانچہ فارسی قصائد میں بھی چار نعت شریف میں اور دو اپنے مرشد (امام) سید احمد صاحب رائے بریلوی کی منقبت میں لکھے ہیں قصائد کو پڑھکر پہلی نظر میں جو امر متبادر ہوتا ہے وہ ان کا حسن عقیدت اور جوش مذہبیت جو اُن کے مذہبی ماحول کا نتیجہ ہے۔ دوسری چیز اُن کا جذبہ ملی ہے جو ایک ایک قدم پر نمایاں ہے۔ سب پر مستزاد وہ استغنائے طبعی ہے جس نے اُن کی انفرادیت میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ یہ تو قصائد کا اخلاقی پہلو تھا۔ ادبی نقطۂ نظر سے دیکھیے تو بھی تشبیب میں مضامین عشقیہ کی افراط۔ ناز ناہلی و شکایت روزگار کا جوش۔ زور بیان اصطلاحات علمیہ۔ تراکیب جدیدہ ان سب امور کو دیکھتے ہوئے ہم بآسانی کہہ سکتے ہیں کہ غالب کے فارسی قصائد کے بعد ہی ان کا نمبر ہے۔

غزلیات فارسی کا وہی انداز ہے جو اردو غزل کا۔ نازک خیالی اور بدیع الاسلوبی واردات عشق کا بیان اور طرز ادا کی لطافت اس قدر ہے کہ اُن کی غزل تغزل کی پوری ترجمان کہی جا سکتی ہے۔ رہے فلسفہ و تصوف۔ اُن کو کوئی غزل کی حدود میں شامل جانے یا نہ جانے مومن حدود غزل سے خارج مانتے ہیں۔ یہاں قارئین کرام

کی ضیافت طبع کی خاطر چند شعر منتخب کئے جاتے ہیں۔

خواہم از درد فراقِ تو بہ فردا نہ رسم | خوش کنم خاطر از وعدہ پشیمان ترا
آرد زماں زماں بہ درت درد انتظار | صد وعدہ نہ کردہ وفا می کنیم ما
ناصح کہ چاک خرقۂ من بخیہ می زند | یارب نہ بیند آں صنمِ جامہ زیب را
رحمے چہ می کنی بہ گمانِ جنونِ شوق | پیراہنِ رقیب قبا کردہ ایم ما
بیکسی بنگر کہ بر تابوت من | چشم گریا نست خاص و عام را
محتسب را ملکی خوے تو شستم مومن | کاش دریا بد و نا ید سوے میخانہ ما
باز گر دید ز کوے تو بحالے قاصد | کہ غلط کردہ بہ پرسش رہ غم خانہ ما
روزِ جزا از قتل من انکار می کند | گو یا کہ طرز خندۂ او ہم گواہ نیست
مرا کہ بندہ نوازی ہم از صنم دیدم | چہ بیم روز جزا کار با خداوند ست
دلم ربودی و دانم چہ مشکل افتادست | مرا معاملہ عمرے بہ ایں دل افتادست
مومن آہنگ حرم کرد ز بیداد بتاں | بس بجاں آمدہ شاید دو سہ منزل برود
مُردم و مشکلش آساں کردم | رحم بر بازوے جاناں کردم
ایں قدر فتنہ ہا بکار مبر | مایۂ آسماں تباہ مکن
گر باچنیں کسے سر و کار ست فتنہ ترا | ناصح بمرگ من کہ چہ تدبیر میکنی

قطعات و رباعیات وغیرہ بھی اپنے رنگ میں خوب ہیں۔ اور اُن کی پختہ مشقی کا ثبوت۔ غرض یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ شاعری کے داخلی پہلو اور نفس تغزل کے اعتبار سے ایک بلند پایہ شاعر اور فارسی ادبیت کے لحاظ سے بھی ایک ممتاز اُستاد ہیں اور اُن کے معاصرین میں صرف مرزا غالب ہی ایک شاعر ہیں جو فارسی غزل گوئی میں اُن کے ہمسر بلکہ بعض اعتبارات سے اُن سے

بہتر ہیں جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مرزا کو فارسی سے فطری ذوق تھا اور مشق کامل تھی۔ رہے مومن اُنھوں نے فارسی و اُردو شاعری کو دل کی امنگ سے اختیار کیا اور کبھی ذریعہ معاش نہیں بنایا۔

ز۔ مومن کی عدم مقبولیت

اور اُس کے اسباب

عمریست در عدم کدۂ وضع خامشی — از نالہ انتقام اثر می کشیم ما

مومن کے معاصرین میں ذوق کی مقبولیت کا سکہ تقریباً پچاس برس بعد تک چلتا رہا۔ جس کا بڑا سبب اُن کے ذاتی کمال اور قلعہ کی حمایت کے علاوہ یہ ہوا کہ آزاد کی تصانیف نے اُن کے نام اور داغ کی شاعری نے اُن کے رنگ کلام کو ملک بھر میں روشن کر دیا۔ ذوق کے بعد جب نئی نسلیں جدید تعلیم کے اثر سے حقائق کی طرف متوجہ ہوئیں تو کلام غالب کی قدر شروع ہوئی۔ اُدھر حالی اور اُن کے بعد ڈاکٹر بجنوری نے غالب کے حقیقی کمالات کو نمایاں کیا اِدھر نظامی بدایونی نے سب سے پہلے دیوان غالب کا صحیح اور دیدہ زیب ایڈیشن شائع کیا۔ پھر تو یہ نوبت ہوئی کہ ایڈیشن پر ایڈیشن اور شرح پر شرح طبع ہونے لگیں جن کا سلسلہ ابتک جاری ہے اور نہ جانے کب تک رہے۔

رہے مومن۔ اُن غریب کے ساتھ شروع سے حق تلفی اور ناانصافی برتی گئی اور ہنوز روز اول سمجھنا چاہئے۔ حد یہ ہے کہ ابتک اُن کے کلام کا عمدہ اور صحیح ایڈیشن یا اُن کا کوئی مفصّل و مستند تذکرہ شائع نہ ہوسکا۔ ہمارے خیال میں اُن کی عدم مقبولیت کے اسباب حسب ذیل ہیں۔

(۱) مصنف آب حیات اور صاحب گلستان بیخزاں نے شروع سے اُن کے کمالات پر پردہ ڈالا۔

(۲) بقول صاحب گلِ رعنا اُن کو کوئی حالی سا نقاد نہیں ملا۔ اُن کے تلامذہ میں سے کسی نے (حتیٰ کہ شیفتہ نے بھی) جیسا کہ چاہیئے اُن کے محاسن کو اجاگر نہیں کیا۔

(۳) اُن کو تصوف و فلسفہ سے مناسبت نہ تھی۔ یہی سبب ہے کہ ہندوستان کی موجودہ ذہنیت کو اُن کے رنگ سے تباین کلّی ہے۔

(۴) اُن کے خیالات کی پیچیدگی اور زبان کی ناہمواری بھی بڑی حد تک اس کی ذمہ دار ہیں۔

(۵) اُن کی غیور طبیعت ہمیشہ درباری تعلقات سے نفور رہی۔ اسی وجہ سے بھی اُن کو شہرت کے کافی مواقع نہ ملے۔

(۶) اُن کے کلام میں مذہبیت کا عنصر کافی ہے اور اُسی کے ساتھ وہ مذہبی نوک جھوک سے بھی نہیں چوکتے۔ شاید اس وجہ سے بھی وہ ایک مقبول شاعر نہ ہو سکے۔

(۷) وہ اپنے سامنے کسی اُستاد کی (قدیم ہو یا معاصر) کوئی حقیقت نہ سمجھتے تھے بلکہ ہر ایک کو حقارت سے یاد کرتے تھے۔ حق یہ ہے کہ اس میں وہ غالب سے بھی بڑھ گئے تھے۔

ح۔ دورِ جدید اور مومن

کشتۂ کہ عشق دارد نگذارد ت بدینساں بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد

راقم سطور کو عرصہ سے خیال تھا کہ اس ادبی ناانصافی کی طرف مشاہیر اہل قلم کو

متوجہ کیا جائے جو درحقیقت اس موضوع پر قلم اٹھانے کے اہل ہیں۔ مگر کسی طرف سے صدائے لبیک نہ سنکر اپنی بضاعت مزجاۃ کے موافق خود کام شروع کردیا۔ جس کی پہلی قسط مجموعۂ قصائد مومن ہے جو عرصہ ہوا شائع ہوچکا اور دوسری قسط زیر نظر غزلیات کا ایڈیشن ہے۔ توقیع قبول زہے نازش باد۔ اس کے علاوہ رسائل اُردو۔ الناظر۔ ہمایوں کے ذریعہ سے کبھی کبھی ہی خواہان اُردو کو ادھر توجہ دلانے کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ مومن کی تصویر پہلی بار فقیر کے مقالے کے ساتھ رسالہ اُردو کی معرفت ملک سے روشناس کرائی گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ کوشش صدا بصحرا ثابت نہ ہوئی اور متعدد ارباب قلم اس جانب متوجہ ہوئے اور انھوں نے اس مبحث کو درخور اعتنا سمجھ کر اس پر مفید اور پُراز معلومات مقالات سپرد قلم کئے۔ اگرچہ گذشتہ بے اعتنائی کے کفارے میں ابھی بہت کچھ کرنا ہے اور پبلک کے ایک صدی کے جمود کو توڑنے کے لئے پوری قوت سے کام لینا ہے۔ تاہم حالات اُمید افزا ہیں جس کی شہادت میں نگار کا مومن نمبر اور عالمگیر وغیرہ کے مضامین کافی ہیں۔ حال میں دو مختصر کتابیں مومن و غالب (از معجز سہسوانی) اور مومن کی شاعری (از عارف ہسوی) شائع ہوئی ہیں جن میں مومن کے کمالات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حق تلفی ہوگی اگر محب محترم فنا فی المومن جناب عرش گیاوی کی مساعئ جمیلہ کا ذکر نہ کیا جائے۔ موصوف نے نہایت دیدہ ریزی اور جانفشانی سے مومن کے حالات مہیا کر کے تھوڑا عرصہ ہوا حیات مومن کے نام سے طبع کرائے ہیں۔ اس طول کلام سے اپنی خودستائی اور تعلّی مقصود نہیں۔ صرف گزارش

احوال واقعی منظور ہے اور یہ عرض کرنا ہے کہ ان حالات پر نظر کرتے ہوئے یہ پیشگوئی کرنا بیجا نہیں کہ ملک جلد یا بدیر اس بادشاہ اقلیم سخن کے آستان جلال پر سر جھکائے گا۔

ط۔ ناقدین کی رائیں

بیا ببیں کہ چہ فتوی دہند درستی　　ہماں گروہ کہ مے را حرام می گفتند

یہاں نامناسب نہ ہوگا اگر چند مشاہیر ارباب فن کی رائیں مومن کی نسبت نقل کردی جائیں تاکہ اُن کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہو سکے اور یہ تحقیق ہو سکے کہ مومن واقعی اس اعتنا کے اہل بھی ہیں یا نہیں۔ رایوں کے لئے کسی تعارف و تشریح کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کیونکہ اہل الرائے کا نام ہی اصابت رائے کی کافی ضمانت ہے

غالب "کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر (تم مرے پاس ہوتے ہو گویا الخ) مجھکو دیدیتا"۔ (یادگار غالب)

شیفتہ "بزعم فقیر بقوت شاعری ایشاں کم کسے برخاست و در زہن آں چناں مکانتے واقع دارد کہ کسے را در یک صنعت ہم میسر نیامدہ" (گلشن بیخار)

حالی "مومن خاں مرحوم اس خصوصیت (نزاکت خیال) میں مرزا سے بھی سبقت لے گئے ہیں" (یادگار غالب)

آزاد "اُن کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہیں" (آب حیات)

مولوی کریم الدین "در باب فنون نظمیہ کے خدا نے اُن کو وہ بہرہ دیا کہ اپنے اُستاد نصیر وغیرہ تمام اقران پر سبقت لے گئے" (تذکرہ شعرائے ہند)

صفیر بلگرامی "مومن خاں کے علم نے ان واقعات کو مشکل بندش اور نرالی ترکیبوں سے ایسے پردے میں رکھا کہ ادا شناس ہی اُسکے مزے کو جانتا ہے" (جلوہ خضر)

سید علی حسن خاں - جہاں استادست را نا دانکہ پایہ ریختہ از پستی بہ اوج رسانڈہ اوست - غزلیات اولاجواب ست و مثنویات او مغز انتخاب - (بزم سخن)

مولوی عبدالغفور خاں نساخ "جمیع اوصاف سخن پر قادر تھے اشعار اُن کے پر مضمون و شیریں و عاشقانہ و نمکین ہوتے ہیں - راقم کے زعم میں اس مزے کی طبیعت کا کوئی شاعر ریختہ گویوں میں گذرا نہیں" (سخن شعرا)

نواب امداد امام اثر "مومن درد و میر سے مضامین قلبیہ میں کم سہی لیکن اُن کی غزل سرائی پر اہل دہلی بلکہ ہر دیار کے اہل مذاق کو ناز ہونا چاہئے" (کاشف الحقائق)

مولوی عبدالحئی "مومن نے جس قدر اسالیب بیان میں نزاکت و لطافت پیدا کر دی ہے وہ اُن کی ذہانت اور جولانی طبیعت کا تماشا گاہ ہے انداز بیان کہیں کیفیت سے خالی نہیں" (گل رعنا)

مولوی عبدالسلام "اُن کی عاشق مزاجی نے اُن کو جرات کے رنگ کی طرف مائل کیا لیکن انھوں نے اس میں بھی دلّی کی شان کو قائم رکھا اور نہایت متانت و تہذیب کے ساتھ عشق و ہوس کے جذبات ادا کئے" (شعر الہند)

نیاز "اگر میرے سامنے تمام شعرا کا کلام رکھ کر صرف ایک کے انتخاب کی اجازت دیجائے تو بلا تامل کلیات مومن اُٹھا لونگا" (نگار)

رام بابو سکسینہ "مومن کا کلام نازک خیالی اور بلند پروازی کے لئے مشہور ہے اور وہ صاحب طرز ہیں" (تاریخ ادب اردو)

ظہیر دہلوی "طرز مومن ست تا کا دستے بہتا کہا ہے سچ تو یہ ہے کہ کبھی لطف غزل نے ندیا

بیخود دہلوی۔ زباں ہو داغ کی بیخود تو ہو مضمون مومن کا + بیاں غالب کا ہو اشعار کی وہ شان پیدا کر

حسرت موہانی۔ مرحبا حسرت بنائی خوب تصویر سخن + رنگ مومن خوشنما کس درجہ اس پیکر میں ہے

ی - قول فیصل

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو   نفی حکمت مکن از بہر دل عامے چند

مانا کہ مومن کے کلام میں بعض ایسی خامیاں ہیں جن کی وجہ سے اُن کا رنگ ملک میں رائج نہیں ہو سکتا تاہم اُن کے کمال سے چشم پوشی کرنا آفتاب کی درخشانی سے انکار کرنا ہے۔ قدیم اساتذہ کے کارناموں پر بحث و تمحیص کرنے کا مقصد نہیں کہ اہل فن اُن کے انداز و اسلوب کو ہر حیثیت سے اپنے لئے شمع راہ بنائیں۔ لیکن یہ روش بھی صحیح نہیں کہ اُن کے محاسن سے آنکھیں بند کر کے اُن کی نشر و اشاعت کو گناہ ٹھہرائیں۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ صدق جذبات اور ندرت اسلوب میں کوئی اُستاد مشکل سے مومن کا ہمسر ہوگا۔ نازک خیالی کی صفت میں البتہ غالب اُن کے شریک ہیں مگر دونوں کے کلام کے مطالعہ کرنے والوں پر یہ صداقت آشکار ہوگی کہ مومن اس میں ان سے سبقت لیگئے ہیں۔ پھر دونوں کی تخییل کا میدان مختلف ہے۔ سب پر مستزاد یہ کہ غالب کا کلام منتخب ہے اور مومن کو یہ موقع نہیں ملا۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ مومن کی شاعری میں جو ہمہ گیری ہے وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔ اُن کا کلام شعر کی تمام اصناف پر حاوی ہے اور اُس میں ایک طرف نازک خیالی کے جلوے نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف معاملہ بندی کے۔ گویا وہ فغانی کے انداز کے بھی مالک ہیں اور شرف جہاں کے طرز میں بھی ماہر ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اگر کوئی شخص تغزل میں نظیری کو

نازک خیالی میں عرفی کو اور و قوعہ گوئی میں وحشی کو دیکھنا چاہیئے تو مومن کو دیکھ لے جن کی شاعری بہ یک وقت تینوں کے طرز کی جامع ہے۔

اساتذہ اُردو میں ذوق کو تو معرض بحث میں لانا ظلم ہے کیونکہ اُن کی شاعری (خصوصاً غزل) میں لوچ اور ملاحت بہت کم ہے۔ خود مرزا غالب بھی بعض اوصاف میں مومن سے پیچھے ہیں۔ جب یہ حال ہے تو کس قدر حق تلفی ہے کہ اُن کے کلام سے کلام غالب کی نصف بھی اعتنا دریغ کی جائے وقت آگیا ہے کہ ارباب قلم اس فقید المثال اُستاد کے ساتھ انصاف اور اُس کے محاسن کی قدر کریں۔

الحمد للہ کہ ملک کے مطلع پر جمود کی جو گھٹا چھائی ہوئی تھی اب بتدریج چھٹتی جارہی ہے اور اُمید کی شعاع اپنا چمکتا چہرہ دکھارہی ہے عجب نہیں کہ آفتاب حقیقت اپنی پوری ضیا پاشیوں کے ساتھ جلوہ دکھائے اور آفاق تمام مطلع انوار بنجائے۔ وما ذٰلک علی اللہ بعزیز۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم
چنانکہ حرف عصا گفت موسیٰ اندر طور

تلک عشرۃ کاملہ

سیاہ نامہ ضیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شرح غزلیاتِ مومن

ردیف الف

۱

نہ کیونکر مطلعِ دیواں ہو مطلع مہرِ وحدت کا
کہ ہاتھ آیا ہے روشن مصرع انگشتِ شہادت کا

بچاؤں[1] آبلہ پائی کو کیونکر خارِ ماہی سے
کہ بامِ عرش سے پھسلا ہے یارب پاؤں دقّت کا

سرشکِ[2] اعترافِ عجز نے الماس ریزی کی
جگر صد پارہ ہے اندیشۂ خوں گشتہ طاقت کا

نہ یہ[3] دستِ جنوں ہے اور نہ وہ جیبِ جنوں کیشاں
کہ ہو دستِ مژہ سے چاک پردہ چشمِ حیرت کا

نہ دے[4] تیغِ زباں کیونکر شکستِ رنگ کے طعنے
کہ صفہائے خرد پر حملہ ہے فوجِ خجالت کا

غضب سے تیرے ڈرتا ہوں رضا کی تیری خواہش ہے
نہ میں بیزار دوزخ سے نہ میں مشتاقِ جنت کا

گلوئے[5] خامہ میں سُرمہ مدادِ دودۂ دل ہے
اگر لکھنا ہے وصفِ خاتمہ جلدِ رسالت کا

---

[1] ماہی = ماہی زمین۔ دقت ۔ نکتہ سنجی۔ شاعر راہ حمد باری کی دشوارگذاری بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں اسقدر چلا کہ پاؤں میں آبلے پڑگئے۔ آخر بلند پروازی کرکے بامِ عرش پر پہنچا لیکن دشواری راہ کے باعث جو پاؤں پھسلا تو سیدھا تحت الثریٰ میں جاکر رُکا۔ اب اپنے آبلوں کو زمین کی مچھلی کے کانٹوں سے کیونکر بچاؤں۔ [2] اندیشہ (خیال) نے جس کی طاقت حمدِ الٰہی کی کوشش میں خون ہوچکی ہے۔ اقرارِ عجز کے آنسو گرائے اور ان آنسوؤں نے الماس بنکر اندیشہ کا جگر اور بھی پارہ پارہ کردیا۔ [3] مانا کہ دستِ جنون دیوانوں کے جیب کو چاک کرسکتا ہے۔ مگر نہ دستِ مژہ دستِ جنوں ہوسکتا ہے نہ پردۂ چشم حیرت جیب اہلِ جنوں۔ لہذا دستِ مژہ سے اس پردہ کا چاک ہونا محال۔ مژہ (پلک) کو دست سے تشبیہ دی ہے۔ حیرت سے مُراد وہ حیرانی ہے جو عارف پر تجلیاتِ الٰہی سے طاری ہوتی ہے۔ [4] خرد کو گو کُنہ باری تک پہنچنے کا دعویٰ تھا۔ مگر فوج خجالت نے اس پر حملہ کیا جس کے باعث خرد کے رنگ کو شکست ہوئی۔ قاعدہ ہے کہ خجالت سے رنگ اُڑ جاتا ہے۔ اب زبان (جو تیغ کی طرح تیز ہے) خرد کو طعنے دے رہی ہے کہ بس اسی مُنہ پر یہ دعویٰ تھا، طعنہ = کچوکا۔ [5] جلدِ رسالت کے خاتمہ سے جنابِ ختمِ رسالت کی ذاتِ اقدس مُراد ہے۔ چونکہ حضور کا وصف لکھنا مقصود ہے اسلیے قلم کے گلے میں دود دل کی سیاہی سُرمہ بنگئی ہے۔ یعنی قلم تحریر سے عاجز ہے۔ قاعدہ ہے کہ سُرمہ کھانے سے آواز بیٹھ جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سوز ناکامی کا دھواں دل سے اُٹھکر گلے سے خامہ میں سُرمہ بنگیا ہے۔ سُرمہ کی مشابہت مدادِ دود سے ظاہر ہے خامہ اور مداد (سیاہی) اور جلد میں رعایت ہے۔

نہ پوچھو گرمیِ شوقِ ثنا کی آتش افروزی — بنا جاتا ہے دستِ عجز شعلہ شمعِ فکرت کا

نمک تھا بختِ شورِ فکر خوانِ مدحِ شیریں پر — کہ دندانِ طمع نے خوں کیا ہے دستِ حسرت کا

خدایا ہاتھ اٹھاؤں عرضِ مطلب سے بھلا کیونکر — کہ ہے دستِ دعا میں گوشہ دامانِ اجابت کا

عنایت کر مجھے آشوبگاہِ حشرِ غم اک دل — کہ جس کا ہر نفس ہم نغمہ ہو شورِ قیامت کا

جراحت زار اک جاں دے کہ جسکی ہر جراحت ہو — نمکداں شورِ الفت سے مزا آوے عبادت کا

فروغِ جلوۂ توحید کو وہ برقِ جولاں کر — کہ خرمن پھونکدیوے ہستیِ اہلِ ضلالت کا

مرا جوہر ہو سرتاپا صفائے مہرِ پیغمبر — مرا حیرت زدہ دل آئینہ خانہ ہو سنت کا

مجھے وہ تیغِ جوہر کر کہ میرے نام سے خوں ہو — دلِ صد پارۂ اصحابِ نفاق و اہلِ بدعت کا

خدایا لشکرِ اسلام تک پہنچا کہ آ پہنچا — لبوں پر دم بلا ہے جوشِ خوں شوقِ شہادت کا

نہ رکھ بیگانۂ مہرِ امامِ اقتدا سنت — کہ انکار آشنائے کفر ہے اسکی امامت کا

امیرِ لشکرِ اسلام کا محکوم ہوں یعنی — ارادہ ہے مرا فوجِ ملائک پر حکومت کا

زمانہ مہدیِ موعود کا پایا اگر مومن
تو سب سے پہلے تو کہیو سلامِ پاک حضرت کا

۵ شوقِ ثنا کی شدت نے اس قدر آگ بھڑکائی کہ میرا دستِ عجز (جو تحریرِ نعت سے قاصر ہے) شمعِ فکر کا شعلہ معلوم ہوتا ہے۔ شاعر ایک طرف شوقِ ثنا کی شدت بیان کرتا ہے دوسری طرف اپنے عجز کا۔ وفورِ مطلب یہ ہے کہ باوجود عجز، شوقِ ثنا بنیاب کیے دیتا ہے۔ ۶ حضور کی مدح شیریں کی خوان اور اپنی فکر کی شور بختی (ناکامی) کو نمک قرار دیا ہے۔ چونکہ دستِ حسرت اس خوان تک نہ پہنچ سکا اسلیے دندانِ طمع نے اُسکی خواہش میں جھنجلا کر دستِ حسرت کو کاٹ کاٹ کر خون کر دیا۔ شاعر نے اس کاٹنے کی توجیہ یوں کی کہ شاید خوانِ مدحِ شیریں پر میری فکرِ نارسا کا بختِ شور نمک کا حکم رکھتا تھا جبھی تو اُس (نمک) کی لذت کے تصور سے دندانِ طمع نے دستِ حسرت کو کاٹا۔ شور و نمک میں ایہام تناسب اور شیریں و شور میں ایہام تضاد ظاہر ہے۔ ۷ جراحت زار = جہاں کثرت سے زخم ہوں۔ شاعر ایذا پسند کی آرزو ہے کہ ہر زخم نمکداں بنجائے اور شورِ محبت میں عبادت کا لطف آئے۔ جملہ کو دو مصرعوں میں توڑ دینا مومن کے یہاں کثیر الوقوع ہے۔ ۸ تیغ جوہر = وہ جسکے جوہر تیغ کی طرح ہوں۔ اصلی تلوار یا آئینہ میں جو نشان ہوتے ہیں اُن کو جوہر کہتے ہیں۔ خاصیت کے معنی میں بھی آتا ہے۔ ۹ لبوں پر دم آ پہنچا کیونکہ شوقِ شہادت کی وجہ سے جوشِ خون انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ لشکرِ اسلام سے مراد وہ فوج ہے جس نے بسرکردگی سید احمد صاحب رائے بریلوی ۱۲۴۲ھ میں سکھوں کے مقابلے میں جہاد کے لیے خروج کیا تھا۔ دوسرے شعر میں امامِ اقتدا سنت سے سید احمد صاحب ہی مقصود ہیں یعنی جس کی پیروی سنت ہے۔ ۱۰ حضرت = رسولِ مقبولؐ۔ اس میں اشارہ ہے ایک حدیث کی طرف جس میں حضور نے ہدایت فرمائی ہے کہ جو کوئی امام مہدی کا زمانہ پائے تو اُن سے میرا سلام کہدے۔

۲

آگ اشکِ گرم کو لگے جی کیا ہی جل گیا
آنسو جو اُس نے پونچھے شب اور ہاتھ پھل گیا

پھوڑا تھا دل نہ تھا یہ ہوئے پر خلل گیا
جب ٹھیس سانس کی لگی دم ہی نکل گیا

کیا روؤں خیرہ چشمیِ بختِ سیاہ کو
واں شغلِ سرمہ ہے ابھی یاں نیل[1] ڈھل گیا

کی مجھکو ہاتھ ملنے کی تعلیم ورنہ کیوں
غیروں کو آ کے بزم میں وہ عطر مل گیا

اُس کو جلا ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی
کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا

جوں خفتگانِ خاک ہے اپنی فتادگی
آیا جو زلزلہ کبھی کروٹ بدل گیا

اُس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

کچھ جی گرا پڑے تھا پر اب تو نے ناز سے
مجھکو گرا دیا تو مرا جی سنبھل گیا

ملجائے گریہ خاک میں اُس نے وہاں کی خاک
گِل کی تھی کیوں کہ پاؤں وہ نازک پھسل گیا

بتخانے سے نہ کعبے کو تکلیف دے مجھے
مومن بس اب معاف کہ یاں جی بہل گیا

۳

لگے خدنگ[2] جب اس نالۂ سحر کا سا
فلک کا حال نہ ہو کیا مرے جگر کا سا

نہ جاؤں گا کبھی جنت کو میں نہ جاؤں گا
اگر نہ ہووے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا

کرے نہ خانہ خرابی تری[3] ندامت جور
کہ آب شرم میں ہے جوش چشمِ تر کا سا

یہ جوشِ یاس تو دیکھو کہ اپنے قتل کے وقت
دعائے وصل نہ کی وقت تھا[4] اثر کا سا

لگے اُن آنکھوں سے ہر وقت اے دلِ صد چاک
ترا نہ رتبہ ہوا کیوں شگافِ در کا سا

---

[1] نیل کا ڈھل جانا = آنکھ کا بے نور ہو جانا جو علامات موت میں سے ہے۔

[2] نالۂ سحر تو جگر سے نکل کر اُلٹا جگر ہی پر پڑتا ہے اور اُس کو مجروح کر دیتا ہے۔ اگر ایسا تیر صحیح نشانہ پر بیٹھے یعنی آسمان پر جا کر پڑے تو اُس کا بھی وہی حال ہو جو میرے جگر کا ہے۔ [3] معشوق اگر ظلم سے نادم ہے تو بھی عاشق کی خانہ خرابی کا احتمال ہے کیونکہ اُس کے عرقِ شرم میں عاشق کی چشمِ تر کی سی کیفیت ہے۔ چشمِ تر کی خانہ ویران سازی مشہور ہے۔ [4] وقتِ قتل کو شہادت کی بنا پر وقتِ مقبولیت قرار دیتا ہے۔ مگر جوشِ یاس کی وجہ سے دعائے وصل نہیں کرتا۔

ذرا ہو گرمیِ صحبت تو خاک کر دے چرخ
مرا سرور ہے گُلِ خندۂ[۴] شرر کا سا

یہ ناتواں ہوں کہ ہوں اور نظر نہیں آتا
مرا بھی حال ہوا تیری ہی کمر کا سا

جنوں کے جوش سے بیگانہ وار ہیں احباب
ہمارا حال وطن میں ہوا سفر کا سا

خبر نہیں کہ اُسے کیا ہوا پر اُس در پہ[۵]
نشانِ پا نظر آتا ہے نامہ بر کا سا

دل ایسے شوخ کو مومنؔ نے دیدیا کہ وہ ہے
محبِ حسینؑ کا اور دل رکھے[۶] شمر کا سا

۵

گر وہاں بھی یہ خموشی[۷] اثرِ افغاں ہوگا
حشر میں کون مرے حال کا پُرساں ہوگا

اُن سے بدخو کا کرم بھی ستمِ جاں ہوگا
مَیں تو مَیں غیر بھی دل دیکھے پشیماں ہوگا

اور ایسا کوئی کیا بے[۸] سر و ساماں ہوگا
کہ مجھے زہر بھی دیجے گا تو احساں ہوگا

محو مجھ سا دمِ نظّارۂ جاناں ہوگا
آئنہ آئنہ[۹] دیکھے گا تو حیراں ہوگا

خواہشِ مرگ ہو اتنا نہ ستانا ورنہ
دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں[۱۰] ہوگا

ایسی لذت خلشِ دل میں کہاں ہوتی ہے
رہ گیا سینہ میں اس کا کوئی پیکاں ہوگا

بوسہ ہائے لبِ شیریں کے مضامیں ہیں نکیوں
لفظ سے لفظ مرے شعر کا چسپاں ہوگا

کیا سُناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل
تم سے بیرحم[۱۱] پہ مرتے سے تو آساں ہوگا

[۴] گُل خندۂ شرر ناپائدار ہوتا ہے۔ شرر ذرا ہنسا اور خاک ہوگیا۔ یہی میرا حال ہے۔ [۵] یعنی نامہ بر کے در یار تک پہنچنے کا ثبوت ہے آگے نہیں معلوم کیا گزری شاید مارا گیا۔ [۶] شمر اصل میں بسکون میم ہے۔ یہ حرکت مومن کا تصرّف ہے۔ [۷] خموشی اثر جس کا اثر خاموشی کا سا ہے یعنی جب میری فغاں خاموشی کا حکم رکھتی ہے تو حشر میں بھی اُس کی پُرسش کی اُمید نہیں، مومن نے افغاں اور فغاں کو مذکر باندھا ہے۔ آزاد کے نزدیک خموشی اثر فغاں سے مراد ہے فغانے کہ اثرش خموشی است۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ میری فریاد سُن کر لوگوں کو چپ لگ جاتی ہے۔ پھر حشر میں پرسش حال کی کیا اُمید۔

[۸] شاعر اپنی بے سر و سامانی سے اُکتا کر موت کا متمنی ہے۔ مگر اُسکے لئے بھی ساز و سامان چاہئے۔ بے سر و سامانی کی انتہا یہ ہے کہ زہر بھی میسّر نہیں۔ [۹] دوسرے آئینہ سے رخ جاناں مراد ہے۔ [۱۰] یعنی ارمانِ مرگ۔ [۱۱] یعنی تم پر مرنا زیادہ مشکل ہے۔ جب میں نے اس کو جھیل لیا تو اُس کو جھیلنا کیا دشوار ہے۔

حیرتِ حسن[۱] نے دیوانہ کیا گر اُس کو — دیکھنا خانۂ آئینہ بھی ویراں ہوگا

دیدۂ[۲] منتظر آتا نہیں شاید تجھ تک — کہ مرے خواب کا بھی کوئی نگہباں ہوگا

ایک ہی جلوۂ مہرو میں ہوا سو ٹکڑے — جامۂ صبر جسے کہتے ہیں کتاں[۳] ہوگا

گریہی گرمیِ مضمون شرر ریز رہی — رشتۂ شمع سے شیرازۂ دیواں ہوگا

کیونکہ اُمیدِ[۴] وفا سے ہو تسلّی دل کو — فکر ہے یہ کہ وہ وعدے سے پشیماں ہوگا

گر ترے خنجرِ مژگاں نے کیا قتل مجھے — غیر کیا کیا ملک[۵] الموت کے قرباں ہوگا

اپنے انداز کی بھی ایک غزل پڑھ مومن

آخر اس بزم میں کوئی تو سخنداں ہوگا

۵

بے[۱] سبب کیونکہ لبِ زخم پہ افغاں ہوگا — شورِ محشر سے بھرا اُس کا نمکداں ہوگا

آخر اُمید[۲] ہی سے چارۂ حرماں ہوگا — مرگ کی آس پہ جینا شبِ ہجراں ہوگا

مجمعِ بستر[۳] مخمل شبِ غم یاد آیا — طالعِ خفتہ کا کیا خواب پریشاں ہوگا

دل میں شوقِ رُخِ روشن نہ چھپے گا ہرگز — ماہ پردے میں کتاں کے کوئی پنہاں ہوگا

۱؎ خانہ آئینہ کی ویرانی سے اُسکی بے رونقی مراد ہے۔ اسکو یعنی معشوق کو آئینہ دیکھتے وقت اگر خود اُسی کی حیرتِ حسن نے دیوانہ کر دیا تو پھر آرائش سے بیزار ہو جائے گا۔ ۲؎ اسے دیدۂ منتظر تجھ تک خواب نہیں آتا۔ شاید اسکا بھی کوئی نگہبان ہوگا۔ جو معشوق کی طرح اُسکو نہیں آنے دیتا۔ ۳؎ کتان کا کپڑا جلوۂ ماہ سے چاک چاک ہو جاتا ہے۔ میرا جامۂ صبر بھی گویا کتان ٹھہرا کہ جلوۂ ماہرو کی تاب نہ لاسکا۔ ۴؎ مجھے یہ فکر ہے کہ وہ وعدہ کرکے پچھتائے گا۔ پھر ایسے شخص سے اُمید وفا سے وعدہ لاحاصل۔ ۵؎ یعنی رقیب میرے قتل کی خوشی میں ملک الموت کے قربان ہوگا۔ لہٰذا اگر معشوق کو رقیب کی خاطر عزیز ہے تو چاہئے کہ مجھ (عاشق) کو خنجر مژگاں سے قتل کردے۔ یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ رقیب رشک سے اپنی جان دیگا۔

۱؎ قاتل کا نمکدان شورِ محشر سے بھرا ہوگا اور محشر اور فریاد لازم و ملزوم ہیں۔ اسلئے نمکپاشی سے لبِ زخم کا مائل فریاد ہونا حق بجانب ہوگا۔ گویا فریادِ زخمِ عاشق، کم حوصلگی کا نتیجہ نہیں بلکہ بیدادِ معشوق قدرۃً محرکِ فغاں ہے۔ شور اور نمکدان کی رعایت ظاہر۔ ۲؎ ناکامی عشق کا علاج اگر ہو سکتا ہے تو اُمید ہی سے۔ خواہ وہ اُمید مرگ ہی کیوں نہ ہو یعنی اُمید سے بہرحال سروکار رہتا ہے۔ کچھ نہیں تو موت ہی کی اُمید سہی۔ ۳؎ شبِ ہجراں میں کامرانی وصل یاد آئی جب بستر مخمل پر دوست کے ساتھ داد عیش دیے رہتے تھے۔ ایسی حالت میں یادِ عیش گذشتہ سے سوئے ہوئے نصیبہ کا خواب کسقدر پریشان ہوگا یعنی یادِ وصل خفتہ طالعی کی تلخی میں اور اضافہ کریگی۔ لفظ خواب میں ایہام ہے۔

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری	چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا
شومی بخت تو ہے چین سے لائے وحشت دل	دیکھ زنداں ہی کوئی دن میں بیاباں ہوگا
نسبت عیش سے ہوں نزع میں گریاں یعنی	ہے یہ رونا کہ دہن گور کا خنداں ہوگا
بات کرنے میں رقیبوں سے ابھی ٹوٹ گیا	دل بھی شاید اسی بدعہد کا پیماں ہوگا
چارہ جو اور بھی اچھا میں کروں گا ٹکڑے	پردۂ شوخ جو پیوند گریباں ہوگا

دوستی اُس صنمِ آفتِ ایماں سے کرے
مومن ایسا بھی کوئی دشمن ایماں ہوگا

دیدۂ حیران نے تماشا کیا	دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا
ضبط فغاں گو کہ اثر تھا کیا	حوصلہ کیسا کیا نہ کیا کیا کیا
آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے	آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا
مر گئے اس کے لب جاں بخش پر	ہم نے علاج آپ ہی اپنا کیا

اگر علاج ہوا تو درد جاتا رہے گا۔ لیکن چونکہ درد جان کے عوض تمام جسم میں سرایت کئے ہوئے ہے اسلیے درد کا زائل ہونا اور جان کا جانا مترادف ہونگے۔ ساری = اثر کرنے والا۔

وحشت دل زنداں سے گھبرا کر بیاباں نوردی پر ابھارتی ہے۔ جس پر مومن کہتا ہے کہ اگر میری سیہ بختی سلامت ہے تو ایک دن زنداں ہی ویران ہو کر بیاباں ہو جائے گا۔ یہاں دہان گور کے کشادہ ہونے کو اسکے خنداں ہونے سے تعبیر کیا ہے۔ شاعر کو اپنا [illegible] سے اتنی سی مناسبت بھی گوارا نہیں اور محض اسی وجہ سے نزع میں روتا ہے۔ معشوق نے عہد کیا تھا کہ رقیبوں سے بات نہ کرے گا۔ لیکن بات کی۔ جس سے اُدھر اس کا عہد ٹوٹا اور ادھر عاشق کا دل۔ یعنی اُس کا عہد اور اس کا دل دونوں ٹوٹے۔ چارہ جوئے دیوانہ نے چاک گریباں میں شوخ کے پردۂ در کا پیوند لگایا ہے کہ شاید اس سے تسکین خاطر ہو یا اسکا ادب کر کے جامہ دری سے باز رہے۔ مگر دیوانہ بدرجۂ اولیٰ اس کو چاک کرے گا کیونکہ وہ ہمیشہ سے معشوق کے پردے کا دشمن ہے۔ دیدۂ حیراں کی بدولت میں خود تماشا بنا۔ باوجود اثر ضبط فغاں کیا۔ افسوس کیا کیا کہ اس قدر حوصلہ سے کام لیا۔ آنکھ نہ لگنا = نیند نہ آنا۔ آنکھ کا لگ جانا۔ کسی پر عاشق ہو جانا۔

مرنے میں اور جاں بخشی میں منافات ہے اور شاعر نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اپنا علاج آپ کرنا اس میں حقیقی اور طنزیہ دونوں پہلو موجود ہیں۔ مطلب ہے کہ لب جاں بخش پر مرنا بھی زندگی ہے۔

بجھ گئی اک آہ میں شمعِ حیات
مجھکو دمِ سرد نے ٹھنڈا کیا

غیر عیادت سے بُرا مانتے
قتل کیا آن کے اچھا کیا

اُنسے پری‌وش[۴] کو نہ دیکھے کوئی
مجھکو مِری شرم نے رسوا کیا

زندگیِ ہجر بھی اک موت تھی
مرگ نے کیا کارِ مسیحا کیا

پان[۵] میں یہ رنگ کہاں آپنے
آپ مرے خون کا دعویٰ کیا

جور[۶] کا شکوہ نہ کروں ظلم ہے
راز مِرا صبر نے افشا کیا

کچھ بھی بن آتی نہیں کیا کیجیئے
اُس کے بگڑنے نے کچھ ایسا کیا

جا[۷] ئے تھی تیری مرے دل میں سو ہے
غیر سے کیوں شکوۂ بیجا کیا

رحم[۸] فلک اور مرے حال پر
تونے کرم اے ستم آرا کیا

سچ ہی سہی آپ کا پیماں ولے
مرگ نے کب وعدۂ[۱۰] فردا کیا

دعویِ تکلیف[۱۱] سے جلاد نے
روزِ جزا قتل پھر اپنا کیا

مرگ نے ہجراں میں چھپایا ہے منہ
لو منہہ[۱۲] اُسی پردہ نشیں کا کیا

دشمنِ **مومن** ہی رہے بت سدا
مجھ سے مِرے نام نے یہ کیا کیا

---

[۴] عاشق نے پاسِ شرم سے معشوق کو نہ دیکھا تا کہ افشائے رازِ محبت نہ ہو۔ مگر اُس سے اور زیادہ رسوائی ہوئی اور لوگوں کو سبہ ہوا کہ کچھ راز ضرور ہے ورنہ ایسے پری‌وش کو نہ دیکھنا کیا معنی۔ [۵] میرے قتل کے بعد آپ کی یہ زینت خود اس امر کی غمازی کر رہی ہے کہ آپ ہی نے مجھے قتل کیا ہے۔ گویا آپ کے لبوں پر پان کا رنگ نہیں۔ بلکہ خون عاشق کی سُرخی ہے۔ [۶] میں ظلم یار کا شکوہ نہیں کرتا اور صبر سے کام لیتا ہوں کہ پردہ عشق فاش نہ ہو۔ مگر ستم یہ ہے کہ اس (صبر) سے اور راز کھل گیا اور لوگ تاڑ گئے کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔"
[۷] یعنی غیر کے دل میں تیری جگہ پہلے ہی کب تھی۔ جا ئے اب متروک ہے۔ جا اور بیجا میں ایہام تضاد ہے۔
[۸] تونے مجھ پر اس قدر ظلم کئے کہ اب آسمان کو بھی میرے حال پر رحم آنے لگا۔ اس لحاظ سے تیرا ستم بھی میرے حق میں کرم ہوگیا۔ [۱۰] اسلیے وعدہ کو کل پر نہ اُٹھا رکھئے۔ ممکن ہے کہ مجھے آج ہی موت آجائے۔
[۱۱] اپنا = ہمارا۔ قاتل نے روزِ جزا الٹا ہم پر دعویٰ کیا کہ اس سخت جان کے ہلاک کرنے سے مجھے تکلیف ہوئی اور اس جرم میں ہمیں پھر قتل کر دیا۔ [۱۲] منہ کرنا = طرفداری کرنا۔

ے

مرے[1] نہ عشق میں جب تک وہ مہرباں نہ ہوا — بلائے جاں ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا

خدا کی یاد دلاتے تھے نزع میں احباب — ہزار شکر کہ اُس دم وہ بدگماں نہ ہوا

ہنسے نہ غیر مجھے بزم سے اُٹھانے پر — سُبک[2] ہے وہ کہ تری طبع پر گراں نہ ہوا

دِیت[3] میں روز جزا لے رہیں گے قاتل کو — ہمارا جان کے جانے میں بھی زیاں نہ ہوا

وہ آئے پھر عیادت تو تھا میں شادیِ مرگ — کسی سے چارۂ[4] بیداد آسماں نہ ہوا

لگی نہیں ہے یہ چُپ لذتِ ستم سے کہ میں — حریف[5] کشمکشِ نالہ وفغاں نہ ہوا

دمِ حساب رہا روزِ حشر بھی یہی ذکر — ہمارے عشق کا چرچا کہاں کہاں نہ ہوا

ہے شرط ہمپہ عنایت میں گو نہ گو نہ ستم — کبھی محبتِ دشمن کا امتحاں نہ ہوا

وہ[6] حال زار ہے میرا کہ گاہ غیر سے بھی — تمہارے سامنے یہ ماجرا بیاں نہ ہوا

نے

اُمید[7] وعدۂ دیدارِ حشر پر مومن
تو بے مزہ تھا کہ حسرت کشِ بتاں نہ ہوا

[1] عشق میں جب تک ہم نہ مرے دوست مہربان نہ ہوا۔ جو دل بلائے جان (موجب ہلاکت) نہ ہو وہ دراصل بلائے جان (باعث مصیبت) ہے۔ [2] جو شخص تیری طبع نازک پر گراں نہ ہو (یعنی غیر) وہ حقیقت میں سُبک ہے۔ شاعر نے یہاں سُبک دوسرے معنی میں استعمال کیا ہے یعنی ذلیل۔ اور اس طرح اپنے دل کو تسلّی دی ہے۔ سُبک اور گراں کا تقابل ظاہر ہے۔

[3] دِیت = خوں بہا۔ [4] بیداد آسمان کا کوئی علاج نہیں۔ دوست یا تو عیادت کو آتا نہ تھا۔ اور جب آیا تو مَیں خوشی سے مرگیا اور اس کی آمد سے متمتع نہ ہوسکا۔

[5] میری خاموشی لذتِ ستم کی وجہ سے نہیں بلکہ کشمکش نالہ وفغاں میں پڑنا میری وضع کے خلاف ہے۔ [6] میرا حال اس قدر تباہ ہے کہ رقیب جیسا قسی القلب بھی تم جیسے سنگدل کے سامنے بیان نہیں کرسکتا۔ دشمن کے نہ بیان کرنے کی نئی توجیہ کی ہے۔

[7] مومن کب تک وعدۂ دیدار الٰہی کی امید پر بیٹھا رہتا اور بتوں سے ملنے کی حسرت دل کی دل ہی میں رکھتا۔ آخر اُن کی فرقت کا صدمہ نہ اُٹھا سکا اور امید وعدۂ حشر سے بے مزہ (آزردہ) ہوکر حسینوں سے ملنے لگا۔

۸

سم کھا موے تو دردِ دلِ زار کم ہوا — بارے کچھ اِس دوا سے تو آزار کم ہوا

کچھ[1] اپنے ہی نصیب کی خوبی تھی بعدِ مرگ — ہنگامۂ محبّتِ اغیار کم ہوا

معشوق سے بھی ہم نے نبھائی برابری — واں لُطف کم ہوا تو یہاں پیار کم ہوا

آئے[2] غزال چشم سدا میرے دام میں — صیّاد ہی رہا مَیں گرفتار کم ہوا

ناکامیوں[3] کی کاہشِ بیجا کا کیا علاج — بوسہ دیا تو ذوقِ لبِ یار کم ہوا

ہر چند[4] اضطراب میں مَیں نے کمی نہ کی — تو بھی نہ واں تغافلِ بسیار کم ہوا

کیا[5] مجھ میں دم بھی لینے کی طاقت نہیں رہی — کیوں شورِ نالہ ہائے عزا بار کم ہوا

سب[6] تا بہ فتنہ چونک پڑے تیرے عہد میں — اِک میرا بخت تھا کہ وہ بیدار کم ہوا

کچھ قیس اور میں ہی نہیں سب کے سب موے — اچھا تو دردِ عشق کا بیمار کم ہوا

ذکرِ بُتاں سے پہلی سی نفرت نہیں رہی
کچھ اب تو کفرِ مومنِ دیندار کم ہوا

۹

گر غیر کے گھر سے نہ دل آرام نکلتا — دم کاہے کو یوں اے دلِ ناکام نکلتا

میں وہم[7] سے مرتا ہوں ہاں رُعب سے اسکے — قاصد کی زباں سے نہیں پیغام نکلتا

---

[1] اگر میری زندگی میں رقیبوں کی محبّت کا ہنگامہ کم ہوتا تو مَیں صدمۂ رشک سے کاہے کو مرتا۔

[2] غزال چشم = آہو چشم (حسین) شاعر خود گرفتار ہونے کی عوض خوش چشموں کو اپنے دام میں پھانستا رہا اور اسی لیے اپنے کو صیّاد کہتا ہے۔ [3] مومن ناکامیوں کے مصائب کا شکوہ سنج ہے یعنی پہلے تو حسرت بوسہ کی کاہش تھی۔ جب بوسہ ملا تو لبِ یار میں وہ لذت باقی نہ رہی۔ غرض دونوں طرح ناکامی ہے۔ قاعدہ ہے کہ حصول شے کے بعد اُس شے میں پہلی سی کشش نہیں رہتی۔

[4] اضطراب سے مقصود یہ تھا کہ دوست متوجہ ہو اور اُسکے جمود میں کمی ہو۔ میں نے اپنے مقدور بھر اضطراب میں کمی نہ کی لیکن اُسکا تغافل بدستور رہا۔ کاش وہ میرے اضطراب سے برہم ہوکر مجھ پر ظلم ہی کرتا اور عہد تغافل توڑتا۔

[5] جب تک میرے دم میں دم رہا نالہ ہائے عزا بار کھینچتا رہا۔ عزا بار = غم انگیز۔ [6] فتنہ کا چونک پڑنا = فتنہ برپا ہونا۔ کم ہوا۔ یہاں نہیں ہوا کے مترادف ہے۔ [7] قاصد دوست کے رعب سے میرا پیغام ادا کرنے سے قاصر ہے مگر مجھے یہ وہم ہے کہ کہیں یہ بھی اُس پر عاشق نہ ہوگیا ہو جس کی وجہ سے یہ محویت ہے۔

کرتے جو مجھے یاد شبِ وصلِ عدو تم | کیا صبح کہ خورشید نہ تا شام نکلتا

جب جانتے تاثیر کہ دشمن بھی وہاں سے | اپنی طرح اے گردشِ ایام نکلتا

ہر ایک سے اُس بزم میں شب پوچھتے تھے نام | تھا لطف جو کوئی مرا ہمنام نکلتا

کیوں کام طلب ہے مرے آزار سے گردوں | ناکام سے دیکھا ہے کہیں کام نکلتا

تھی نوحہ زنی دل کی جنازے پہ ضروری | شاید کہ وہ گھبرا کے سرِ بام نکلتا

کانٹا سا کھٹکتا ہے کلیجے میں غمِ ہجر | یہ خار نہیں دل سے گلِ اندام نکلتا

حوریں نہیں مومن کے نصیبوں میں جو توہیں | بتخانے ہی سے کیوں یہ بدانجام نکلتا

۱۰

وصل کی شب شام سے میں سو گیا | جاگنا ہجراں کا بلا ہو گیا

دل نہ پھرا جان ہی ٹھہرے خدا | یہ تو نجانے کہیں وہ تو گیا

آئینہ جلدی سے پٹک دو کہیں | دل ہی نہیں ہاتھ سے کھو گیا

ہوں میں سیہ روز کہ وہ شمع رو | شام کو آیا تھا سحر کو گیا

طالعِ برگشتہ مرے کیا پھریں | مُلکِ عدم سے نہ پھرا جو گیا

ساتھ نہ چلنے کا بہانہ تو دیکھ | آ کے مری نعش پہ وہ رو گیا

---

۱ میں اس قدر سیاہ روز ہوں کہ اگر تم مجھے شبِ وصلِ عدو میں یاد کرتے تو میری نحوست کے اثر سے شام تک سورج نہ نکلتا اور اس سے تمہارا فائدہ تھا کہ شبِ وصل دراز ہو جاتی - ۲ اپنی طرح = ہماری طرح - انقلاب زمانہ کا اقتضا یہ تھا کہ ہماری طرح رقیب کی حالت میں بھی تغیر ہوتا - ۳ آسمان مجھے آزار پہنچا کر اپنی مقصد برآری چاہتا ہے کیونکہ میرا آزار ہی اُس کا مقصد ہے - لیکن میں ٹھہرا ناکام - اور ناکام سے کسی کا کام نکلنا معلوم - ۴ جب بتخانہ ہی [illegible] تو اس بد انجام کو حوریں ملنی تھیں - ۵ [illegible] نہیں = ورنہ [illegible] دل ہی ہاتھ سے جاتا رہیگا اور تم خود اپنی صورت پہ فریفتہ ہو جاؤ گے - ۶ معشوق کا صبح کو جدا ہونا عاشق کی سیاہ روزی (نحوست) ہے - شاعر نے یہاں سیاہ روز اور شمع رو کے لفظوں سے خاص فائدہ لیا ہے - ۷ دوست نے میری میت کے ساتھ نہ چلنے کا یہ عذر نکالا کہ آ کر نعش پر بناوٹ سے رو گیا - لوگ یہ سمجھے کہ عدم مشایعت جنازہ کی تلافی ہو گئی یا یہ کہ اس کو اس قدر عاشق کے مرنے کا غم ہے - اسلئے گورستان تک زحمت کرنا مشکل ہو گا - اس میں مومن کی آشنا و خیال سے مناسبت رکھنے والا یہ نکتہ خاص طور پر مضمر ہے کہ مذہباً رونے والوں کو مشایعت جنازہ سے روکنے کا حکم ہے -

شوخیِ قاتل کے میں قربان ہوں — کہتے رہے سب[1] یہ گیا وہ گیا

صبر[2] نہیں شام فراق آچکو — جس سے کہ بیزار تھے تم سو گیا

شکر[3] اثر تھا گلۂ دشمناں — نالہ مرے کام سے یارو گیا

زلف کی بو آئے گی ہم کو اگر — مگر — غیر کے گھر دستۂ شبّو گیا

ہائے صنم ہائے صنم لب پہ کیوں

خیر ہے مومن تمہیں کیا ہو گیا

۱۱

ڈر تو مجھے کس کا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا — پر حال یہ افشا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

ناصح یہ گلہ کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا — تو کب مری سنتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

میں بولوں تو چپ[1] ہوتے ہیں اب آپ جبھی تک — یہ رنجش بیجا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

کچھ غیر سے ہونٹوں میں کہے ہے یہ جو پوچھو — تو وہیں مکرتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

کب پاس بھٹکنے دوں رقیبوں کو تمہارے — پر پاس تمہارا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

ناصح کو جو چاہوں تو ابھی ٹھیک بنا دوں — پر خوف خدا کا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

کیا کیا نہ کہے غیر کی گر بات نہ پوچھو — یہ حوصلہ میرا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

کیا کہئے نصیبوں کو کہ اغیار کا شکوہ — سن سن کے وہ چپکا[2] ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

مت پوچھ کہ کس واسطے چپ لگ گئی ظالم — بس کیا کہوں میں کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

---

[1] یعنی قاتل دیکھتے دیکھتے نظر سے غائب ہو گیا۔ "وہ" مومن کے زمانے میں "وو" (دو واؤ کے ساتھ) بھی لکھا جاتا تھا اسی لیے قافیہ میں استعمال کیا۔ [2] جس (صبر) سے تم بیزار تھے وہ گیا۔ اب آنے میں کیا عذر ہے معشوق کی ادائیں چونکہ صبر کی دشمن ہیں اسلیے بیزاری سے تعبیر کیا۔ مراد یہ ہے کہ اب صبر باقی نہیں رہا۔ ممکن ہے کہ صبر کی جگہ ہوش ہو جس سے مطلب زیادہ صاف ہو جاتا ہے۔ [3] میرے رقیبوں کی شکایت کے طور پر نالہ کیا مگر الٹا اثر ہوا۔ گویا ہر اگلہ نہ ہوا شکر ہو گیا۔

[1] میں بولوں گا تو آپ ابھی چپ (قائل) ہو جائیں گے اور رنجش بیجا رفع ہو جائے گی۔

[2] یعنی دوست کی خاموشی سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ میں اس معاملہ میں دخل نہیں دیتا۔ اور اسی کی عاشق کو شکایت ہے

چھپکے سے ترے ملنے کا گھر والوں میں تیرے
اس واسطے چرچا ہے کہ مَیں کچھ نہیں کہتا

ہاں تنگ دہانی کا نہ کرنے کے لیے بات
ہے عذر پر ایسا ہے کہ مَیں کچھ نہیں کہتا

اے چارہ گرو قابلِ درماں نہیں یہ درد
ورنہ مجھے سودا ہے کہ مَیں کچھ نہیں کہتا

ہر وقت ہے دشنام ہر اِک بات میں طعنہ
پھر اس پہ بھی کہتا ہے کہ مَیں کچھ نہیں کہتا

کچھ سُن نہ سکے جو مَیں چُپ ہوں تو تم کہتے ہو بولو
سمجھو تو یہ تھوڑا ہے کہ مَیں کچھ نہیں کہتا

سُنتا نہیں وہ ورنہ یہ سرگوشیِ اَغیار
کیا مجھکو گوارا ہے کہ مَیں کچھ نہیں کہتا

مومن بخدا سحر بیانی کا جبھی تک
ہر ایک کو دعویٰ ہے کہ مَیں کچھ نہیں کہتا

۱۲

رات کِس کِس طرح کہا نہ رہا
نہ رہا پر وہ مہ لقا نہ رہا

غیر آکر قریب خانہ رہا
شوق اب تیرے آنے کا نہ رہا

تیرے پردہ نے کی یہ پردہ دری
تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا

غم مِرا کِس لیے کہ دُنیا میں
نہ رہا مَیں مِرا فسانہ رہا

تیری اور میری مخفی ملاقات کا چرچا اسلیے ہو رہا ہے کہ مجھے لب کشائی کی اجازت نہیں - اگر مَیں تردید کے لیے زبان کھولوں تو پھر لوگوں کو بدنام کرنے کا حوصلہ نہ ہو۔ اُن کو بات نہ کرنے کے لیے تنگ دہانی کا ایسا عذر ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ یعنی قابل قبول نہیں - مَیں اظہار درد سے اسلیے خاموش ہوں کہ اُس کو قابل علاج نہیں سمجھتا۔ تمھاری ناروا باتیں سُنکر میرا خاموش رہنا ہی غنیمت ہے۔ اگر جواب دوں تو اور تمھاری برہمی کا باعث ہو۔ سرگوشی اغیار سے دوست کو منع کرنا اسلیے بیکار سمجھتا ہوں کہ وہ میری سُنتا ہی نہیں -

رقیب میرے مکان کے قریب آکر رہا۔ اب تیرے آنے کا مجھکو ارمان نہیں کیونکہ میری ملاقات کے ساتھ تجھکو رقیب کی ملاقات کے موقعے بھی پیدا ہو جائیں گے۔ تو مجھ سے چھپا مگر اس سے رازِ محبت اور کھل گیا اور لوگ تاڑ گئے کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

مدعا[۳] غیر سے کہا تا وہ	سمجھے اب کچھ بھی مدعا نہ رہا
کس[۴] کی زلفوں کا دھیان تھا کہ میں شب	محو دودِ چراغ خانہ رہا
غیر[۵] چھڑکے ہے زخمِ دل پہ نمک	شورِ اُلفت میں بھی مزا نہ رہا
پہنچے[۶] وہ لوگ رُتبہ کو کہ مجھے	شکوۂ بختِ نارسا نہ رہا
تلخکامی[۷] نصیب اعدا حیف	جب کہ وہ اپنے کام کا نہ رہا
دل لگانے کے تو اُٹھائے مزے	جی بلا سے رہا رہا نہ رہا
تو فلک مرگ ہم سے سب غافل	اب کسی کا بھی آسرا نہ رہا

مومن اُس بت کے نیم ناز ہی میں
تم کو دعوائے اتقا نہ رہا

۱۴

ٹانکنے چاک گریباں کو تو ہر بار لگا	ہاتھ کٹواؤں جو ناصح رہے اب تار لگا
بسکہ اِک پردہ نشیں سے دلِ بیمار لگا	جو مریضوں[۱۰] سے چھپاتے ہیں وہ آزار لگا
جذبۂ[۱۱] دل کو نہ چھاتی سے لگاؤں کیونکر	آپ وہ میرے گلے دوڑ کے اکبار لگا
شوخ[۱۲] تھا رنگ حنا میرے لہو سے سو ہے	قتل اغیار سے کیا ہاتھ ترے یار لگا

[۳] آدمی کو جب خیال ہوتا ہے کہ حصول مدعا اب بالکل مایوسی ہے تو ایسی حالت میں دشمن سے بھی مدعا دل کہہ گذرتا ہے۔ عاشق نے مکر سے مدعا دل رقیب سے کہدیا تاکہ وہ سمجھے کہ اب یہ مدعا سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے اور یہ سمجھکر اُس (عاشق) کی مخالفت چھوڑ دے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ "وہ" سے معشوق مراد ہو۔ [۴] زلف کی مشابہت دود چراغ سے ظاہر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رات بھر دھیان میں جاگتا رہا اور دود چراغ کو دیکھتا رہا۔ یہ شغل بیکاری سمجھو یا محویت۔ بہت نیچرل ہے۔ [۵] شور الفت کا مزا جب تھا کہ دوست زخم دل پر نمک چھڑکتا نہ کہ رقیب۔ نمک شور اور مزہ کی رعایت ظاہر ہے۔ [۶] پہلے مجھے اپنے بخت نارسا سے شکوہ تھا۔ مگر اب ایسے ایسے فرومایہ لوگ عروج کو پہنچ گئے کہ مجھے نصیب کی شکایت نہیں رہی۔ کیونکہ انکی برابری کرنا میرے لیے باعث ننگ ہے۔ [۷] افسوس جب معشوق مجھ سے ملتفت نہیں رہا تو اغیار کو محرومی نصیب ہوئی۔ اب ہوئی بھی تو میرے کس کام کی۔ [۱۰] لوگ مہلک مرض کو مریض پر ظاہر نہیں کیا کرتے۔ پردہ نشین سے دل لگا یا تو مرض بھی ایسا لگا جسکو سب مجھ سے چھپاتے ہیں۔ [۱۱] کیونکہ اسی جذبۂ دل کی بدولت دوست گلے لگا۔ [۱۲] یعنی اغیار کے لہو میں یہ شوخی کہاں۔ عاشق کا جذبۂ رشک رقیبوں کے قتل پر بھی بھڑک اُٹھتا ہے۔ رنگ حنا کی وجہ ہاتھ لگا میں مناسبت پیدا

تو کسی کا بھی خریدار نہیں پر ظالم
سر فروشوں کا ترے کوچہ میں بازار لگا

دُر و یاقوت کی پھر غیر پہ فرمایش ہے
جوہری کی تو دُکانِ چشمِ گہربار لگا

یاد آئی مجھے ناصح کی زباں کی تیزی
دیکھ اغوائے رقیباں سے نہ تلوار لگا

منہ میں کیسا خمِ صہبا کے بھر آیا پانی
تیرے لب سے جو لبِ ساغرِ سرشار لگا

ق
ناگہاں نعش پہ عاشق کی دمِ نوحہ گری
کوئی مذکور ترا کرنے ستمگار لگا

دیکھ تو حسرتِ دیدار پسِ مردن بھی
آنکھیں وہ کھول کے تکنے در و دیوار لگا

کعبہ سے جانبِ بتخانہ پھر آیا مومن
کیا کرے جی نہ کسی طرح سے زنہار لگا

۱۴

شبِ غمِ فرقت ہمیں کیا کیا مزے دکھلائے تھا
دم رُکے تھا سینے میں کمبخت جی گھبرائے تھا

یا تو دم دیتا تھا وہ یا نامہ بر بہکائے تھا
خط غلط پیغام سارے کون یاں تک آئے تھا

بل بے عیاری عدو کے آگے وہ پیماں شکن
وعدۂ وصل آج پھر کرتا تھا اور شرمائے تھا

سُن کے میری مرگ بولے مر گیا اچھا ہوا
کیا بُرا لگتا تھا جس دم سامنے آ جائے تھا

یار و دشمن راہ میں کل دیکھنا کیونکر ملے
وہ اُدھر کو جائے تھا اور یہ اِدھر کو آئے تھا

اے موتی برسانے والی آنکھ جوہری کی دکان لگا یعنی اس قدر رو کہ موتیوں کی دکان لگ جائے اور تیرے اشکوں کی گوہر افشانی دُر و یاقوت کی قدر و قیمت معشوق کی نظر سے گرا دے۔

عاشق کو اپنے قتل سے صرف اس بنا پر گریز ہے کہ معشوق رقیبوں کے بہکانے سے آمادۂ قتل ہے۔ اس لیے کہتا ہے کہ دیکھ ایسا نہ کر۔ مجھے تیری تلوار دیکھ کر ناصح کی تیزیٔ زبان یاد آتی ہے کہ وہ بھی مجھے نصیحت کرتا تھا اور سختی کے ساتھ معشوقوں کی اور عشق کی مذمت کرتا تھا۔

خمِ شراب کو یہ حسرت ہوئی کہ اسے ساغر کی طرح تیرے لب تک رسائی نہیں۔

وہ وعدہ خلاف جو ایک بار وعدہ خلافی کر چکا تھا آج پھر شرم سے وعدۂ وصل کرتا تھا اور خجل ہوا جاتا تھا اس میں عیاری یہ تھی کہ میں سمجھوں کہ پچھلی پیماں شکنی پر شرمندہ ہے اور عدو سمجھے کہ عاشق سے وعدہ کرتے شرماتا ہے۔

یار رقیب کے گھر جاتا تھا اور رقیب یار کے یہاں۔ دونوں ملاقات تھی آگے راہ میں ملاقات ہو گئی۔

بات شب کو اُس سے منعِ بیقراری پر بڑھی
ہم تو سمجھے اور کچھ وہ اور کچھ سمجھائے تھا

کوئی دن تو اس پہ کیا تصویر کا عالم رہا
ہر کوئی حیرت کا پُتلا دیکھکر بنجائے تھا

سوئے صحرا لے چلے اُس کو سے میری نعش ہائے
تھا یہی ڈر ان دنوں تلوا مرا کھجلائے تھا

ناز شوخی دیکھنا وقتِ تظلّم دمبدم
مجھسے وہ عذرِ جفا کرتا تھا اور جھنجلائے تھا

ہو گئی دو روز کی الفت میں کیا حالت ابھی
مومنِ وحشی کو دیکھا اس طرف سے جائے تھا

۱۸

ہماری جان شب تجھ بن دلِ ناکام لیتا تھا
خدنگِ آہ سے تیرِ قضا کا کام لیتا تھا

یہی حالت رہی آٹھوں پہر تجھ بن کہ دم اُلٹے
سحر تک شام سے دل صبح سے تا شام لیتا تھا

عبث الفت بڑھی تم کو وہ کب دیتا تھا دم تم پر
یہ مجھکو دیکھکر دشمن کلیجا تھام لیتا تھا

چُھٹایا کیوں مرا واں رات دن مینا بہم پھرنا
بتا تو کیا ترا میں گردشِ ایام لیتا تھا

نہ کانٹوں پر کوئی یوں لوٹے جوں میں بستر گل پر
ترے بن کروٹیں شب لے سمن اندام لیتا تھا

رقیبوں پر ہوئی کیا آج فرمائش جواہر کی
کہ ہیرا عاشقِ خطِ زمرد فام لیتا تھا

سحر تک شام سے تجھ بن یہی حالت رکھی دل نے
نہ مجھکو چین دیتا تھا نہ آپ آرام لیتا تھا

محبوب نے تو ان کو بیقراری سے اس لیے منع کیا کہ ان کا اضطراب اُسکے برہمیِ مزاج کا موجب تھا مگر یہ حضرت سمجھے کہ ہماری بیقراری کی تاثیر سے وہ مائل التفات ہوا ہے اور ہمدردی کی بنا پر منع کرتا ہے۔ اس لیے اور بیقراری دکھانے لگے۔ آخر کو بات بڑھ گئی۔ تلوا کھجلانا سفر کی علامت یا شگون سمجھا جاتا ہے۔ زندگی میں تو عاشق کے لیے کوئے یار سے سفر کرنے کا کیا امکان ہو سکتا تھا۔ جب مر کر وہاں سے نعش نکلی تو اس شگون کی تصدیق ہوگئی۔ تظلم = فریاد کرنا۔

اُلٹے دم لینا علامات نزع میں سے ہے۔ کلیجا تھام لینے کا سبب تمھاری محبت کا اظہار نہ تھا بلکہ میرے حالِ زار پر اظہارِ تاسف۔ یعنی میری حالت پر رقیب کو بھی رحم آتا تھا۔ خطِ زمرد فام کا عاشق اس رشک کے باعث خودکشی کی غرض سے ہیرا لیتا تھا۔

نہ مانوں[18] گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا
کہ ہر ہر بات میں ناصح تمھارا نام لیتا تھا

میں اُس کی بزم مے میں زہر پی کیونکر نہ مرجاتا
کہ میرے سامنے اُس لب کے بوسے جام لیتا تھا

اگر مومن[19] ہی ہو مومن وہ لے میں تو نہ مانونگا
جو عہدِ دوستی وہ دشمنِ اسلام لیتا تھا

۱۶ ہی

وقت[20] جوشِ بحر گریہ میں جو گرم نالہ تھا
حلقۂ گرداب رشکِ شعلۂ جوّالہ تھا

آگ[21] کیا ہم کو لگائی ابر نے تیرے بغیر
وقت بارش اخگرِ خورشید تف ہر ژالہ تھا

اس[22] لبِ نازک کو برگِ گل سے دیتے ہیں مثال
ہونٹ برگِ لالہ تھے اور نیل داغِ لالہ تھا

اِک نگاہ[23] سرسری دیوانہ ہم کو کر گئی
گردشِ چشمِ پر یرد ساحرِ بنگالہ تھا

دیکھکر یہ مجمع اُمڈا کیا ہی ابرِ اشک آہ
حلقۂ[24] اغیار اس کے گرد مہ کا ہالہ تھا

آبلے[25] کیونکر نہ نکلیں جائے اشک آنکھوں سے آہ
میرے پہلو میں ابھی وہ آگ کا پرکالہ تھا

---

[18] میری نصیحت سُننے سے تم بدگمان نہ ہو۔ میں نے ناصح کی باتیں صرف اس لیے سُن لیں کہ وہ دورانِ گفتگو میں بار بار تمھارا نام لیتا تھا۔ ورنہ میں اُس کی نصیحت ماننے اور ترک عشق کرنے سے رہا۔

[19] جب اُس دشمنِ اسلام (معشوق) نے مومن سے عہد دوستی لیا تو مجھے مومن کے مومن (ایمان دار) ماننے میں بھی تأمل ہے۔

[20] ایک طرف میرے اشکوں کی طغیانی تھی اور دوسری طرف نالوں کی شرر فشانی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دریائے اشک کا گرداب شعلۂ جوّالہ کو مات کرنے لگا۔ شعلۂ جوّالہ = چکر کھانے والا شعلہ بنیٹی۔

[21] اخگر خورشید تف = وہ انگارا جس میں سورج کی سی حرارت ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تیرے ہجر میں بارش کے اولے بھی انگارے معلوم ہوتے تھے۔ [22] معشوق کو اپنے لبِ نازک کی تشبیہ برگ گل سے اس قدر ناگوار ہوئی کہ غصہ میں لب برگ لالہ کی طرح سُرخ اور لب کا نیل (جو غصہ میں ہونٹ چبانے سے پڑ گیا تھا) داغ لالہ کی مانند نیلا پڑ گیا۔ گویا اس طریقہ سے تشبیہ صادق آگئی۔ [23] مشہور ہے کہ بنگالے کے جادوگر آدمی کو دیوانہ کر دیتے ہیں۔ دراصل ساحر بنگالہ تھا جو گردشِ چشم پر یرو کے بھیس میں اپنا کام کر گیا۔ [24] چاند کے گرد ہالے کا نمایاں ہونا بارش ہونے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ [25] معشوق کو پرکالۂ آتش کہا ہے اور اسی مناسبت سے اُسکی جدائی میں اشک کے بدلے آنکھوں سے آبلے نکلتے ہیں۔

شورِ الفت نے کیا کیا بے مزہ جلاد کو
گرم خونی سے لبِ شمشیر پہ تبخالہ تھا

آہ پُر دود اپنی کب زیبِ فلک تھی رات کو
دیدۂ مہتاب میں سرمہ کا یہ دنبالہ تھا

مومنِ عاشق طبیعت نوجوان ہی مرگیا
عشق طفلِ چند سالہ دشمنِ صد سالہ تھا

۱۷

میرے کوچے میں عدو مضطر و ناشاد رہا
شب خدا جانے کہاں وہ ستم ایجاد رہا

اُس روانی سے ذرا خنجرِ بیداد رہا
بارے اک دم اثرِ نالہ و فریاد رہا

بیکسی نے نہ دیا ہائے تہِ خاک بھی چین
تا قیامت المِ گریۂ جلاد رہا

نقدِ جاں تھا نہ سزائے دیتِ عاشق حیف
خونِ فرہاد سرِ گردنِ فرہاد رہا

لذتِ جور سے دم لینے کی فرصت نہ رہی
کیا اثر منتظرِ دعوتِ فریاد رہا

تب خالہ = آبلہ جو گرمی کی وجہ سے ہونٹ پر پڑ جاتا ہے۔ عاشق کی خون کی حدت سے لبِ تیغ پر چھالا پڑ گیا اور اُسکے شورِ الفت سے قاتل بے مزہ (مکدر) ہوا۔ شور اور مزہ کی رعایت اوپر بیان ہو چکی۔ قاعدہ ہے کہ کھاری چیز آبلہ پر ناگوار محسوس ہوتی ہے۔ یہاں شورِ الفت سے سوزِ الفت زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

دشمن صد سالہ = پُرانا دشمن جو زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ معشوق نے عدو (رقیب) کے سوا کسی تیسرے شخص سے رسم پیدا کی۔ گویا وہ رقیب سے بھی وفادار نہیں۔

بارے میری فریاد میں اتنا اثر تو ہوا (اگرچہ دم بھر کے لیے ہوا) کہ خنجرِ قاتل ذرا روانی سے رُک گیا۔ شاعر کو اپنی بیکسی سے شکایت ہے کہ وقتِ قتل بیکسی کو دیکھکر قاتل کو بھی رونا آگیا اور قاتل کی تکلیف کے خیال نے شاعر کو قبر میں بھی مضطرب رکھا۔

دیت = خون بہا یعنی وہ روپیہ جو قاتل سے ورثۂ مقتول کو دلایا جائے۔ سزائے دیت = دیت کے لائق۔ فرہاد نے عشق میں اپنی جان دی جسکے صدمہ سے شیریں نے اپنے آپ کو ہلاک کیا۔ مومن کا مطلب یہ ہے کہ حُسن کو ہر حال میں عشق پر ترجیح ہے۔ شیریں کا نقدِ جان اتنا گراں بہا تھا کہ عاشق کے بے حقیقت خون کی قیمت نہیں ہو سکتا تھا اس لیے فرہاد کا خون فرہاد کی گردن پر رہا اور وہی قصوروار ٹھہرا۔ دوسرے معنی یوں ہو سکتے ہیں کہ فرہاد کی دو حیثیتیں مانی جائیں ایک عاشق کی حیثیت جو ہلاک ہوا دوسری قاتل کی اس لیے کہ اُس نے خودکشی کی۔ مراد یہ ہے کہ بہ حیثیت قاتل اُس پر خون بہا واجب تھا جس کی مستحق اُس کے جان و دل کی مالک یعنی شیریں تھی۔ چنانچہ اُس نے شیریں کو اپنا نقدِ جان پیش کیا جو بلحاظِ عظمت مرتبۂ عشق دیتِ عاشق کے قابل نہ تھا۔ اس واسطے خونِ فرہاد کا مواخذہ فرہاد ہی کے ذمہ رہا کیونکہ خون بہا ناکافی تھا۔ مگر اس معنی میں تکلف زیادہ ہے۔

اثر کس قدر میری فریاد کی دعوت کا منتظر رہا مگر اس کا کیا علاج کہ میں نے فریاد ہی نہیں کی اور ستمِ یار کی لذت میں اتنا محو رہا کہ دم لینے کی بھی مہلت نہ ملی۔

یاد ۵۶ سہواً اُسے اے خیر ہے نسیاں عمداً
یاد رکھ بھول گیا جس کو وہی یاد رہا

سر پٹکنے نے مرے سنگِ در اسکا توڑا
یہی سودا ہے تو گھر کا ہے کو آباد رہا

کُرّہ ۵۷ خاک ہے گردش میں طپش سے میری
مَیں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا

چھوٹنا ۵۸ دامِ شکستہ سے بھی آساں نہیں
میں گرفتارِ خمِ گیسوئے صیّاد رہا

لیجلا جوشِ جنوں جانبِ صحرا افسوس
جب مرے کوچے میں آ کر وہ پریزاد رہا

کہ غمِ خور گہے عشقِ بُتاں اے مومن
مَیں سدا سوختۂ حُسنِ خُداداد رہا

۱۸

مَیں نے تم کو دل دیا تم نے مجھے رسوا کیا
مَیں نے تم سے کیا کیا اور تم نے مجھ سے کیا کیا

کشتۂ نازِ بتاں روزِ ازل سے ہوں مجھے
جان کھونے کے لیے اللہ نے پیدا کیا

روز کہتا تھا کہیں مرتا نہیں ہم مر گئے
اب تو خوش ہو بیوفا تیرا ہی لے کہنا کیا

سر سے شعلے اُٹھتے ہیں آنکھوں سے دریا جاری ہے
شمع سے یہ کس نے ذکرِ اُس محفل آرا کا کیا

روئیے کیا بختِ خفتہ کو کہ آدھی رات سے
مَیں یہاں رو یا کیا اور وہ وہاں سویا کیا

آتشِ اُلفت بجھادی داغہائے رشک نے
مدعی کی گرمیِ صحبت نے جی ٹھنڈا کیا

آنکھ عاشق کی کوئی پھرتی ہے اے عُذرِ خطا ۵۹
دیکھ لے مَیں مرتے مرتے سوئے در دیکھا کیا

۵۶ معشوق کی عادت ہے کہ کسی کو فراموش کرتا ہے تو بالقصد۔ اور اگر کسی کو یاد کرتا ہے تو بھولے سے۔ اس بنا پر مجھے رقیب پر ترجیح حاصل ہے کہ میں اُس کی یاد میں موجود ہوں یعنی اُسنے مجھے بالارادہ بُھلا رکھا ہے۔ ۵۷ مجھے حالت اسیری میں بھی آزادی میسر ہے اس واسطے کہ جب مَیں زنداں میں تڑپتا ہوں تو میری تپش کے اثر سے تمام کرۂ زمین گردش کرنے لگتا ہے اور اُس کے ساتھ میں بھی گردش کرتا ہوں۔ اب آزادی کے لئے اور کیا چاہئے۔ ۵۸ گیسو کو خم (شکن) کے اعتبار سے دامِ شکستہ قرار دیا ہے۔

دلبروں[1] میں بیوفا میری وفا کی دھوم ہے	بوالہوس سے کیوں کہا تھا راز جو افشا کیا
چارہ[2] گر کعبے میں اسکے آستاں سے لے گئے	ایک بھی میری نہ مانی لاکھ سر پٹکا کیا
غیر[3] کا اور آپ کا گر دل نہیں ہے ایک تو	کیوں ترے دل میں مری یاد آنے کا چرچا کیا
کیا[4] خلش تھی رات دل میں آرزوئے قتل کی	ناخنِ شمشیر سے میں سینہ کھجلایا کیا
کیا خجل ہوں اب علاجِ بیقراری کیا کروں	وہ[5] دھر دیا ہاتھ اُسنے دل پر تو بھی دل دھڑکا کیا

زنداں

عرضِ[6] ایماں سے ضد اُس غارتگرِ دیں کو بڑھی
تجھسے اے مومن خدا سمجھے یہ تو نے کیا کیا

۱۹ تمنّے

کسی کا ہوا آج کل تھا کسی کا	نہ[1] ہے تو کسی کا نہ ہوگا کسی کا
کیا[2] اُس نے قتلِ جہاں اک نظر میں	کسی نے نہ دیکھا تماشا کسی کا
نہ[3] میری سُنے وہ نہ مَیں ناصحوں کی	نہیں مانتا کوئی کہنا کسی کا
مجھے[4] مار ڈالا ہے انکار نے پھر	نہ کہنا کہ کیا مجھ پہ دعویٰ کسی کا
جو پھر جائے اُس بیوفا سے تو جانوں	کہ دل پر نہیں زور چلتا کسی کا

[1] معشوق کو یہ گوارا نہیں کہ حسینوں میں عاشق کی وفا کی تعریف ہو۔ اسکے اس ذہنیت سے عاشق یوں فائدہ اُٹھاتا ہے کہ تم نے رقیب سے میرا رازِ محبت کیوں کہدیا جو افشا ہوگیا اور حسینوں میں چرچا ہونے لگا کہ مومن انتہا کا وفا پرست ہے جو ایسے (ظالم) سے عہد وفا نبا ہتا ہے۔ اس اشتعال کا نتیجہ لامحالہ یہ ہوگا کہ آئندہ وہ رقیب سے راز ظاہر نہ کریگا جس میں مومن کا سراسر فائدہ ہے۔ [2] مجنوں کو اُس کا باپ دعا کی غرض سے کعبے کو لے گیا تھا کہ اسکی برکت سے جنون دور ہو جائے۔ غالباً اس شعر کا محرک یہی واقعہ ہے۔ [3] معشوق کے دل میں عاشق کی یاد آئی۔ غیر کو کسی طرح خبر ہوگئی۔ اور اُسنے سب میں چرچا کردیا عاشق کہتا ہے کہ تیرا اور اُس کا دل ایک ہے ورنہ تیرے دل کی بات اُسے کیسے معلوم ہوگئی۔ اِدّعا ہے مگر دلوں کے ایک ہونے کا طرز بہت پُرلطف ہے۔ آپ کا اور تیرا میں شترگربہ کا عیب آگیا۔ [4] جب کسی عضو میں خلش (چبھن) ہوتی ہے تو آدمی ناخن سے کام لیتا ہے۔ [5] پہلے تو دل صدمۂ فرقت کی وجہ سے دھڑکتا تھا۔ اب جوشِ مسرت کے باعث دھڑکنے لگا۔ [6] عرض = ظاہر کرنا۔

[1] جس کا تو کل دوست تھا اُس کا آج نہیں اور جس کا آج ہوا کل نہ ہوگا۔ دوستی میں تیرا تلوّن اس امر کی دلیل ہے کہ تو اصلاً کسی کا بھی دوست نہیں۔ [2] یعنی سب ایک ساتھ ہلاک ہوگئے عاشق کو قتلِ جہاں کا اس قدر خیال نہیں جس قدر اس امر کا کہ قاتل کو سفاکی کی اچھی طرح داد نہ ملی۔ [3] مصرعِ ثانی دعویٰ ہے اور مصرعِ اول دلیل ہے جس میں حضرتِ معشوق کی اور اپنی دو مثالوں کی بنا پر کلیہ قائم کردیا ہے۔ یہ استدلال منطقی نہ سہی شاعرانہ ضرور ہے۔ [4] معشوق نے یہ کہا کہ کیا مجھ پہ دعویٰ کسی کا اُسکے اس انکارِ محبت نے عاشق کو مار ڈالا۔ اب عاشق کہتا کہ دوبارہ انکار نہ کرنا اسلئے کہ وجہ دعویٰ (یعنی قتل) پیدا ہوگئی جب تھی ہی اب ہی۔

صبا نکہتِ یار لائی کہاں سے
نہیں دخل اس کو میں اصلا کسی کا

وہ کرتے ہیں بیباک عاشق کشی یوں
نہیں کوئی دنیا میں گویا[۵] کسی کا

کوئی کیا کرے آپ ہرجائی ہو تم
نہیں میری جاں شکوہ بیجا کسی کا

دمِ[۶] الحذر اور عشقِ بتاں سے
تجھے ڈر ہے اے مومن ایسا کسی کا

۲۱:

محشر[۱] میں پاس کیوں دمِ فریاد آگیا
رحم اس نے کب کیا تھا کہ اب یاد آگیا

الجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

ناکامیوں[۲] میں تم نے جو تشبیہ مجھ سے دی
شیریں کو دردِ تلخیٔ فرہاد آگیا

ہم[۳] چارہ گر کو یوں ہی پنہائیں گے بیڑیاں
قابو میں اپنے گر وہ پریزاد آگیا

دل[۴] کو قلق ہے ترکِ محبت کے بعد بھی
اب آسماں کو شیوۂ بیداد آگیا

۵ گویا دنیا میں کوئی خونِ عاشق کا دادخواہ نہیں۔ ۶ حذر = ڈر۔ الحذر = الاماں۔ مطلب یہ ہے کہ جب عاشق نے عشق جیسی خطرناک چیز کو انگیز کر لیا تو اب کیا چیز رہی جس کا ڈر ہو۔

۱ محشر میں عاشق فریاد کرنے والا تھا کہ پاسِ معشوق سے رک گیا۔ اب اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ معشوق نے دنیا میں کبھی رحم کیا ہوتا تو وہ رحم اس وقت یاد آکر مانعِ فریاد ہوتا۔ مگر جب ہمیشہ ظلم ہی کیے تو فریاد سے باز رہنے کی کیا وجہ۔ ۲ میں ناکامی میں ضرب المثل ہوں۔ چنانچہ جب تم نے ناکامی کے اعتبار سے فرہاد کو مجھ سے تشبیہ دی تو شیریں کو بھی فرہاد کی مصیبت پر ترس آگیا کہ اب غریب (فرہاد) کی تلخی اس درجہ کو پہنچ گئی۔ اس میں یہ نکتہ ہے کہ تشبیہ ہمیشہ اعلیٰ سے دیجاتی ہے یعنی میں فرہاد سے بھی ناکامی میں بڑھا ہوا ہوں۔ شیریں اور تلخی میں ایہام تضاد ہے۔ ۳ ہم چارہ گر کو اس لیے بیڑیاں پنہائیں گے کہ وہ خود دیوانہ ہے۔ ورنہ عاشق کو مجنون سمجھ کر قید و بند کا (غلط) علاج کیوں تجویز کرتا۔ یہ مطلب بھی ممکن ہے کہ ہم اس پریزاد کی صورت دکھا کر چارہ گر کو دیوانہ بنائیں گے۔ ۴ جب عہدِ محبت میں قلق ہوتا تھا تو اس (قلق) کی وجہ بیدادِ یار تھی اب ترکِ محبت کے بعد بھی دل کو قلق ہے۔ تو ظاہر ہے کہ معشوق کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتے۔ لامحالہ یہ آسمان کی مشقِ ستم کا نتیجہ ہے جس کو معشوق کی دیکھا دیکھی اب شیوۂ بیداد آگیا ہے

وہ بدگماں ہوا جو کہیں شعر میں مرے — ذکرِ بتانِ خلخ[5] و نوشاد آگیا

تھے[6] بیگناہ جرأتِ پابوس تھی ضرور — کیا کرتے وہم خجلتِ جلاد آگیا

جب ہو چکا یقیں کہ نہیں طاقتِ وصال — دم میں ہمارے وہ ستم ایجاد آگیا

ذکرِ شراب و حور کلامِ خدا میں دیکھ[7] — مومن میں کیا کہوں مجھے کیا یاد آگیا

۲۱

وعدۂ[1] وصلت سے دل ہو شاد کیا — تم سے دشمن کی مبارکباد کیا

کچھ[2] قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی — آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

نالۂ پیہم سے یاں فرصت نہیں — حضرتِ ناصح کریں ارشاد کیا

ہیں اسیر اس کے جو ہے اپنا اسیر — ہم نہ[3] سمجھے صید کیا صیاد کیا

شوخ بازاری تھی شیریں بھی مگر — ورنہ[4] فرقِ خسرو و فرہاد کیا

---

[5] خلخ و نوشاد۔ ترکستان کے دو حُسن خیز شہر ہیں۔ [6] جلاد (معشوق) عاشق کو بےگناہ قتل کر رہا ہے۔ عاشق جرأت کر کے جُرم پابوسی کا مرتکب ہوتا ہے۔ تاکہ جلاد کو قتل کے لیے ایک معقول عذر ہاتھ آجائے اور وہ بے گناہ کُشی کی شرمندگی سے محفوظ رہے۔

[7] دیکھ = دیکھکر۔ یعنی مے و معشوق یاد آگئے۔

[1] دشمن کی مبارکباد اور وہ بھی تم جیسے دشمن کی مبارکباد وجہ اطمینان دل نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اس میں عموماً طنز یا استہزار کا پہلو ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ مجھے تمہارے وعدۂ وصل پر اعتبار نہیں آتا۔

[2] میں ان دنوں قفس سے مانوس سا ہوگیا ہوں جس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ شاید اب میرا آشیاں برباد ہوگیا۔ گویا اُنسِ قفس قدرت کی طرف سے بربادیِ آشیاں کی تلافی ہے۔ [3] جو میری محبت کا پابند ہے میں اسکا غلام ہوں اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتا۔ [4] خسرو (بادشاہ) اور فرہاد (مزدور) میں امتیاز کرنا اور اس وجہ سے ایک کو متمتع اور دوسرے کو محروم رکھنا حُسن بازاری کا شیوہ ہے۔

نشۂ[55] اُلفت سے بھولے یار کو
سچ ہے ایسی بیخودی میں یاد کیا

نالہ اِکدم میں اُڑا دُالے[56] دھوئیں
چرخ کیا اور چرخ کی بنیاد کیا

جب[57] مجھے رنج دل آزاری نہ ہو
بیوفا پھر حاصلِ بیداد کیا

پانوں[58] تک پہنچی وہ زلفِ خم بخم
سرو کو اب باندھئے آزاد کیا

کیا کروں اللہ سب ہیں بے اثر
ولولہ کیا نالہ کیا فریاد کیا

دلربائی[59] زُلفِ جاناں کی نہیں
پیچ و تابِ طرۂ شمشاد کیا

ان[60] نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

روزِ محشر کی توقع[61] ہے عبث
ایسی باتوں سے ہو خاطر شاد کیا

گر بہائے[62] خونِ عاشق ہے وصال
انتقامِ زحمتِ جلاد کیا

بُتکدہ جنّت ہے چلئے بے ہراس
لب پہ مومن ہرچہ[63] بادا باد کیا

[55] اُلفتِ یار کا نشہ اس قدر ہے کہ اس بیخودی میں خود یار کی یاد بھی باقی نہیں۔ [56] دھوئیں اُڑا ڈالنا = برباد کر دینا۔ [57] تُو اس لیے بیداد کرتا ہے کہ مجھے تکلیف ہو اور مَیں اس قدر خوگر بیداد ہو گیا ہوں کہ احساس تکلیف جاتا رہا۔ پھر بیداد سے کیا نتیجہ۔ [58] سرو کو شعرا آزاد باندھتے ہیں۔ یہاں سرو سے قدِ یار مراد ہے مگر چونکہ زلف پاؤں تک پہنچکر زنجیر بن گئی ہے اس لیے اب سرو کو آزاد کہنا غلط ہو گیا۔
[59] طرۂ شمشاد کا پیچ و خم کس کام کا جب اُس میں زلفِ جاناں کی سی دلربائی نہیں۔ [60] آسمان کی ستم ایجادی تو دیکھو کہ مجھے بدنصیب بنایا اور اُس پر مستزاد یہ کہ اختر شناس (منجم) بھی کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اختر شناسی کی بدولت وقت سے پہلے مجھے اپنے مصائب کا علم ہو جاتا ہے جو اور زیادہ موجبِ اذیت ہے۔ واضح رہے کہ مومن اختر شناسی میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ [61] یعنی حشر میں دادرسی کی توقع عبث ہے [62] مانا کہ وصالِ عاشق کا خون بہا قرار دیا گیا۔ مگر قتل میں جلاد (معشوق) کے دست و بازو کو جو زحمت ہوئی اُس کا کیا معاوضہ ہوگا۔ [63] ہرچہ بادا باد اُس موقع پر کہتے ہیں جب انسان ایسے کام میں ہاتھ ڈالے جس میں ہراس ہو۔ مراد یہ ہے کہ بتکدے جانے میں جنت نہ ملنے کا اندیشہ بیکار ہے کیونکہ بتکدہ خود جنت ہے۔ ہراس کا ہے کا۔

دلِ بیتاب کو گر باندھ کر رکھوں نہ ٹھہریگا
سوا[۱] اُس در کی زنجیروں کے یہ مجنوں نہ ٹھہریگا

تپش سے خاک میں بھی عاشقِ مدفوں نہ ٹھہریگا
کہ گنبد قبر کا جوں گنبدِ گردوں نہ ٹھہریگا

نہ ٹھہرا بوسہ تو دینا دلِ مفتوں نہ ٹھہریگا
اگر واں دوں نہ ٹھہریگا تو یاں بھی یوں نہ ٹھہریگا

اگر گردش[۲] یہی ہے مغبچوں کے چشمِ میگوں کی
کفِ ساقی میں جامِ بادۂ گلگوں نہ ٹھہریگا

مرے[۳] خط میں شکایت اُسکی شہباز نظر کی ہے
پر و بالِ کبوتر ایک اِک لکھدوں نہ ٹھہریگا

اسے خو پڑ گئی ہے بے طرح زانوے جاناں کی
یہ سر تکیہ پہ ہمدم جس طرح رکھوں نہ ٹھہریگا

سراپا[۴] بسکہ محوِ شوخیِ قاتل ہوں محشر تک
مرے زخموں سے جاری ہی رہیگا خوں نہ ٹھہریگا

کیا بہرِ عیادت گر ارادہ اُس نے آنے کا
تو جب[۵] تک جان ہے دردِ دلِ محزوں نہ ٹھہریگا

ہوئی تاثیر گر تھوڑی سی بھی اُس سرو موزوں کو
زمیں[۶] کیا آسماں پر نالۂ موزوں نہ ٹھہریگا

مہِ[۷] نو بن گئے ہم طولِ شبہاے جدائی سے
کہاں تک دیکھئے وہ حسن روز افزوں نہ ٹھہریگا

وہ[۸] شاعر ہوں کہ باندھوں گا نہ ہم زنجیرِ کاکل سے
اگر دل کے قلق کا دھیان میں مضموں نہ ٹھہریگا

طوافِ[۹] کعبہ کا خو گر ہے دیکھو صدقے ہونے دو
بتو سمجھو ذرا مومن ہے مومن یوں نہ ٹھہریگا

---

۱ اس مجنوں کو صرف زنجیرِ دریار سے قرار ممکن ہے۔ یعنی اُس کو صرف اسی دروازہ پر چین آ سکتا ہے زنجیروں میں باندھنے سے یہ نہیں رُک سکتا۔ ۲ اگر مغبچوں کی چشمِ مست کی گردش اسی طرح رہی تو بیخودی کی وجہ سے دستِ ساقی میں جامِ شراب کا سنبھلنا دشوار ہوگا۔ ۳ چونکہ میرے خط میں دوست کے شہباز نظر کی شکایت رقم ہے اس لیے اُس کی تاثیر سے خط لیجانے والے کبوتر کے پر و بال ہرگز نہیں ٹھہر سکتے۔ ظاہر ہے کہ شہباز کبوتر کا دشمن ہوتا ہے۔ لکھدوں کا لفظ اپنے دعوی کی توثیق کے لیے استعمال کیا ہے۔ ۴ چونکہ قاتل کی شوخی کا خیال کسی وقت دل سے نہیں جاتا اس لیے زخم ہر وقت تازہ اور خون ہردم جاری رہیگا۔ ۵ اس لیے کہ اگر درد ٹھہر گیا تو دوست عیادت کا ارادہ ترک کر دیگا۔ ۶ سرو موزوں = معشوق۔ نالہ کا اس فخر کے باعث زمین پر قدم رکھنا تو درکنار آسمان پر بھی ٹھہرنا محال ہے۔ ۷ دوست کو شاعر نے چاند فرض کیا ہے جس کا حسن روز افزوں ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ چاند جب کمال کو پہنچ جاتا ہے تو پوری رات ٹھہرتا ہے اور جب تک کامل نہیں ہوتا اُس کا قیام مختصر ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ہم طولِ شبہائے جدائی سے ہلال کی طرح کاہیدہ ہو گئے۔ دیکھیے وہ وقت کب آئے کہ وہ حسن کامل ہو کر دیر تک ہمیں اپنے جلوے سے مستفید کرے۔ ۸ اگر بیتابیِ دل کا مضمون (بیتابی کی وجہ سے) دھیان میں نہ ٹھہرا تو میں اُس کو ہم زنجیرِ کاکل سے باندھونگا۔ باندھونگا کے لفظ میں ایہام ہے۔ ۹ مومن طوافِ کعبہ کا عادی ہے۔ اگر تم نے ترک عادت پر مجبور کیا اور اپنے گرد طواف کرنے (صدقے ہونے) نہ دیا تو اُس کا یہاں ٹھہرنا مشکل ہے۔

۲۳

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا[۵۱] — مَیں الزام اُس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

نہ شادی مرگ ہوں کیونکر ہے مژدہ قتلِ دشمن کا[۵۲] — کہ گھر میں سے لیے شمشیر وہ روتا نکل آیا

ستم اے گرمیِ ضبطِ فغان و آہ چھاتی پر — کبھو بس پڑ گیا چھالا کبھو پھوڑا نکل آیا

کیا زنجیر[۵۳] مجھکو چارہ گر نے کن دِنوں میں جب — عدو کی قید سے وہ شوخ بے پروا نکل آیا

نکل آیا اگر آنسو تو ظالم مت نکال آنکھیں[۵۴] — سُنا معذور ہے مضطر نکل آیا نکل آیا

ہمارے[۵۵] خونبہا کا غیر سے دعویٰ ہے قاتل کو — یہ بعدِ انفصال اب اور ہی جھگڑا نکل آیا

ہوئی[۵۶] بلبل ثنا خوانِ دہانِ تنگ کس گُل کی — کہ فروردیں میں غنچہ کا مُنہ اتنا سا نکل آیا

کوئی تیر اسکا دل میں رہ گیا تھا کیا کہ آنکھوں سے — ابھی رونے میں اک پیکان کا ٹکڑا نکل آیا

دمِ بسمل یہ کس کے خوف سے ہم پی گئے آنسو — کہ ہر زخمِ بدن سے خون کا دریا نکل آیا

خدنگِ یار کے ہمراہ نکلی جان سینے سے — یہی ارمان اک مدت سے جی میں تھا نکل آیا

بہت نازاں ہے تو اے قیس وحشت پر دکھاؤنگا
کتابوں میں کبھو قصہ جو مومن کا نکل آیا

---

[۵۱] عاشق نے دوست کو بے التفاتی کا الزام دیا اُس نے اُلٹا عاشق کا قصور ثابت کر دیا اور کہا کہ مَیں تمھارے دل کی کشش کا امتحان کرتا تھا کہ اگر یہ کشش صادق ہے تو خود مجھے کھینچ بُلائے گی۔ اُسکے اس عذر نے عاشق کا الزام باطل کر دیا۔ [۵۲] شمشیر لیے روتا نکلنا اس امر کا مژدہ ہے کہ وہ دشمن کو قتل کریگا۔ [۵۳] زنجیر کرنا = قید کرنا۔ فارسی محاورہ کا ترجمہ ہے۔ [۵۴] آنکھیں نکالنا اصلی معنی میں اور نیز ناراض ہونے کے معنی میں استعمال کیا ہے مثل مشہور ہے المجبورُ معذورٌ۔ [۵۵] قاتل نے عاشق کو قتل کیا۔ خیر یہاں تک تو مضائقہ نہ تھا۔ مگر شکایت اس کی ہے کہ اب وہ رقیب سے اُس کا خونبہا طلب کرتا ہے اسلیے کہ وہی محرکِ قتل تھا۔ قتل کا تحریکِ دشمن سے ہونا یا قتل کے بعد دشمن سے دوست کا سلسلۂ معاملت جاری رکھنا عاشق برداشت نہیں کر سکتا۔ [۵۶] فروردین = فارسی کے پہلے مہینہ کا نام جو بہار کا زمانہ ہے۔ گُل سے معشوق مراد ہے۔ اتنا سا مُنہ نکل آنا = خجل ہو جانا۔

ب ۲

روزِ جزا[1] جو قاتلِ دلجو خطاب تھا — میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا

ناصح[2] ہے طعنہ زن مری ناکامیوں پہ کیا — دلجوئیوں سے تیری کبھی کامیاب تھا

پھرنے[3] سے شام وعدہ تھکے یہ کہ سو رہے — آرام شکوۂ ستمِ اضطراب تھا

کیا کیا[4] شکن دیئے ہیں دلِ زار کو مگر — اُس کے خیال میں ورقِ انتخاب تھا

عاشق[5] ہوئے ہیں آپ کہیں گو اسی پہ ہوں — شب حالِ غیر مجھسے زیادہ خراب تھا

[1] دلجو کے لفظ میں گونہ ایہام ہے یعنی دل کا تلاش کرنے والا اور نیز مہربانی کرنے والا۔ عاشق نے حشر میں اپنے قتل کرنے والے معشوق کو قاتل دلجو کہکر دعواے خون کیا۔ مگر دعویٰ اس بنا پر خارج کر دیا گیا کہ مدعی خود اپنی زبان سے قاتل کی تلافی جرم (دلجوئی) کا مقر ہے۔ اس میں صنعت القول بالموجب پائی جاتی ہے۔ [2] اگر کامیاب تھا کا فاعل ناصح ہو تو مراد یہ ہے کہ ناصح مجھے میری ناکامیوں پر طعنے دیتا ہے۔ شاید اُس کو کبھی تیری عنایتوں کا ذاتی تجربہ ہو چکا ہے۔ اگر فاعل میں ہو جو محذوف ہے تو مطلب یہ ہے کہ میں پہلے کب موردِ کرم تھا جو اب ناکامی پر مجھے طعنہ دیا جاتا ہے۔ [3] شام وعدہ انتظار یار میں ہمیں اس قدر تگ و دو کرنی پڑی کہ آخر تھک کر سو رہے۔ لہذا ہم کو آرام کا طعنہ دینا بیہودہ ہے اسلیے کہ اگر تھکے ہوئے نہ ہوتے تو کیوں سوتے گویا یہ آرام نہیں بلکہ اضطراب کے ہاتھوں جو ظلم اُٹھائے ہیں زبان حال سے اُن کا شکوہ ہے۔

[4] قاعدہ ہے کہ کتاب میں جس ورق کو پڑھنے کے لیے انتخاب کرتے ہیں اُس کو شکن دیدیتے ہیں۔ محبوب نے شاید میرے دل کو ورق انتخاب خیال کیا جو اُس کو اس قدر شکن (دکھ) دیئے۔ [5] شاعر کے نزدیک عشق میں خود رفتگی۔ دنیا و مافیہا (حتی کہ خود معشوق) سے بیخبری اور حالت کی خرابی لازم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رات رقیب کا حال مجھ سے بھی زیادہ خراب تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ (معشوق) کہیں عاشق ہوئے ہیں اور اسی وجہ سے اُس کی طرف وہ نظر التفات نہیں رہی گو اُسی پہ ہوں یہ ٹکڑا شاعر کی انتہائی شوخی ہے۔ یعنی آپ کو پہلے اُس پر التفات تھا۔ اب ممکن ہے آپ کی وہ حالت عشق کے درجہ تک پہنچ گئی ہو اور بیخبری ٹھہری لازمۂ عشق۔ اسلیے رقیب کا حال تباہ ہوا امر مسلم لیکن اگر آپ کے لفظ سے طنزاً رقیب کو اور لفظ اُسی سے معشوق کو مُراد لیا جائے تو مطلب زیادہ صاف ہو جاتا ہے۔

وقتِ[۶] وداع بے سبب آزردہ کیوں کیا | ہوئے | یوں بھی تو ہجر میں مجھے رنج و عذاب تھا
وہ چشم انتظار کہاں باز بعدِ مرگ | | دیکھا[۷] تو ہم نے آنکھ نہ لگنا بھی خواب تھا
بے پردہ غیر سے نہ ہوا ہو گا شب کہ صبح | | آنکھوں[۸] میں شرم تھی نہ نظر میں حجاب تھا
دیکھا[۹] نہ ہے یہ رشک و حسد وہ بلا کہ آج | | سنبل کو تیری زلف کا سا پیچ و تاب تھا
ہوں[۱۰] کیوں نہ محوِ حیرتِ نیرنگہائے شوق | | جو دل میں شعلہ تھا وہی آنکھوں میں آب تھا
کیا[۱۱] جی لگا ہے تذکرۂ یار میں عبث | | ناصح سے مجھکو آج تلک اجتناب تھا

روزِ جزا خدا بُتِ جلّاد کو ملا
گویا کہ خونِ ناحقِ مومن صواب تھا

مجھکو تیرے عتاب نے مارا | ۲۵ | یا مرے اضطراب نے مارا
بزم سے میں بس ایک میں محروم | | آپ کے اجتناب نے مارا
لے کے دل بھی کچھ نہیں جاتی | | زلف کے پیچ و تاب نے مارا

[۶] معشوق چلتے وقت عاشق سے بے سبب آزردہ ہوا۔ عاشق نے اُسکی بنزیہ توجیہ یوں کی کہ آپنے یہ ناحق کا جھگڑا میری پاس خاطر سے اسلیے نکالا کہ آپکے جانے کے بعد جھگڑے کو یاد کرکے آپکی یاد مجھے کم ستائے اسلیے کہتا ہے کہ اس تکرار بیجا کی کیا ضرورت تھی آخر میرے ستانے کے لیے عذاب ہجر کیا کم تھا۔ [۷] بعد مرگ آنکھ لگ گئی اور معلوم ہوا کہ انتظار کا جاگنا خواب (بے اصل) تھا۔ [۸] محبوب کی آنکھوں کی بے حجابی اس امر کی علامت ہے کہ شب وہ غیر سے بے پردہ نہیں ہوا۔ ورنہ صبح کو ضرور محجوب اور شرمندہ ہوتا۔ [۹] سنبل کو زلف کا سا پیچ و تاب حسد کا نتیجہ ہے۔ اس میں غالباً اس امر کی تنبیہ ہے کہ جب سنبل کا زلف کے رشک سے یہ حال ہے۔ تو میں انسان ہوں مجھے رشک سے پیچ و تاب کیوں نہ ہو۔ [۱۰] عشق کے نیرنگ (طلسم) کا یہ اثر ہے کہ دل کے شعلے آنکھوں سے آنسو بنکر نکلنے لگے۔ [۱۱] لفظ عبث کا تعلق مصرع ثانی سے ہے یعنی میں نے ناحق ناصح سے ابتک اجتناب (پرہیز) رکھا۔ اسلیے کہ دوران نصیحت میں ذکر دوست آتا ہے اور ذکر دوست سے دلبستگی کسکو ہو

کیا[1] پسند آئی اپنی جور کشی — چرخ کے انتخاب نے مارا
خاک[2] اٹھیں گے خاک سے جو نہیں — ترک آرام و خواب نے مارا
تشنہ کامی وصال[3] کی مت پوچھ — شوقِ تیغِ خوش آب نے مارا
خون کیونکر مرا کھلے کہ مجھے — اک سراپا حجاب نے مارا
یادِ ایامِ وصلِ یار افسوس — دہر کے انقلاب نے مارا
لبِ[4] میگوں پہ جان دیتے ہیں — ہمیں شوقِ شراب نے مارا
جبہ[5] سائی کا بھی نہیں مقدور — اُن کی عالی جناب نے مارا
نازک[6] اندام سے لگی ہے آنکھ — حسرتِ فرشِ خواب نے مارا
کس پہ مرتے ہو آپ پوچھتے ہیں — مجھے فکرِ جواب نے مارا
یوں کبھی نوجواں نہ مرتا میں — تیرے عہدِ شباب نے مارا

مومن از بس ہیں بے شمار گناہ
غمِ روز حساب نے مارا

۲۶

دیکھ[1] لو شوق ناتمام مرا — غیر لے جائے ہے پیام مرا
بے اثر ہے فغانِ[2] خوں آلود — کیوں نہ ہوئے خراب کام مرا

---

[1] میرے ظلم اُٹھانے کی ادا آسمان کو پسند آئی۔ اسلیے ظلم کرنے کے لیے اُسکی نظر انتخاب مجھی پر پڑی۔ اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی۔ [2] جس قدر دُنیا میں آرام و خواب سے محروم رہے۔ مرنے کے بعد ہمیں اسی قدر گہری نیند آئیگی۔ اسلیے حشر میں قبر سے اُٹھنا معلوم۔ [3] وصال = موت۔ [4] میگوں = شراب فام یا سُرخ رنگ۔ دوسرے مصرع میں شراب سے لب میگوں ہی مراد ہے۔ [5] جبہ سائی = پیشانی گھسنا۔ جناب = آستان۔ [6] جب سے آنکھ لگی (عشق ہوا) فرشِ خواب کی حسرت ہی رہی یعنی نیند حرام ہو گئی۔

[1] اگر میرا عشق ناتمام (خام) نہ ہوتا تو غیر کے پیام لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ خود دوست کے دل کو خبر ہو جاتی یا میں خود اپنا پیام لے کر پہنچتا۔ غیر کوئی دوسرا شخص۔ رقیب بھی مراد ہو سکتا ہے۔ [2] فغان خون آلود = وہ فریاد جو خون کے ساتھ مُنہ سے نکلے۔ کام کے لفظ میں ایہام ہے اُسکے دوسرے معنی تالو کے ہیں۔

آتشیں خو سے آرزوے وصال
پک گیا اب خیال خام مرا [۵۳]

دیکھنا کثرتِ بلا [۵۴] نوشی
کاسۂ آسماں ہے جام مرا

رتبہ اُفتادگی کا دیکھو ہے
عرش کے بھی پرے مقام مرا

کس صنم کو چھڑا دیا واعظ
لے خدا تجھ سے انتقام مرا

ہو کے یوسف [۵۵] جو دل چُراتے ہو
کون ہو جائے گا غلام مرا

اُس لبِ لعل کی شکایت ہے
کیونکہ رنگیں نہ ہو کلام مرا

تو نے رسوا کیا مجھے اب تک
کوئی بھی جانتا تھا نام مرا

ق

زانوے بُت پہ جان دی دیکھا
مومن انجام و اختتام مرا

بندگی کام آ رہی آخر
مَیں نہ کہتا تھا کیوں سلام مرا

۲۷

ناز بیجا [۵۶] سے سوا شرم کے حاصل نہ ہوا
غیر پر ظلم کیے میرے مقابل نہ ہوا

خود گلا کاٹ موا جبکہ مَیں بسمل نہ ہوا
اُن [۵۷] کو آساں نہ ہوا جو مجھے مشکل نہ ہوا

---

۵۳ میرا سودائے خام (جنونِ عشق) اب پختہ ہو گیا - گویا دوست کی آتشیں خوئی (بد مزاجی) نے میرے خیال کو اُلٹا مستحکم کر دیا - قاعدہ ہے کہ کچی چیز آگ سے پک جاتی ہے - آتشیں خو اور پک گیا میں ایہام تناسب ہے۔
۵۴ بلا نوشی = شدت سے نوشی اور چونکہ آسمان ہی سے بلائیں آتی ہیں اسلیے بلا نوشی کے لفظ میں لطف پیدا ہو گیا
۵۵ تم جو یوسف ہو کر میرا دل چُراتے ہو - یہ تو بتاؤ کہ چوری کی سزا کون بھگتے گا - حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں قاعدہ تھا کہ جس پر مال کی چوری کا جرم ثابت ہوتا تھا اُس کو صاحب مال کا غلام بننا پڑتا تھا - چنانچہ مشہور ہے کہ جب حضرت یوسفؑ بچے تھے اور اپنی پھوپھی کے یہاں پرورش پاتے تھے ایک مرتبہ پھوپھی نے انکے روکنے کی نیت سے اُن پر چوری کا اتہام لگایا جس پر اُنکو کئی سال اُنکے گھر رہنا پڑا۔
۵۶ معشوق نے ناز سے رقیب پر ظلم کیے - ناز کو بیجا اس لیے کہا ہے کہ اُس ناز کا محل صحیح عاشق تھا نہ کہ غیر نتیجہ یہ کہ وہ اُسکے ظلم کا تحمل نہ ہو سکا - اب معشوق کو اپنے غلط انتخاب پر شرم (ندامت) پیدا ہوئی جسکے اثر سے اُسکو عاشق کے سامنے ہونے کی جراُت نہ پڑی - ۵۷ جو بات (قتل عاشق) معشوق کو (نزاکت کے باعث) آسان نہ ہوئی - وہ عاشق کو مشکل نہ معلوم ہوئی -

کس طرح بزم میں وہ آنکھ چراتے[۳] مجھسے / دل کو کھو کر یہ ڈرا تھا کہ میں غافل نہ ہوا

خوں چھپانے کو مری لاش سے کہتا[۴] ہے وہ شوخ / مجھکو یہ غم ہے کہ میں کیوں ترا قاتل نہ ہوا

یاد کاکل[۵] میں بھی خود رفتگی اپنی نہ گئی / جوش وحشت سے میں پابند سلاسل نہ ہوا

دل دہی[۶] کیسی وہ دم دیتے ہیں سُن لے دشمن! / کیا نہ دیتے مجھے میں آپ ہی سائل نہ ہوا

خوں مرا بار گلے کا نہ ہو کیوں لے قاتل / دست رنگیں مری گردن میں حمائل نہ ہوا

آتشِ سینۂ[۷] تفسیدہ کو کیا میں روؤں / اشک جانب کرۂ آب کے مائل نہ ہوا

دیتے[۸] تکلیف شبِ ہجر میں کیا اپنے پاس / نقد جاں پیشکشِ مرگ کے قابل نہ ہوا

بے[۹] حجابی کا گلہ کیجے تو کہتا ہے ترے / پردۂ چشم کی تقصیر کہ حائل نہ ہوا

کیا[۱۰] گلے ہوتے گر اوروں پہ بھی رحم آجاتا / شکر صد شکر کہ میرا سا ترا دل نہ ہوا

مر گیا جس پہ نہیں گھر میں رسائی اُسکے
تھا تو مومن میں وے خلد[۱۱] میں داخل نہ ہوا

---

۳ آنکھ چرانا = بے التفاتی کرنا۔ شاعر نے چرانے کے لفظ سے خاص فائدہ لیا ہے۔ ۴ اس طریقہ سے قاتل یہ ظاہر کرتا ہے کہ اصلاً کسی اور نے قتل کیا ہے۔ منشا یہ ہے کہ لوگ سمجھیں کہ اگر یہ قاتل ہوتا اور قتل چھپاتا تو ارادہ قتل اس بیباکی سے کیوں ظاہر کر دیتا۔ ۵ قاعدہ ہے کہ زنجیر و بندش سے دیوانہ کی وحشت کم ہو جاتی ہے۔ مگر یہاں یاد کاکل (جو سلاسل سے مشابہ ہے) کے باوجود کبھی جنون میں کمی نہ ہوئی ۔ ۶ دل ہی تسلی دم دینا = دھوکا دینا۔ اے دشمن تو جو دوست کی دلدہی پر نازاں ہے یہ تیری نافہمی ہے۔ یہ دلدہی نہیں دھوکا ہے۔ اس لیے میں خود ہی اس کی (مصنوعی) دل دہی کا طالب نہ ہوا۔ ۷ سینہ گرم کی آگ کا کیا بیان کروں۔ جس کی گرمی کے اثر سے میرے اشک اپنے مرکز اصلی (کرۂ آب) کی جانب رجوع کرنے کی بجائے بھاپ بنکر اُڑ گئے۔ ۸ شب ہجر میں اپنے نہ مرنے کی شاعرانہ توجیہ یوں کرتا ہے کہ ہم موت کو کیا بلاتے۔ کیونکہ (ضعف کے باعث) نقد جان اس قابل نہ رہا تھا کہ موت کو پیش کیا جاتا۔ ۹ ترے کا تعلق مصرع ثانی سے ہے۔ ایسی ناہموار بندشیں مومن کے یہاں عامۃ الورود ہیں۔ معشوق بے حجابی کے الزام پر اُلٹا عاشق کو قصور وار ٹھہراتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر تمھارا پردۂ چشم حائل ہوتا تو یہ شکایت نہ ہوتی کیونکہ ذوق دید کی انتہا یہ ہے کہ عاشق کو کچھ نظر نہ آسکے۔ ۱۰ شکر ہے کہ تیرا دل میرا سا (نرم) نہ ہوا۔ ورنہ جس طرح تو مجھ پر رحم کرتا اوروں پر بھی رحم کرتا۔ پھر اس صورت میں مجھے رشک پیدا ہوتا۔ ۱۱ کاشانہ یار کو خلد قرار دیا ہے اور مومن کے لیے خلد کا وعدہ ہے۔

۲۸

فراقِ غیر میں ہے بیقراری یاب اپنا سا[1] — بنایا تو نے اس کو بھی دلِ بیتاب اپنا سا
کسی کا سوزِ دل ہرگز تجھے باور نہیں آتا — تو سب کو جانے ہے اے مہرِ عالمتاب اپنا سا
جوابِ خونِ ناحق میرا ایسا کیا دیا تو نے — کہ ظالم رہ گئے منہ لیکے سب احباب اپنا سا
اگر مرضی یہی ٹھہری کہ تجھکو چھوڑ دوں مجھکو — بتا دے اور کوئی غیرتِ مہتاب اپنا سا
یہ رنگ آمیزیاں کیسی ہیں کس کا ڈر ہے دیکھو تو — مجھے تو کچھ نظر آتا ہے یہ خونناب اپنا سا
بناوٹ سے یہ زلفیں لاکھ بل کھایا کریں لیکن — یہ ممکن ہی نہیں ہووے جو پیچ و تاب اپنا سا

اگرچہ شعر مومن بھی نہایت خوب کہتا ہے
کہاں ہے لیک معنی بند مضموں یاب اپنا سا

۲۹

کیا مرتے دم[2] کے لطف میں پنہاں ستم نہ تھا — وہ دیکھتے تھے سانس کو اور مجھ میں دم نہ تھا
بیخود تھے غش تھے محو تھے دنیا کا غم نہ تھا — جینا وصال میں بھی تو مرنے سے کم نہ تھا
شاید کہ[3] دستِ غیر رہا رات شانہ کش — اس زلفِ تابدادہ میں کچھ آج خم نہ تھا
جوشِ قلق[4] نے اس کو بھی دیوانہ کر دیا — پہلے تو ورنہ طبعِ تحمل میں رم نہ تھا
کیوں[5] جورِ متصل سے ترے غیر کھنچ گئے — میں کیا حریفِ کشمکشِ دمبدم نہ تھا
چھڑکے[6] ہے کون زخم پہ وہ کیوں نہ ہوں غمیں — الماس کی تھی آس جو بھی تاب الم نہ تھا

[1] جس طرح میرا دل دوست کے فراق میں بے تاب ہے اسی طرح دوست فراق دشمن میں بیقرار ہے۔ [2] بیخودی کا یہ عالم ہے کہ عاشق درِ یار کو دیکھکر نہیں پہچانتا۔ پھر در پر اپنے خون کے داغ دیکھکر کچھ کچھ یاد آتا ہے۔ کہ شاید یہ وہی در ہوگا۔ [2] اُن کا سانس کو دیکھنا بظاہر لطف کی صورت ہے۔ مگر اصلاً انکو یہ بدگمانی ہے کہ عاشق مر دہ بنگیا ہے گویا انکا کرم اپنی بھی ستم مضمر ہے۔ [3] زلف کے بل کا نکلجانا اس امر کی مخبری کر رہا ہے کہ رات دست غیر نے شانہ کا کام دیا۔ [4] تحمل (صبر) پہلے تو مجھ سے استقدر رم نہ کرتا تھا جسقدر اب کرتا ہے۔ شاید میری بے تابی نے اُسکو بھی دیوانہ کر دیا۔ قاعدہ ہے کہ دیوانے سب سے رم کرتے ہیں۔ [5] معشوق کے ظلم پیہم کی وجہ سے بوالہوس نیوں علیحدہ ہوگئے۔ آخر میں بھی تو روز بروز کے ستم برداشت کرتا رہا۔ [6] عاشق ایذا پسند زخم پر نمک چھڑکنے سے غمگین ہے اور سوء الماس کو اُس پر ترجیح دیتا ہے۔ اسلیئے کہ الماس سے اذیت زیادہ ہوتی ہے۔ الم اور آس کے الفاظ عمداً استعمال کیے ہیں کیونکہ دونوں کے ملانے سے الماس بنتا ہے۔

میں مرگیا[۸] وہ چشم جو یاد آئی اور یار
حیران ہیں کہ مے تھی پیالہ میں سم نہ تھا

چھوڑا نہ دل میں کچھ بھی تپ ہجر نے کہ رات
روتے تھے زار زار اور آنکھوں میں نم نہ تھا

دربان[۹] کو آنے دینے پہ میرے نہ کیجے قتل
ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہ تھا

مومن چلا گیا تو چلا جائے اے بتو
آخر قدیم خادمِ بیت الصنم نہ تھا

غیر کو سینہ[۱۰] کہہ کے سیمبر دکھلا دیا
تم نے کیا کچھ کس کو اپنی بات پر دکھلا دیا

زرد[۱۱] منہ دکھلا دیا غم کا اثر دکھلا دیا
آج ہم نے اُس کو اپنا زور و زر دکھلا دیا

صبح[۱۲] سے تعریف ہے صبر و سکون غیر کی
کس نے شب مجھکو تڑپتے پیش در دکھلا دیا

موت کے صدقے کہ وہ بے پردہ آئے لاش تک
جو نہ دیکھا تھا تماشا عمر بھر دکھلا دیا

اس کے دل میں اب خیالِ قتل ہر دم آئے ہے
موت کو کس نے الٰہی میرا گھر دکھلا دیا

گو حسد[۱۳] سے ہو پر اب بھی ہے وہی ناصح کی بات
ناحق اُس جانِ جہاں کو اک نظر دکھلا دیا

نام اُلفت کا نہ لونگا جب تلک ہے دم میں دم
تو نے چاہت کا مزہ اے فتنہ گر دکھلا دیا

---

[۸] پیالہ مے دیکھکر عاشق کو چشم معشوق یاد آئی اور مرگیا دوستوں کو حیرت ہوئی کہ شراب نے کیونکر سم (زہر) کا اثر دکھایا۔ [۹] اس لیے کہ حرم (کعبہ) میں کسی کی روک ٹوک نہیں۔ اس کے علاوہ حرم میں قتل بھی ممنوع ہے۔ [۱۰] سیم بر = جس کا سینہ سیمیں ہو۔ غیر نے تم کو سیمبر کہا۔ تم نے اُسکی خوشامد سے متاثر ہوکر اُس کو سینہ دکھا دیا۔ [۱۱] زرد چہرہ کو زر اور غم کے اثر کو زور سے تعبیر کیا ہے۔ [۱۲] شاعر معشوق کی بے امتیازی کا شکوہ سنج ہے۔ یعنی رقیب تو اس لیے نہیں تڑپتا کہ اُس کا دل درد محبت سے خالی ہے۔ مگر وہ اِس کو صبر و ضبط سمجھ کر اُلٹی اُس (رقیب) کی تعریف کرتا ہے۔ [۱۳] مومن نے ناصح کو قائل کرنے کی غرض سے اپنے محبوب کی صورت دکھا دی۔ مگر یہ غضب ہوا کہ وہ اُس کو دل دے بیٹھا اور مومن کو ترک عشق کی نصیحت کرنے لگا۔ فرق اتنا ہے کہ پہلے ہمدردی کی نسبت سے نصیحت تھی اب جذبۂ رشک کی بنا پر ہے۔

جب کہا دل پھیر دو بولے کہ دل پہلو میں ہے
میں نے اُن کی ضد سے سینہ کاٹکر دکھلا دیا

اس قیامت قد کو شب دیکھا تھا ہم نے خواب میں
دل نے محشر کا سماں وقتِ سحر دکھلا دیا

صورتِ اغیار کو دیکھے ہے وہ حیرت زدہ ^۸
میرے رنگِ رخ نے آئینہ مگر دکھلا دیا

سخت کمبختی ہوئی یہ بھی نصیبوں کا لکھا
غیر کو خطِ نامہ بر نے بے خبر دکھلا دیا

۳۰
دیکھیں گے مومن یہ ہم ایمان بالغیب ^۹ آپکا
اُس بُتِ پردہ نشیں نے جلوہ گر دکھلا دیا

۳۱
غیروں ^۱۰ پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

اُڑتے ^۱۱ ہی رنگِ رُخ مرا نظروں سے تھا نہاں
اِس مُرغِ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا

دشنام ^۱۲ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں
اے ہمنفس نزاکتِ آواز دیکھنا

دیکھ ^۱۳ اپنا حالِ زار منجّم ہوا رقیب
تھا سازگار طالعِ ناساز دیکھنا

---

^۸ محبوب میرے رنگِ رخ کی تغییر دیکھکر حیرت زدہ ہوا - گویا میرے رنگِ رُخ نے آئینہ کا کام کیا - اب وہ اغیار کی صورت کو حیرت سے دیکھتا ہے کہ ان لوگوں پر میرے حُسن کا وہ اثر کیوں نہیں ہوا جو مومن پر ہے - آئینہ دکھلانے کے لفظوں میں یہ مفہوم بھی ہے کہ میرے تغیرِ رنگ نے قیبوں کی بے حسی کی حقیقت آشکار کر دی - ^۹ ایمان بالغیب = بے دیکھی چیزوں (باری تعالیٰ اور قیامت وغیرہ) پر اعتقاد کرنا جو اسلام کا منشا اور مومن کی شان ہے یعنی اگر آپ بُت پردہ نشین کا جلوہ دیکھکر بھی خدا کے قائل ہیں تو ہم آپ کا دعویٰ ایمان تسلیم کریں گے - ^۱۰ اگر تم چاہتے ہو کہ رازِ محبت غیروں پر نہ کھلے تو میری طرف کبھی دیکھو ورنہ لوگ تاڑ جائیں گے کہ کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے - غماز = سخن چیں - اشارے کرنے والا - ^۱۱ رنگ کو شکستہ (متغیر) ہونے کی وجہ سے پر شکستہ قرار دیا ہے اور اڑنے کی رعایت سے مرغ کہا ہے - ^۱۲ نزاکت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اب اُنکی سخت کلامی بھی گراں نہیں گذرتی گراں اور نزاکت کے الفاظ سے شاعر نے فائدہ اُٹھایا ہے - ^۱۳ منجم نے شاعر کا حالِ زار دیکھا اور تاثیر نجوم کے حساب سے اسکی ناکامیِ عشق کا پتہ لگالیا اور خود اُس کا رقیب بن بیٹھا - کیونکہ عاشق کی ناکامی دریافت کر کے اُس کو اپنی کامرانی کی توقعات پیدا ہوئیں - اس طریقہ سے اُس کا طالعِ ناساز دیکھنا منجم کے حق میں سازگار ہوا -

بد کام کا مآل بُرا ہے جزا کے دن
حالِ سپہرِ تفرقہ انداز دیکھنا

مت رکھیو گردِ تارکِ عشاق پر قدم
پامال ہو نہ جائے سرافراز دیکھنا

کشتہ ہوں اُس کی چشمِ فسوں گر کا اے مسیح
کرنا سمجھ کے دعوےِ اعجاز دیکھنا

میری نگاہ خیرہ دکھاتے ہیں غیر کو
بے طاقتی پہ سرزنشِ ناز دیکھنا

ترکِ صنم بھی کم نہیں سوزِ جحیم سے
مومن غمِ مآل کا آغاز دیکھنا

۲۴

کہہ رہا ہے کون کس سے بے شکیبائی ملا
مجھکو قسمت سے نصیحت گر بھی سودائی ملا

میرے گھر بھی پھرتے چلتے ایک دن آجائیگا
دو مبارکباد اب کی یار ہرجائی ملا

گور میں بھی جوشِ غمِ دل سے نہ نکلا ہائے ہائے
آپ ہی میں ہم نہیں جب کنجِ تنہائی ملا

ہم بھی تو ناداں ہیں آخر یاس مطلب کس لئے
خضر موسیٰ کو پئے تعلیمِ دانائی ملا

ے مذہبی معتقدات کے بموجب آسمان قیامت کے روز ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگا۔ شاعر کے نزدیک یہ اُن تفرقہ اندازیوں کی سزا ہے جو آسمان سے کی تھیں۔ ے یہ مومن کا مخصوص رنگ ہے۔ جسکو میں مکر شاعرانہ سے تعبیر کرتا ہوں مراد یہ ہے کہ تارک (سر) عاشق کی خاک کو پامال نہ کرنا ورنہ تمھارے قدموں سے اسکی خاک کی آبرو بڑھ جائیگی اور ظاہر ہے کہ معشوق کو عاشق کی سرفرازی منظور نہیں۔ ے میری نگاہ بے طاقتی کی وجہ سے تاب دیدار نہ لاسکی اور خیرہ ہو گئی معشوق طعن سے غیر کو میری نگاہ خیرہ دکھاتا اور ازراہ ناز اس بیطاقتی پر سرزنش کرتا ہے۔ ے شاعر نے جس غمِ مآل (سوزِ جحیم) کے خوف سے ترکِ عشق صنم کیا تھا وہی تکلیف ترکِ عشق کی بدولت ابتدا ہی میں پیش آئی۔ گویا عشقِ صنم کا مآل عذابِ دوزخ ہوتا مگر یہاں آغاز ہی میں ترکِ عشق کے باعث عذابِ دوزخ کی سی اذیت ہے۔ جس غمِ مآل کا آغاز یہ ہے نہ جانے انجام کیا ہوگا۔ حاصل یہ ہے کہ سوزِ جحیم کے خیال سے ترکِ صنم محض بے نتیجہ ہے۔

ے نصیحت گر (ناصح) دیوانہ ہے کہ مجھکو تلقین صبر و شکیبائی کرتا ہے کیونکہ صبر عاشق سے محال ہے۔ یا یہ کہ صبر کرکے بیٹھ رہنے سے مقصد اور زیادہ عسیر الحصول ہو جاتا ہے۔ ے زندگی میں جوشِ غمِ دل سے نہ نکل سکا اس لیے کہ دنیا میں کنجِ تنہائی نہ تھا جو رو کر دل کا بخار نکالتے۔ اب گور میں کنجِ تنہائی نصیب ہوا تو جوشِ غم کا نکلنا معلوم اس لیے کہ یہاں ہم اپنے ہوش میں نہیں۔ ے حضرت موسیٰ بعض اسرار کائنات سے ناواقف تھے اس لیے اُن کو حکم ہوا کہ حضرت خضرؑ کی صحبت میں رہکر اُن رموز کی تعلیم حاصل کریں۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم بھی تو ناداں ہیں ہم کو اپنے مقصود سے ناامید نہ ہونا چاہیئے۔ کیا عجب کہ اسی طرح قدرت ہماری رہنمائی کا سامان بھی پیدا کر دے۔

پند گو حالِ زلیخا یاد کر کچھ خیر ہے — کام دل جس کو ملا یاں بعد رسوائی ملا

تلخکامی[۶] پر مجھے تجھکو لبِ شیریں پہ ناز — آمرے جادو سے اعجازِ مسیحائی ملا

ہے[۷] جنون ایسے کے آگے ٹھہرنا اے بوالہوس — دیکھتے ہی مجھکو بھاگا جو تماشائی ملا

جستجو[۸] سے وصل دلبر کی تمنا کس لیے — کیا دلِ گم گشتہ اے ہنگامہ آرائی ملا

چھوڑ[۹] بتخانہ کو مومن سجدہ کعبے میں نہ کر — خاک میں ظالم نہ یوں قدرِ جبیں سائی ملا

۴۳

ہمرنگ لاغری سے ہوں گل کی شمیم کا — طوفان باد ہے مجھے جھونکا نسیم کا

چھوڑا نہ کچھ بھی سینہ میں طغیانِ اشک نے — اپنی ہی فوج ہوگئی لشکر غنیم کا

یارانِ نو کے واسطے مجھسے خفا ہو ہائے — تم کو نہیں ہے پاس نیازِ قدیم کا

یاد آئی[۱۰] کافروں کو مری آہ سرد کی — کیونکر نہ کانپنے لگے شعلہ جحیم کا

از بسکہ[۱۱] ثبت نامہ ہے سوزِ تپِ دروں — قاصد کا ہاتھ ہے یدِ بیضا کلیم کا

واعظ[۱۲] کبھی ہلا نہیں کوئے صنم سے میں — کیا جانوں کیا ہے مرتبہ عرشِ عظیم کا

---

[۶] آمیرے جادو سے اپنے اعجاز کا مقابلہ کر۔ اثر کے لحاظ سے تلخکامی کو جادو اور لبِ شیریں کو اعجازِ مسیحائی قرار دیا ہے۔ [۷] اسی طرح تیرا (بوالہوس کا) میرے مقابلہ میں ٹھہرنا جنون ہے۔ بوالہوس = رقیب۔ [۸] شاعر ہنگامہ آرائی سے مخاطب ہوکر کہتا ہے کہ تیری جستجو سے دلِ گم گشتہ کب ملا جو اب وصل دلبر کے حصول کی آرزو کیجائے۔ [۹] چھوڑ = چھوڑ کر۔ [۱۰] کافروں نے جحیم (دوزخ) میں عاشق کی آہ سرد کا تذکرہ کیا جس کے اثر سے شعلۂ دوزخ بھی سردی کے مارے کانپنے لگا۔ شعلہ کا کانپنا عام طور پر مشہور ہے۔ مگر اس کی یہ توجیہ و تعلیل خاص مومن کی جدت ہے۔ [۱۱] یدِ بیضا = روشن ہاتھ یعنی حضرت موسیٰ کلیم اللہ کا دست مبارک جو بچپن میں آگ سے جل گیا تھا اور بعد کو معجزہ سے آفتاب کی طرح چمکتا تھا۔ چونکہ خط میں سوزِ دل کا ذکر ہے اس لیے قاصد کے ہاتھ میں یدِ بیضا کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ [۱۲] واعظ نے عرش عظیم کا مرتبہ بیان کیا جس پر عاشق کہتا ہے کہ مجھکو تو صرف کوئے صنم سے سروکار ہے۔ میں عرش کو کیا جانوں۔ یعنی شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ اس میں عرش عظیم پر کوئے صنم کی ترجیح نکلتی ہے۔

مارا ہے وصلِ غیر کے شکوہ پہ چاہئے — مدفن[۱] جدا جدا مری لاشِ دونیم کا

کہتا ہے بات بات پہ کیوں جان کھا گئے[۲] — گویا کہ پک گیا ہے کلیجہ ندیم کا

واعظ[۳] بتوں کو خلد میں لیجائیں گے کہیں — ہے وعدہ کافروں سے عذابِ الیم کا

مومن تجھے تو وہب[۴] ہے مومن ہی وہ نہیں — جو معتقد نہیں تری طبعِ سلیم کا

م ۳

جوں نکہتِ[۱] گل جنبش ہے جی کا نکلجانا — اے بادِ صبا میری کروٹ تو بدل جانا

پالغز[۲] محبت سے مشکل ہے سنبھل جانا — اُس رخ کی صفائی پر اس دل کا پھسل جانا

سینہ[۳] میں جو دل تڑپا دھر ہی تو دیا دیکھا — پھر بھول گیا کیسا میں ہاتھ کا جل جانا

اتنا تو نہ گھبراؤ راحت یہیں فرماؤ — آئے ہو[۴] — گھر میں مرے رہجاؤ آج اور بھی کل جانا

اے دل[۵] وہ جو یاں آیا کیا کیا ہمیں ترسایا — تو نے کہیں سکھلایا قابو سے نکل جانا

کیا[۶] ایسے سے دعویٰ ہو محشر میں کہ میں نے تو — نظارۂ قاتل کو احسانِ اجل جانا

---

[۱] لاش دونیم کے وجہ آجدا جدا مدفن اس امر کی نشانی ہونگے یہ وصلِ غیر کے شکوہ پر قتل کیا گیا تھا۔

[۲] جان کھانا = فضول گوئی سے پریشان کرنا کلیجہ پک جانا = عاجز آجانا پکنے اور کھانے کی رعایت ذرا مبتذل ہے۔ [۳] خدا نے کافروں سے دوزخ کے عذاب الیم کا وعدہ کیا ہے۔ مومن دریافت کرتا ہے کہ کیا بتوں کو دوزخ سے خلد میں بھیجدیا جائیگا کیونکہ اگر بُت بھی دوزخ میں ہوئے تو کافروں کو عذاب کا ہونا معلوم۔ بلکہ بتوں کا قرب اور راحت کا موجب ہوگا۔ [۴] وہب = بخشش۔ خدا کی دین ظاہر ہے کہ جو خدا کی دین کا منکر ہے وہ مسلمان ہی نہیں۔

[۱] انتہائے نقاہت ہے کہ جنبش کرنے میں جانکنی کی سی ایذا ہوتی ہے اور جان سی نکلنے لگتی ہے جیسے ہوا کی حرکت سے بوئے گل نکلجاتی ہے۔ [۲] پالغز = لغزشِ پا۔ مصرع ثانی پالغز کی تفسیر کر رہا ہے [۳] پہلے دل پر ہاتھ رکھا تھا جو فوراً ہی دل کی حرارت سے جل گیا تھا۔ اب جو دل تڑپا تو پھر ہاتھ دھر دیا اور وہی تلخ تجربہ پھر ہوا۔ [۵] یعنی جس طرح دل قابو سے نکل جاتا ہے اسی طرح معشوق بھی قابو سے نکل جاتا ہے۔ شاید یہ عادت میرے دل نے سکھادی ہے۔ [۶] جب میں نے اپنے قتل کے وقت نظارۂ قاتل کو موت کا احسان تصور کیا تو ایسے شخص پر محشر میں دعوائے قتل کیسے کرونگا۔

ہے ظلم کرم جتنا تھا فرق پڑا کتنا
مشکل ہے مزاج اتنا اک بار بدل جانا

حوروں کی ثنا خوانی واعظ یونہیں کب مانی
لے آ کہ ہے نادانی باتوں میں بہل جانا

عشق انکی بلا جانے عاشق ہو تو پہچانے
لو مجھکو اطبا نے سودے کا خلل جانا

ق

کیا باتیں بناتا ہے وہ جان جلاتا ہے
پانی میں دکھاتا ہے کافور کا جل جانا

مطلب ہے کہ وصلت میں ہے بوالہوس آفت میں
اس گرمئی صحبت میں اسے دل نہ پگھل جانا

دم لینے کی طاقت ہے بیمار محبت ہے
اتنا بھی غنیمت ہے مومن کا سنبھل جانا

ہیں

۳۸

کیا قہر طعن بوالہوس بے ادب ہوا
جرم رقیب قتل کا میرے سبب ہوا

محو جفا ستم کش الطاف کب ہوا
رحم اس کو میرے حال پہ یا غضب ہوا

بوسے دم غضب لیے الٹی سمجھ تو دیکھ
بل جو پڑا جبیں پہ تمنا کو لب ہوا

کس دن تھی اسکے دل میں محبت جواب نہیں
سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

کس قدر فرق پڑ گیا کہ پہلے جتنا کرم تھا اب اُتنا ستم ہے۔ یعنی حوروں کو دُنیا میں لے آ کیونکہ میں خالی وعدوں سے بہلنے والا نہیں۔ کافور پانی میں جلتا رہتا ہے۔ معشوق اس تمثیل سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اسی طرح رقیب سردمہر وصل کی گرم جوشی سے عذاب میں ہے۔ اس پر عاشق اپنے دل کو مخاطب کرتا ہے کہ کہیں معشوق کی التفات ظاہری پر نہ بھول جانا اور اسکو ان باتوں سے حقیقت میں اپنا بہی خواہ نہ سمجھ لینا۔ یہ دونوں شعر قطعہ بند ہیں۔

بوالہوس بے ادب نے معشوق کے حضور میں کوئی گستاخی کی۔ عاشق نے معشوق کو اُسکا طعنہ دیا جس پر مشتعل ہوکر اُس نے رقیب کو نہیں بلکہ عاشق کو قتل کر دیا۔ گویا عاشق کے قتل کا سبب جرم رقیب (گستاخی) ہوا۔ جو شخص لذت جفا کا خوگر ہو گیا ہو اُسکو لطف کا ستم کش ہونا کیونکر گوارا ہوگا کیونکہ عادت کے خلاف ہر چیز (لطف ہی کیوں نہ ہو) بُری معلوم ہوتی ہے۔ شاعر اپنی اُلٹی سمجھ کا رونا روتا ہے کہ غصہ کے وقت محبوب کے پیشانی کے بل کو اب سمجھ کر تمنا کے حوصلے بڑھ گئے اور بوسے لینے شروع کر دئے۔ اس شعر میں یہ لطف ہے کہ بل کو اگر الٹو تو لب ہو جاتا ہے۔ رقیب سے کہا کہ معشوق مجھ سے بے سبب خفا ہوا۔ (یعنی میں بے قصور تھا) ۔ عاشق نے معشوق سے اسی بات کو دہراتے ہوئے کہا کہ تم رقیب سے بے سبب خفا ہوئے اور اس میں پہلو یہ رکھا کہ دل رقیب میں محبت کا نہ ہونا اگر تمھارے نزدیک سبب ناراضگی ہے تو یہ قصور تو پہلے سے موجود تھا۔ آج کیا نئی بات ہوئی۔

بجلی[5] گری فغاں سے مری آسماں پر ۔۔۔ جو حادثہ کبھی نہ ہوا تھا سو اب ہوا

جی[6] طعنِ وصلِ حور سے کیسا جلا دیا ۔۔۔ روزِ جزا کا ذکر جو محفل میں شب ہوا

از[7] بسکہ تھی وصال میں غیروں سے ہمسری ۔۔۔ عیش و سرور باعثِ رنج و تعب ہوا

تھا[8] میں برنگِ شعلۂ جوّالہ بے قرار ۔۔۔ جی خاک ہو گیا مجھے آرام جب ہوا

بر[9] میں عدو کے سوئے بغل سے مری اُٹھے ۔۔۔ وہ کیا کہ سب کو جذبۂ دل سے عجب ہوا

اب[10] اذنِ انتقام جفائے فلک تو دوں ۔۔۔ سو بار جوشِ نالہ اجازت طلب ہوا

ربطِ بُتانِ دشمنِ دیں اتہام ہے ۔۔۔ ایسا گناہ حضرتِ مومن سے کب ہوا

۴۶

اے[11] آرزوئے قتل ذرا دل کو تھامنا ۔۔۔ مشکل پڑا ہے امر مرے قاتل کو تھامنا

تاثیر[12] بیقراریِ ناکام آفریں ۔۔۔ ہے کام اُن سے شوخ شمائل کو تھامنا

دیکھے[13] ہے چاندنی وہ زمیں پر نہ گر پڑے ۔۔۔ اے چرخ اپنے تو مہِ کامل کو تھامنا

---

[5] یعنی بجلی آسمان سے گرا کرتی ہے مگر میری فغاں آسماں رس سے آسمان پر بجلی گری۔ [6] غالباً مومن نے محفلِ معشوق میں قیامت کا تذکرہ کیا ہوگا۔ اس پر معشوق نے جلانے کے لیے اُن کو وصلِ حور کا طعنہ دیا۔ [7] شاعر کی رشک پسند طبیعت کو عیش و وصال بھی اس لحاظ سے باعثِ رنج ہے کہ اس میں غیروں سے برابری ہوتی ہے۔ [8] شعلۂ جوّالہ سے شعلۂ رقصاں یا شعلۂ گردندہ۔ شعلہ کی بقا کا راز اُس کی بیقراری میں مضمر ہے۔ اِدھر اُسکو سکون ہوا اُدھر فنا ہوگیا۔ [9] وہ میری بغل سے اُٹھ کر رقیب کی پہلو میں جا کر سو رہے۔ جذبۂ دل کی اس اُلٹی تاثیر پر سب کو تعجب ہوا کیونکہ جذبۂ دل کا کام تو کشش ہے نہ کہ نفرت۔ اس شعر کی طرز قیامت ہے۔ غالب لکھتے ہیں۔ خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے + کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے۔ دوسرے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ میرے اس جذبۂ دل پر سب کو حیرت ہوگئی کہ وہ سوئے تو رقیب کی آغوش میں اور اُٹھے (جاگے) میری بغل سے۔ دوسری صورت میں جذبۂ دل کے متعارف معنی لئے جائیں گے۔ [10] جوشِ نالہ نے مجھ سے سو بار لب سے نکلنے کی اجازت مانگی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب نالہ کو کم از کم جفائے فلک کا بدلہ لینے کا اذن دیدوں۔ [11] شاعر کہتا ہے کہ آرزوئے قتل میں میرا دل بیتاب ہے اسی وجہ سے قاتل کو میرا سنبھالنا مشکل ہو گیا ہے اسلئے آرزوئے قتل کو دل کی روک تھام کی تاکید کرتا ہے۔ [12] عاشق کی بیقراری کی تاثیر تو یہ ہونی چاہئے تھی کہ معشوق جو خود شوخ شمائل ہے اور زیادہ بیقرار ہو جاتا مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس لیے اُس کو بیقراریِ ناکام کہکر مخاطب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آفریں تو نے اتنا تو کیا اُن جیسے شوخ شمائل کو سکون آشنا رکھا۔ ایسے شوخ کو تھامنا بھی کار ے دارد۔ طنز کے اعتبار سے مضمون بے پناہ ہو گیا ہے۔ [13] کہیں مہِ کامل جوشِ رشک یا محویتِ جلوہ سے زمیں پر نہ گر پڑے۔

مضطر ہوں کس کا طرزِ سخن سے سمجھ گیا
اب ذکر کیا ہے سامعِ عاقل کو تھامنا

ہو صرصرِ فغاں سے نہ کیونکر وہ مضطرب
مشکل ہوا ہے پردہ محمل کو تھامنا

سیکھے ہیں مجھسے نالۂ نہ آسماں شکن
صیاد اب قفس میں عنا دل کو تھامنا

یہ زلفِ خم بخم نہ ہو کیا تاب غیر ہے
تیرے جنوں زدے کی سلاسل کو تھامنا

آسے ہمارا دم آہ تلخیِ ہجراں سے دم نہیں
گرتا ہے دیکھ جام ہلاہل کو تھامنا

سیماب وار مر گئے ضبطِ قلق سے ہم
کیا قہر ہے طبیعتِ مائل کو تھامنا

آغوشِ گور ہو گئی آخر لحد نہاں
آساں نہیں ہے آپ کے بسمل کو تھامنا

سینہ پہ ہاتھ دھرتے ہی کچھ دم پہ بنگئی
لو جان کا عذاب ہوا دل کو تھامنا

باقی ہے شوق چاک گریباں ابھی مجھے
بس اے رفوگر اپنی انامل کو تھامنا

مت مانگیو امان بتوں سے کہ ہے حرام
مومن زبان بیہودہ سائل کو تھامنا

سامعِ عاقل میرے طرزِ سخن سے سمجھ گیا کہ میں اُس کے عشق میں مضطر ہوں اور اس خیال نے اسکو ایسا خود رفتہ کر دیا کہ اب اُس کو سنبھالنا دشوار ہو گیا۔ فغاں کو صرصر (آندھی) سے مشابہت دی ہے۔ نہ آسمان شکن = نو آسمانوں کو توڑنے والا۔ یہ ترکیب لطیف اُردو میں مومن کی جدت ہے۔ رقیب جھ سے جنون زدہ کی زنجیر کو تیری زلفِ پُر خم نہ سمجھ لے۔ زلف تک تو اُس کی دسترس ہے مگر دیوانہ کی زنجیر کا روکنا کھیل نہیں۔ تلخیِ ہجراں سے تنگ آ کر عاشق خودکشی پر مائل ہے لیکن ضعف کی شدت سے جامِ زہر گرا پڑتا ہے۔ سیماب کی بیقراری کا دور ہونا اس کے کشتہ ہونے کے مترادف ہے۔ اسی طرح ضبطِ قلق میری ہلاکت کا باعث ہوا۔ انامل = انگلیوں کی پوریں۔ بیہودہ سائل = بیہودہ سوال کرنے والی۔ یعنی بتوں کے ستم اُٹھاتے جا اور اُن سے پناہ نہ مانگ۔ کیونکہ خدا کے سوا کسی دوسرے سے (خصوصاً بتوں) سے سوال کرنا حرام ہے۔

۴۷

لے اُڑی لاشہ ہوا لاغر بس تن ہوگیا — ذرۂ ریگِ بیاباں اپنا مدفن ہوگیا

بن[1] ترے اے شعلہ رو آتشکدہ تن ہوگیا — شمع قد پر میرے پروانہ برہمن ہوگیا

تھی کمیں[2] میں غارتِ بوسِ دہن ہنگامِ خواب — شب کی بیداری سحر کا خوابِ رہزن ہوگیا

ایک[3] ہی جنبش میں تھی صد راحتِ خوابِ عدم — طفلہائے اشک کو گہوارہ دامن ہوگیا

میرے[4] جلنے پر جو رویا غیر تیری بزم میں — سوزِ دل کو آبِ اشک آتش پہ روغن ہوگیا

پاؤں[5] زنداں سے اُٹھے کیا سر اُٹھا سکتے نہیں — حلقۂ زنجیر آخر طوقِ گردن ہوگیا

جھانکتے[6] ہیں کیا ملائک اس پری رخسار کو — پردۂ تو بر توِ افلاک چلمن ہوگیا

شہر میں ہے شہرہ کس قدر قیامت زا کا کیوں — جلوہ گاہِ حشر ہر ہر کوئے و برزن[7] ہو گیا

ہم[8] یقینی جوشِ وحشت سے فلک پر پہونچتے — خارِ دامنگیر پر عیسیٰ کی سوزن ہوگیا

آخر[9] اشکوں کے بھر آنے نے ڈبویا ہے مجھے — چشم کا سوراخ تو کشتی کا روزن ہوگیا

---

[1] تیرے ہجر میں میرا بدن آتشکدہ ہوگیا اور میرا قد شمع کی طرح جلنے لگا۔ جس کو دیکھکر برہمن پروانہ وار نثار ہونے لگا۔ برہمن اگنی دیوتا (آگ) کو قابل پرستش مانتے ہیں اسلیے شمع پر برہمن کا پروانہ وار فدا ہونا بیان کیا اس غزل کی پہلے تک لکھنؤ غالب ہے اور ابتدائی زمانہ کی تصنیف ہے۔ [2] معشوق وصل کی رات بھر جاگتا رہا آخر صبح ہوتے نیند آہی گئی۔ اُسکے سو جانے پر عاشق کو بوسۂ دہن کے مزے لوٹنے کا موقع ملا۔ گویا بوسۂ دہن لینے کی خواہش رات بھر گھات میں رہی اور وقت سحر محبوب کو محوِ خواب پاکر قزاقوں کی طرح لوٹنے کے لیے کمین سے باہر نکل آئی۔ [3] گہوارہ کے ہلانے سے بچوں کو نیند آجاتی ہے۔ طفل اشک جو آنکھ سے دامن پر گرے گرتے ہی خواب عدم میں پہنچ گئے گویا دامن کے جھٹکے نے گہوارہ جنبانی کا کام دیا۔ اشک کو مچلنے کے لحاظ سے طفل کہتے ہیں۔ [4] میرے سوز دل پر رقیب کو رحم آگیا اور وہ رونے لگا۔ اُس کے رونے پر رشک کی وجہ سے سوز دل اور بھڑک اُٹھا۔ یوں سمجھو کہ میرے سوز دل پر اُسکے آبِ اشک نے وہی تاثیر کی جو جلتی آگ پر تیل کرتا ہے۔ [5] قید زنداں میں پاؤں تو کیا ضعف کی وجہ سے سر اُٹھانا بھی محال ہے اس لحاظ سے میرے پاؤں کی زنجیر کا حلقہ میرے حق میں طوق کا حکم رکھتا ہے کہ سر اُٹھانا دشوار کر دیا۔

[6] افلاک کے تہ بہ تہ پردہ کو شاعر نے چلمن قرار دیا ہے جس سے فرشتے جھانکتے ہیں۔ [7] برزن = گلی۔

[8] حضرت عیسیٰ جب آسمان پر اُٹھائے گئے تو اتفاقاً آپ کے پیرہن میں ایک سوئی لگی چلی گئی۔ سامان دنیا کے اس تعلق کی وجہ سے آپ چوتھے آسمان سے آگے نہ بڑھ سکے۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ اسی طرح ہمارے دامن میں کانٹا اُلجھ گیا ورنہ ہم جوش جنوں میں آسمان پر پہونچ جاتے۔ گویا خار دامنگیر ہمارے حق میں سوزنِ عیسیٰ ہوگیا۔

[9] اپنی ہستی کو کشتی اور چشم کو اُس کا روزن ٹھہرایا ہے۔

خاک اُڑائی مَیں نے کیا طرزِ جنونِ قیس کی — شہ جہاں آباد سارا نجد کا بن ہوگیا

داغ سینہ سے دل و جان و جگر سب پُھک گئے — تھا چراغِ خانہ ہم کو برقِ خرمن ہوگیا

بیکسی سے نزع میں اپنے کو رویا آپ مَیں — دم جو کچھ باقی رہا تھا صرفِ شیون ہوگیا

اپنے ڈھب کی کیا پڑھی اک اور مومن نے غزل
دو ہی دن میں یہ تو کیسا ماہرِ فن ہوگیا

۲۸

مَیں[1] ہلاکِ اشتیاقِ طرزِ کُشتن ہوگیا — دوستی کیا کی کہ اپنا آپ دشمن ہوگیا

دھو دیا اشکِ ندامت نے گناہوں کو مگر — تر[2] ہوا دامن تو بارے پاکدامن ہوگیا

ہوگیا سُنکر نویدِ وصل شادی مرگ میں — لب تلک یہ زمزمہ آیا کہ شیون ہوگیا

کونسا گذرا یہاں سے شہسوارِ نازنیں — سبزۂ[3] تربت مرا پامالِ توسن ہوگیا

زخمِ نَو[4] بھی مرہمِ زخمِ کہن ہے چارہ گر — بند تیرِ یار سے سینہ کا روزن ہوگیا

نیم[5] جلوہ کو بھی وہ کہتے ہیں اب بے پردگی — جسمِ کاہیدہ یہ کس کا صرفِ چلمن ہوگیا

بسکہ مَیں سارے برس روتا رہا غم میں ترے — جیٹھ اور بیساکھ کا بھی چاند ساون ہوگیا

اُف رے سوزِ عشق بریاں دل کی تسکیں کے لیے — خرمنِ گل پر جو لوٹا وہ بھی گلخن[6] ہوگیا

[1] محبوب کے اندازِ قتل کے اشتیاق نے مجھے مار رکھا ہے۔ [2] دامن کا تر ہونا گنہگار ہونے سے عبارت ہے۔ [3] سبزہ کے دوسرے معنی ایک قسم کے گھوڑے کے ہیں اس لیے اس میں ایہام پیدا ہوگیا۔ توسن = گھوڑا۔ [4] تیرِ یار سے عاشق کے سینہ میں روزن ہوگیا تھا۔ اب دوسرا تیر جو اُسی جگہ آکر لگا تو تیر کی وجہ سے زخم کا روزن بند ہوگیا۔ اس طریقہ سے نئے زخم نے پُرانے زخم کو بھر دیا اور اُس کے لیے مرہم کا کام دیا۔ ایذا پسندی کی انتہا ہے۔ [5] کسی عاشق کا تن لاغر تنکا ہوکر چلمن میں جاکر مل گیا۔ جبھی تو محبوب پسِ چلمن بیٹھ کر نیم جلوہ دکھانے کو بھی بے پردگی تصور کرتا ہے۔ [6] گلخن = بھاڑ۔

اور کی چاہت کا تو نے جب کیا مجھ پر خیال — تب مجھے بھی تجھ سے وہمِ ربط دشمن ہوگیا

صاف تھا تو جب تلک مجھ سے تو میں بھی صاف تھا — ت — بدگمانی سے تری اب میں بھی بدظن ہوگیا

مومنِ دیندار نے کی بت پرستی اختیار

ایک شیخِ وقت تھا سو بھی برہمن ہوگیا

۳۹

قابو میں نہیں ہے دلِ کم حوصلہ اپنا — اس جور پہ جب کرتے ہیں تجھ سے گلہ اپنا

لبیک حرم ہم ہیں نہ ناقوسِ کلیسا — پھر شیخ و برہمن میں ہے کیوں غلغلہ اپنا

تھا[1] روزِ نخستیں غمِ شبہائے دراز آہ — طفلی سے ہے اختر شمری مشغلہ اپنا

ہلجاتے[2] ہی اغیار نکل آتے ہیں باہر — زنجیرِ درِ یار ہے یا سلسلہ اپنا

تھے[3] دشت میں ہمراہ مرے آبلہ چند — سو آپ ہی پامال کیا قافلہ اپنا

اس حال کو پہونچے ترے غصہ سے کہ اب ہم — راضی ہیں گر اعدا بھی کریں فیصلہ[4] اپنا

زندہ[5] نہ ہوا ہائے دلِ مردہ اگرچہ — تھا شورِ قیامت سے فزوں ولولہ اپنا

صورت وہی عظمت وہی گردش وہی کیسے — حیراں ہیں کہ یہ چرخ ہے یا آبلہ اپنا

انصاف کے خواہاں ہیں نہیں طالبِ زر ہم

تحسینِ سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا

[1] روزِ نخستیں سے زمانۂ طفلی اور غمِ شبہائے دراز سے خوفِ شبہائے فراق مراد ہے۔ قاعدہ ہے کہ اطفال مشغلہ بیکاری کے طور پر اختر شماری کیا کرتے ہیں اور ہجران نصیب غم غلط کرنے کی غرض سے۔ [2] سلسلہ = زنجیر تعلق۔ ذریعہ۔ جوں ہی میں زنجیرِ درِ یار ہلاتا ہوں اغیار جو گھر میں مصروفِ اختلاط ہوتے ہیں باہر نکل کر چلدیتے ہیں۔ گویا زنجیرِ درِ یار میرے لیے ذریعۂ کامیابی ہے۔ ادھر زنجیر ہلائی آدھر میرے مراسم کی سلسلہ جنبانی شروع ہوئی۔ [3] میں نے اس قدر دشت نوردی کی کہ آبلے پھوٹ گئے۔ آبلوں کو قافلہ قرار دیا ہے۔ [4] ہمارا فیصلہ کریں۔ [5] ولولہ سے یہاں جوشِ نالہ مراد ہے۔ شورِ قیامت سے مردے زندہ ہوجائیں گے مگر میرے نالہ سے دلِ مردہ زندہ نہ ہوا پر نہ ہوا۔

۴۰

راز[1] نہاں زبانِ اغیار تک نہ پہونچا — کیا ایک بھی ہمارا خط یار تک نہ پہونچا

اللہ ری ناتوانی جب شدتِ قلق میں — بالیں[2] سے سر اُٹھایا دیوار تک نہ پہونچا

روتے تو رحم آتا سو اُس کے روبرو تو — اِک قطرۂ خوں بھی چشمِ خونبار تک نہ پہونچا

عاشق[3] سے مت بیاں کر قتلِ عدو کا مژدہ — پیغام مرگ ہے یہ بیمار تک نہ پہونچا

بے بخت رنگ خوبی کس کام کا کہ میں تو — تھا گل ولے کسی کی دستار تک نہ پہونچا

مفت[4] اوّلِ سخن میں عاشق نے جان دیدی — قاصد ترا بیانِ اقرار تک نہ پہونچا

تھی[5] خارِ راہ تیری مژگاں کی یاد پہر شب — تا صبح خواب چشمِ بیدار تک نہ پہونچا

بختِ رسا عدو کا جو چاہے[6] سو کہے اب — اِک بار یار مجھ تک میں یار تک نہ پہونچا

غیروں سے اُس نے ہرگز چھوڑی نہ ہاتھا پائی — جب تک اجل کا صدمہ دو چار تک نہ پہونچا

مومن اُسی نے مجھ سے دی برتری کسی کو
جو پست فہم میرے اشعار تک نہ پہونچا

[1] عاشق کا خط جب محبوب کے پاس پہونچے گا تو لازماً اغیار کو محبوب کی زبانی مضمون خط کی خبر ہو جائے گی گویا اغیار کا واقف ہو جانا مکتوب کی رسید ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میرا راز نہاں رقیبوں کی زبان پر نہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ دوست تک کوئی خط نہیں پہونچا۔ [2] دیوار سے پھوڑنے کے لیے بالیں سے سر اُٹھایا تو ضعف سے دیوار تک نہ پہونچا۔ [3] قتل عدو کا مژدہ عاشق کے لیے باعث ہلاکت ثابت ہوگا کیونکہ وہ سُنتے ہی خوشی سے مر جائے گا اور یہ مژدہ اُس کے لیے اسی طرح مہلک ہوگا جیسے بیمار کے لیے پیغام مرگ۔ [4] معشوق نے قاصد سے عاشق کی ملاقات کا وعدہ کیا۔ قاصد نے واپس آکر پیغام پہونچایا۔ مگر عاشقِ محروم جو قدرتاً مایوس واقع ہوا ہے ناکامی کے ڈر سے تمہید ہی سُنکر مر گیا۔ قاصد کو بیانِ اقرار کی نوبت نہ آنے پائی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عاشق نے قاصد کی بات سُنتے ہی خوشی میں جان دیدی ہو اور پوری بات (بیانِ اقرار) نہ سُن پایا ہو۔ اس وجہ سے مفت کا لفظ استعمال کیا۔ [5] خواب چشم بیدار تک اِس لیے نہ پہونچا کہ مژگانِ یار کی یاد خارِ راہ کی طرح حائل تھی۔ مژگاں کی مشابہت خار سے ظاہر ہے۔ [6] یعنی عدو جس قدر چاہے ناز کرے۔

۱۴

وعدے[۱] کی جو ساعت دمِ کشتن ہے ہمارا | جو دوست ہمارا ہے سو دشمن ہے ہمارا

یہ کاہ ربا[۲] سے بھی ہیں کم اے کششِ دل | مذکور کچھ ایسا پسِ چلمن ہے ہمارا

افسوس[۳] موئے شمع شبِ وصل کی مانند | جو قہقہہ شادی ہے سو شیون ہے ہمارا

مہتاب[۴] کا کیا رنگ کیا دودِ فغاں نے | احوال شبِ تار سے روشن ہے ہمارا

دیتا[۵] نہیں اس ضعف پہ بھی جوشِ جنوں چین | ہر ریگ رواں دشت میں توسن ہے ہمارا

تفریح[۶] نہ کیونکر ہو ہوا آ نہیں سکتی | گویا درِ دلدار نشیمن ہے ہمارا

آغشتہ[۷] بخوں دست کو لو پونچھتے ہیں وہ | اُلٹے کفِ جلاد میں دامن ہے ہمارا

گر پاس[۸] ہے لوگوں کا تو آجا کہ قلق سے | ہے لاش کہیں اور کہیں مدفن ہے ہمارا

---

۱ جو معشوق کے وعدۂ دیدار کی ساعت ہے ۔ وہی ہمارا وقت قتل ہے یعنی ہم محویت جمال یا فرطِ مسرت سے وعدہ وفا ہونے پر مر جائیں گے ۔ اس اعتبار سے اُس کی دوستی بھی دشمنی کا پہلو رکھتی ہے ۔ ۲ کاہ ربا گھاس کو کھینچ لیتی ہے ۔ شاعر یہاں اپنی کشش دل کو غیرت دلاتا ہے اور کہتا ہے کہ معشوق پسِ چلمن بیٹھا ہوا ہمارے جذب دل کی تحقیر کر رہا ہے کہ کاہ ربا سے تو کاہ کھنچ آتی ہے مگر ان عشاق کی کشش سے چلمن کی تیلیاں بھی نہیں ہٹ سکتیں
۳ شبِ وصل میں شمع بجھا دی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ شمع کو شبِ وصل کے عیش سے کوئی تمتع نہیں ہوتا، مومن کا مطلب یہ ہے کہ اسی طرح ہم بدبخت بھی مسرت کے میسر ہوتے ہی ہلاک ہو گئے اور قہقہہ شادی ہمارے حق میں نوحہ ہو گیا ۔
۴ ہجر میں شبِ مہتاب دودِ فغاں کے اثر سے تاریک ہو گئی ۔ اب یہ شبِ تاریک ہمارے حال زار (تاثیر فغاں) پر روشنی ڈال رہی ہے ۔ تار اور روشن میں ایہام تضاد ہے ۔ ۵ ضعف کی یہ شدت ہے کہ ہر ذرۂ ریگ توسن کی طرح ہم کو اُڑائے پھرتا ہے اور وحشت کی یہ حالت ہے کہ اُس پر بھی ایک جگہ قرار نہیں ۔
۶ ہمارا نشیمن اس لحاظ سے درِ دلدار سے مشابہ ہے کہ اُس میں ہوا تک کا گزر نہیں اور جب نشیمن کو درِ دلدار سے اس قدر مناسبت ہے تو پھر وہاں تفریح کیوں نہ ہو ۔ ۷ چاہئے تو یہ تھا کہ دعوئے خون کے بنا پر دامنِ جلاد میرے ہاتھ میں ہوتا ۔ لیکن جلاد مجھے قتل کر کے میرا خون میرے ہی دامن سے پونچھ رہا ہے ۔ نئی بات ہے کہ جلاد کے ہاتھ میں مقتول کا دامن ہے ۔ ۸ جوش بے تابی سے میری لاش مدفن سے دور جا پڑی ہے ۔ اسلیے اب اگر تم لاش پر آئے تو لوگ بدنام نہیں کر سکتے کیونکہ میں قبر میں موجود نہیں ۔ قبر پر تم آتے تو لوگ چرچا کرتے ۔ یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ لاش اور مدفن کے تفرقہ سے لوگوں میں چرچا ہے جس سے تمھاری بدنامی کا ڈر ہے ۔ اگر بدنامی سے بچنا منظور ہے تو آؤ تا کہ جوش بے تابی کی یہ کیفیت اور جسد و لحد کا تفرقہ موقوف ہو ۔

جذبِ[9] دل اُسے کھینچ کے لائے تو کہاں لائے
جو غیر کا گھر ہے وہی مسکن ہے ہمارا

مقطع
بتخانے[10] سے کعبے کو چلے رشک کے مارے
مومن بلدِ راہ برہمن ہے ہمارا

۴۲

ہمسری اس زلف سے اب یہ بھی ایسا ہوگیا
لو مرے بختِ سیہ کو اور سودا ہوگیا

گو[11] جنازے پر عدو کے وہ خود آرا ہوگیا
پر ہمارا بھی تو مرجانا تماشا ہوگیا

کس طرح معلوم ہو حالِ دلِ گم گشتہ ہائے
جو کبوترے گیا واں نامہ عنقا ہوگیا

مرگ[12] سے تھی زندگی کی آس سو جاتی رہی
کیوں بُری حالت نہ ہووے غیر اچھا ہوگیا

ظلم کا ثمرہ یہی تھا دیکھکر گلہائے داغ
بید[13] مجنوں شرم سے وہ سروِ رعنا ہوگیا

چشمۂ[14] حیوان بنا اسکے لبوں کی شرم سے
پانی پانی بسکہ اعجازِ مسیحا ہوگیا

روزِ محشر کیا ہوا پھر کیوں شبِ دیجور ہے
کیا ہمارا[15] نامۂ اعمال کچھ وا ہوگیا

بیوفائی ہے سرشت اسکی سو وہ ہم میں کہاں
ہم[16] مزاجی کے سبب سے غیر اپنا ہوگیا

[9] محبوب کے اشتیاق دید میں ہم نے رقیب کے گھر کو اپنا مسکن بنا لیا ہے - اس لیے کہ وہ وہیں ملتا ہے - اب ہمارا جذبۂ دل اُسے کھینچکر لائے تو کہاں لائے - [10] بتوں کی پرستاری میں ہم اور برہمن دونوں شریک تھے مگر ہماری غیرت نے اس رقابت کو گوارا نہ کیا اس لیے ہم نے بتخانہ چھوڑ کر کعبہ کی راہ لی - اس لحاظ سے برہمن نے ہمارے حق میں خضر کا کام دیا جس سے راہ حق ملی - بعض نسخوں میں بلدِ راہ ہے بلد کے معنی ہیں رہبر -

[11] معشوق رقیب کے جنازے پر آیا جس کے رشک سے عاشق نے جان دیدی - اب عاشق شکوہ سنج ہے کہ ہمارا مرجانا بھی تو تماشے کی حیثیت رکھتا تھا - معشوق کو ہمارے جنازے پر بھی آنا تھا گو بتقریب تماشا ہی سہی - [12] رقیب کی مرگ سے مجھے اپنی زندگی کی آس تھی - [13] وہ سرورعنا شرم سے بیدمجنوں کی طرح خم ہوگیا - [14] محبوب کے لب معجز نما کی شرم سے اعجاز مسیحا پانی پانی ہوگیا اور اُسنے چشمۂ حیوان کی شکل اختیار کرلی - پانی پانی ہونا = خجل ہونا شاعر نے یہاں پانی کے لفظ سے فائدہ لیا ہے - [15] ہمارے نامۂ اعمال کی سیاہی کی وجہ سے روز محشر شب دیجور بنگیا - [16] بیوفائی کے لحاظ سے معشوق اور رقیب دونوں کا مزاج یکساں واقع ہوا ہے - اسلیے دونوں میں اتحاد ہے - کند ہم جنس با ہم جنس پرواز -

جان و دل پر لشکر آرائی تھی جوشِ یاس کی — مفت اس بلوے میں شب خونِ تمنا ہو گیا

ہٹ گیا ہوگا دوپٹہ منہ سے سوتے میں کہیں — شب یہاں ہنسنے کا تیرے سب میں چرچا[۵۷] ہو گیا

لگ گئی چپ مجھکو تو بھی بات وہ کرتا نہیں — کیا کہوں قسمت کو کہنا دشمنوں کا ہو گیا

شربتِ[۵۸] مرگ آبِ حسرت شور بختی زہرِ غم — تلخکامی سے مجھے کیا کیا گوارا ہو گیا

رو دیا[۵۹] اس نے جو میری لاغری کو دیکھکر — قطرۂ اشکِ ندامت مجھکو دریا ہو گیا

ہے مشبک[۶۰] بسکہ روتے روتے چشم اے مہرو — شب جو اشک آیا سو اک عقدِ ثریا ہو گیا

حق تو یہ ہے کیا غزل اک اور مومن نے پڑھی — آج باطل سارے استادوں کا دعویٰ ہو گیا

۴۳

میں تو دیوانہ تھا اس کی عقل کو کیا ہو گیا — قیس کہتا ہے[۶۱] مجھے ناصح کو سودا ہو گیا

جوشِ[۶۲] عشق و حسن نے کیا رنگ بدلا دیکھنا — اشک خونی سے مرے منہ زرد اسکا ہو گیا

سینہ زن یا جامہ در ہوتا ہے بن ماتم کوئی — آپ اپنے ہاتھ سے میں ہائے رسوا ہو گیا

صور تھی منقارِ مرغِ صبح پہلو سے مرے — وہ قیامت قد جو اٹھا حشر برپا ہو گیا

زخم کھایا زہر کھایا تو بھی کچھ ہوتا نہیں — دیر گذری مرگ کو کیا جانئے کیا ہو گیا

---

۵۷ چرچے کی وجہ یہ ہوگی کہ منہ کھل جانے سے شب کی تاریکی روشنی سے مبدل ہو گئی ۔ اسلیے لوگ واقف ہو گئے

۵۸ مصائب کے سبب سے منہ کا مزہ اس قدر بگڑ گیا کہ شربت مرگ وغیرہ کی تلخی بھی ناگوار نہیں معلوم ہوتی

۵۹ معشوق میری لاغری کو دیکھکر جو اسکے جور بیہم کا نتیجہ تھی، رو دیا مگر اسکا قطرۂ اشک ندامت میرے حق میں ڈبونے کے لیے دریا ہو گیا یعنی مجھ سے اسکی شرمندگی نہ دیکھی گئی ۔ ۶۰ مشبک = سوراخ دار ۔ عقد ثریا نظم پرویں جو بہت سے ستاروں پر مشتمل ہے ۔ رونے سے آنکھ میں سوراخ ہو گئے اور ہر سوراخ سے آنسو چھلکنے لگے جس سے عقد ثریا کی حالت پیدا ہو گئی ۔

۶۱ ناصح کو سودا ہو گیا ہے کہ مجھے قیس کہتا ہے حالانکہ قیس کا جنون میرے جنون سے کہیں کم تھا ۔ ۶۲ حسن کے لیے سرخی اور عشق کے لیے زردی لازم و ملزوم ہیں ۔ لیکن عشق و حسن کا رنگ بدلنا دیکھو کہ میرے اشک سرخ کو دیکھکر (ندامت یا خوف رسوائی سے) معشوق کا منہ زرد ہو گیا ۔

یہ کسی[۵۲] سے ہو کہ اُن لطفوں پہ گستاخی نہ ہو — غیر ہمسا کب ہوا ہر چند ہمسا ہو گیا

یوں[۵۳] لبِ خنجر کے بوسے متّصل لینے نہ تھے — زخم کاری کی ہنسی میں کام میرا ہو گیا

سُرمۂ تسخیر[۵۴] سے ہم خود مسخّر کیوں نہ ہوں — آنکھ کی پُتلی جو تھی جادو کا پُتلا ہو گیا

نو فلک ہیں کیا کرے یہ نالۂ آتش فشاں — ایک دشمن سر سے کھویا اور پیدا ہو گیا

کفر[۵۵] ہے بے گلرخِ ترسا تماشائے چمن
گلشن اپنے حق میں لے مومن کلیسا ہو گیا

۴۴

کیا رشک[۵۶] غیر تھا کہ تحمّل نہ ہو سکا — میں جا نکر حریف تغافل نہ ہو سکا

ہوتا[۵۷] ہے آہ صبح سے داغ اور شعلہ زن — کیسا چراغ تھا یہ کبھی گُل نہ ہو سکا

اُس[۵۸] نے جو دل کو مُنہ نہ لگایا دو نیم ہے — یہ جام جم ہوا قدحِ مُل نہ ہو سکا

۵۲ تمھارے کرم کے باوجود گستاخ نہ ہونا رقیب کے بس کی بات نہیں - ہر چند وہ ہماری طرح مورد الطاف ہو گیا لیکن ہمارا سا ظرف کہاں سے لائے - ۵۳ زخموں نے لبِ خنجرِ قاتل کے بوسے لیے اور عاشق کی جان پر بن گئی - اُن (زخموں) کی تو ہنسی ہوئی، اس غریب کا کام ہو گیا - زخم کے لیے ہنسی کا لفظ بھی خالی از لطف نہیں - ۵۴ سرمۂ تسخیر = وہ سرمہ جس میں عمل یا سحر سے ایسی تاثیر ہو کہ جو اُسے لگائے دوسرے اُسکے مطیع ہو جائیں، مطلب یہ ہے کہ ہم نے سرمہ تو اس لیے لگایا تھا کہ معشوق مسخّر ہو۔ مگر اُلٹا اثر دیکھئے کہ ہم خود مسخّر ہو گئے - گویا ہماری آنکھ کی پتلی نے جادو کے پتلے کا کام کیا اور ہمیں (معشوق کا) مطیع بنا دیا - ۵۵ ترسا = عیسائی چونکہ اُسکے بغیر تماشائے چمن کفر ہے - اسلیے چمن ہمارے حق میں کلیسا کا حکم رکھتا ہے - ظاہر ہے کہ کلیسا اہل کفر (عیسائیوں) کا معبد ہے -

۵۶ میں حریف تغافل نہ ہو سکا یعنی میں نے معشوق کے تغافل کو گوارا نہ کیا اور میرا یہ فعل بالارادہ تھا - اس کو میری کم حوصلگی پر محمول نہ کرنا چاہئے - ورنہ یہ رشک غیر تو نہ تھا جس کا تحمّل مجھ سے ممکن نہیں - اس میں عاشق نے معشوق کے تغافل پر اپنی بے تابی کی توجیہ کی ہے -

۵۷ چراغ ہوائے صبح سے گُل ہو جاتے ہیں مگر یہ چراغ (داغِ دل) آہِ صبح سے اور شعلہ زن ہوتا ہے -

۵۸ اگر محبوب میرے دل کو مُنہ لگاتا تو یہ قدحِ شراب کا مرتبہ حاصل کرتا - مگر ایسے نصیب کہاں - اُسکے مُنہ لگانے کی وجہ سے یہ دو نیم ہو گیا اور جام جم ہو کر رہ گیا - جام جم سے مراد جمشید کا پیالہ ہے جو جہاں نما تھا اور جس میں کرۂ ارض کا نقشہ نظر آتا تھا یعنی میرا دل دو نیم جام جم تو بن گیا مگر محبوب کی بے التفاتی کے باعث قدحِ مل ہونے کی عزّت حاصل نہ کر سکا - ظاہر ہے کہ قدحِ مُل کو وہ مُنہ لگاتا ہے -

عاشق[1] نہ ہو کہیں کہ اُنھیں قتل غیر میں ... مشکل بنی کچھ ایسی تساہل نہ ہو سکا

کہتے[2] ہیں گلشن اپنی گلی اُسکے دم سے تھی ... دشمن جو ہم ترانۂ بُلبُل نہ ہو سکا

نفرت[3] تھی اس قدر کہ نہ ٹھہرے وہ صبحدم ... پاسِ درازیِ شبِ کاکل نہ ہو سکا

پروردۂ[4] وفا سے ہو کب ترک عاشقی ... کیا ناز تھے کہ مجھ سے تحمّل نہ ہو سکا

وہ عکس[5] زلف چشم عدو میں پڑا نہ ہو ... نظّارہ مجھ سے جانبِ سنبل نہ ہو سکا

تنگی وحشی[6] رہی دلِ صدچاک کی ہوا ... یہ غنچہ پاش پاش مگر گُل نہ ہو سکا

ہجرِ[7] بتاں میں تجھکو ہے مومن تلاش زہر

غم پر حرام خوار توکّل نہ ہو سکا

۴۵

شوخ[8] کہتا ہے بے حیا جانا ... دیکھو دشمن نے تم کو کیا جانا

شعلۂ[9] دل کو نازِ تابش ہے ... اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا

[1] معشوق کو قتل غیر میں کچھ ایسی مشکل بنی کہ دیر نہ لگا سکا اور فوراً ہی اُسکا گلا کاٹنے لگا دیا - اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ (غیر) کہیں اُس پر عاشق نہ ہو - اس لیے کہ معشوق کو اہل ہوس کے قتل سے کیا سروکار۔ اُسکے تختۂ مشقِ ستم تو صرف عشاق ہیں - [2] رقیب کے بعد معشوق کو تاسف ہے اور وہ کہتا ہے کہ میری گلی اُسکے دم سے گلشن تھی - عاشق کو اس پر شکایت پیدا ہوئی کہ ایسے شخص کی نسبت جو نالہ کشی میں بُلبل کی ہمسری بھی نہ کر سکا یہ کہنا (کہ میری گلی اسکے دم سے گلشن تھی) بالکل دور از حقیقت ہے - [3] محبوب کو مجھ سے اس قدر نفرت تھی کہ صبح ہوتے ہی میرے پاس سے چلدیا اور درازی شب کاکل کا بھی خیال نہ کیا - حالانکہ شب کاکل کی درازی اس قدر ہے کہ اُس کی صبح ہی نہیں - [4] معشوق کے ناز بیجا ایسے تھے کہ میں برداشت نہ کر سکا - ورنہ اہل وفا سے عشق ترک نہیں ہوتا -

[5] عاشق سے سنبل کی جانب نہ دیکھا گیا - اُس کی توجیہ یوں کرتا ہے کہ شاید رقیب نے زلف یار کا نظارہ کیا ہے جسکے اثر سے میں سنبل کی طرف (جو ہم شکل زلف ہے) دیکھنا گوارا نہ کر سکا - [6] "انتہا ہوا" کا تعلق مصرع ثانی سے ہے - مراد یہ ہے کہ غنچۂ تنگ جب پاش پاش ہوجاتا ہے تو گل ہوجاتا ہے اور اُس کی تنگی دور ہو جاتی ہے - مگر دل صدچاک ہو کر بھی بدستور تنگ ہے - [7] یعنی غم پر توکل کرنا چاہتے تھا کیونکہ زہر حرام ہے - اسی لیے حرام خوار کا لفظ استعمال کیا -

[8] دشمن تمھیں شوخ کہتا ہے دوسرے لفظوں میں اسکے معنی یہ ہوئے کہ وہ تمھیں بے حیا جانتا ہے - شوخ کے معنی بے حیا بھی ہیں
[9] میرے شعلۂ دل کو اپنی چمک پر ناز ہے - ذرا آکر اپنا جلوہ دکھا دو کہ اسکا غرور مٹ جائے - اس شعر میں خاص شاعرانہ ہے -

شوق[۳] نے دور باش اعدا کو	اُس کی محفل میں مرحبا جانا
گلے لگتا ہے دم بدم مجھکو	طوقِ گردن نے کیا خفا جانا
اُسکے اُٹھتے ہی ہم جہاں سے اُٹھے	کیا قیامت ہے دل کا آجانا
گھر[۴] میں خودرفتگی سے دھوم مچی	کیونکہ وُاس تلک مرا جانا
پوچھنا[۵] حال یار ہے منظور	میں نے ناصح کا مدعا جانا
مے[۶] نہ اُتری گلے سے جو اُس بن	مجھکو یاروں نے پارسا جانا

شکوہ[۷] کرتا ہے بے نیازی کا
تو نے مومن بتوں کو کیا جانا

۴۶

اس وسعتِ کلام سے جی تنگ آگیا	ناصح تو میری جان نہ لے دل گیا گیا
ضد سے وہ پھر رقیب کے گھر میں چلا گیا	اے رشک میری جان گئی تیرا کیا گیا
ضعف[۱] ہے تو دم سے بھی کب تک چلا گیا	خودرفتگی کے صدمے سے مجھکو غش آگیا
کیا[۲] پوچھتا ہے تلخیِ الفت میں پند گو	ایسی تو لذتیں ہیں کہ تو جان کھا گیا

[۳] میرا شوق اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ محفل یار میں جا پہونچا اور رقیبوں کی للکار کی پروا نہ کی۔ بلکہ اُنکی "دورباش" کو مرحبا جانا۔ [۴] خودرفتگی عشق سے یہ مطلب تھا کہ اُسکی بدولت محبوب تک رسائی ہو سکے گی۔ مگر میرے خودرفتہ ہوتے ہی تمام گھر میں چرچا ہو گیا۔ اب اُس تک کیونکر پہونچونگا۔ خودرفتگی کے لفظ سے خاص فائدہ لیا ہے۔ [۵] ناصح نصیحت کے پردے میں چھیڑ چھیڑ کر مجھ سے حال یار پوچھنا چاہتا ہے۔ کہیں وہ بھی اُس پر عاشق نہو گیا ہو۔ [۶] بت ذاتی اختیار نہیں رکھتے۔ جو کرتا ہے خدا کرتا ہے۔ اب تو جو بتوں کی بے نیازی کی شکایت کرتا ہے تو نے اُن کو کیا جانا۔ اگر وہ باوجود قدرت نہ ہونے کے بے نیازی کرتے تو شکایت کا موقع تھا۔

[۱] لوہیں جانا تو رکتا۔ میں ذرا آپ سے کیا ہوا تھا یا خودرفتہ ہوا تھا کہ فوراً غش آگیا۔ جب ضعف کی یہ شدت ہے تو دم کیونکر چل سکے گا۔ یہاں بھی لفظ خودرفتگی پر تمام شعر کی بنیاد رکھی ہے۔ [۲] ناصح تو مجھے تلخی الفت یاد دلا کر عشق سے باز رکھنا چاہتا ہے۔ مگر اس تلخی میں ایسی لذتیں ہیں کہ تو ہر وقت اُسی کا ذکر کرتا رہتا ہے "جان کھانا" (بیہودہ گوئی سے پریشان کرنا) سے شاعر نے خاص فائدہ لیا ہے۔ "تلخی" "لذت" "جان کھا جانا" میں رعایت ہے۔

۳ه آنکھ بند ہوتے ہی آنکھیں سی کھل گئیں
جی اک بلائے جان تھا اچھا ہوا گیا

۴ه میرا گلا ہنسی سے یونہی گھونٹتے تھے وہ
کیا سوچ کر رقیب خوش آیا خفا گیا

آنکھیں جو ڈھونڈھتی تھیں نگہہا التفات
گم ہونا دل کا وہ میری نظروں سے پا گیا

۵ه جلتی ہے جان آتشِ خس پوش دیکھکر
چلون سے شعلہ رو کوئی جلوہ دکھا گیا

۶ه بوئے سمن سے شاد تھے اغیار بے تمیز
اس گل کو اعتبار نسیم و صبا گیا

آہِ سحر ہماری فلک سے پھری نہ ہو
کیسی ہوا چلی یہ کہ جی سنسنا گیا

آتی نہیں بلائے شبِ غم نگاہ میں
کس مہروش کا جلوہ نظر میں سما گیا

۷ه اے جذب دل نہ تھم کہ نہ ٹھہرا وہ شعلہ رو
آیا تو گرم گرم و لیکن چلا گیا

۸ه مجھ خانماں خراب کا لکھا کہ جانکر
وہ نامہ غیر کا مرے گھر میں گرا گیا

۹ه مہندی ملے گا پاؤں سے دشمن تو آن کر
کیوں میرے تفتہ سینے کو ٹھوکر لگا گیا

۱۰ه بوسہ صنم کی آنکھ کا لیتے ہی جان دی
مومن کو یاد کیا حجر الاسود آ گیا

۳ه موت آتے ہی آنکھوں سے پردۂ غفلت اُٹھ گیا۔ ۴ه رقیب اس خیال سے خوش تھا کہ معشوق میرا (مومن کا) گلا واقعی گھونٹ رہا ہے۔ مگر جب یہ معلوم ہوا کہ وہ ہنسی میں گلا گھونٹ رہا ہے تو خفا ہو کر چلا گیا۔ گلا گھونٹنا اور خفا میں رعایت ہے۔ کیونکہ خفا (خفہ) کے لغوی معنی گلوا فشردہ ہیں۔

۵ه آتش خس پوش سے مراد جلوۂ پسِ چلمن ہے۔ معشوق شعلہ رو کو آتش سے اور چلون کو خس سے تشبیہ دی ہے۔ ۶ه نسیم و صبا نے اُس گل (معشوق) کی بو اغیار تک پہونچائی مگر وہ اپنی بد ذوقی اور پست فطرتی کی بنا پر تمیز نہ کر سکے اور اُسکو بوئے سمن سمجھکر شاد ہو گئے۔ اس پر معشوق کو نسیم و صبا کی جانب سے بھی بے اعتباری پیدا ہو گئی کہ اُنھوں نے میری بو نا اہلوں تک کیوں پہونچائی۔ شعر مرا بمدرسہ کہ برد۔

۷ه وہ شعلہ رو دوراروی میں میرے پاس آیا مگر فوراً ہی واپس چلا گیا۔ اے جذب دل تیرا اتنا اثر تو ہوا۔ ابھی اپنی سعی عمل جاری رکھ۔ ۸ه لکھا = نوشتۂ قسمت۔

۹ه ٹھوکر لگانے کے لیے میں ہوں اور مہندی ملنے کو رقیب ہو۔ یہ کہاں کی منصفی ہے۔

۱۰ه چشم سیاہ کو حجر الاسود سے مناسبت دی ہے۔

۴۷

وہ[1] ہنسے سُن کے نالۂ بلبل کا   مجھے رونا ہے خندۂ گل کا

دھیان[2] ہے غیر کے تحمّل کا   ہوش دیکھا ترے تغافل[2] کا

ہم[3] کسی شانہ بیں سے پوچھیں گے   سبب آشفتگیِ کاکل کا

لاش کس کی ہے یہ عدو سے پوچھ   میں ہوں کشتہ ترے تجاہل[4] کا

حال[5] ساقی سے کہکے روتا ہوں   کہ محرّک ہے خندۂ قلقل کا

نکہت اس زلف کی صبا میں نہ ہو   اُڑ گیا رنگ[6] بوئے سنبل کا

جلوہ دکھلائے تا وہ پردہ نشیں   میں[7] نے دعویٰ کیا تحمّل کا

نالۂ[8] شب نے یہ ہوا باندھی   ہوگیا گُل چراغ بلبل کا

حیلۂ[9] بے خودی سے ہے مومن
توڑنا ہم کو شیشۂ مُل کا

[1] معشوق اس قدر بے درد ہے کہ نالۂ بلبل سُنکر ہنستا ہے اور میں اس درجہ رقیق القلب ہوں کہ خندۂ گل پر مجھے رونا آتا ہے۔ اگر وہ سے گُل مراد لیا جائے تو یہ معنی ہونگے کہ گُل نالہ بلبل سُنکر ہنستا ہے اور مجھے اُسکی ہنسی پر رونا آتاہے۔ رونے کی وجہ خندہ گُل کے انجام کا خیال ہے۔ [2] تو تغافل تو کرتا ہے مگر پھر بھی بہ اندازہ تحمل غیر کرتا ہے۔ یعنی یہ دھیان رکھتا ہے کہ غیر کی برداشت سے زیادہ نہ ہو۔ گویا تیری تغافل شعاری بھی اس قدر ہوش رکھتی ہے۔ ہوش اور تغافل میں تضاد ہے۔ [3] شانہ بیں = فال بتانے والا۔ ایران میں قاعدہ ہے کہ شانۂ گوسفند پر نقش لکھکر اُس سے فال لیتے ہیں۔ [4] تجاہل = انجان بننا۔ [5] میں حالت مستی میں ساقی سے اپنا حال کہکر روتا ہوں۔ کیونکہ خندۂ قلقل میرے اس فعل کا محرّک ہے۔ شراب کی آواز (قلقل) کو خندہ سے نسبت دیتے ہیں اور قلقل صیغہ امر بھی ہے یعنی کہہ کہہ۔ مُراد یہ ہے کہ عرض حال کے بعد گریۂ مستی خندۂ قلقل کے اثر سے ہے [6] بوئے سنبل کا رنگ شرم سے اُڑ گیا۔ انتشار بو کو رنگ اُڑ جانا قرار دیاہے۔ [7] میں نے اپنے ضبط کا (غلط) دعویٰ کیا تاکہ محبوب ضد سے جلوہ دکھائے اور میرے دعوے کو باطل کرے۔ [8] میرے نالۂ شب نے بلبل کی فغاں کو بھی مات کر دیا۔ ہوا اور چراغ گُل ہونے میں رعایت ہے۔ [9] مے نوشی سے مومن کی غرض صرف یہ ہے کہ حیلۂ بیخودی سے شیشہ شراب کو توڑے ورنہ میخوار توڑنے میں مزاحم ہونگے۔

۴۸

اشک[1] واثر و نہ اثر باعثِ صد جوش ہوا — ہچکیوں سے مَیں یہ سمجھا کہ فراموش ہوا

جلوہ[2] افزائیِ رُخ کے لیے مے نوش ہوا — مَیں کبھی آپ میں آیا تو وہ بیہوش ہوا

کیا یہ پیغامبرِ غیر ہے اے مُرغِ چمن — خندہ زن بادِ بہاری سے وہ گُل گوش[3] ہوا

ہے یہ غم گور میں رنجِ[4] شبِ اول سے فزوں — کہ وہ مہرو مرے ماتم میں سیہ پوش ہوا

مجھ[5] پہ شمشیرِ نگہ خود بخود آپڑتی ہے — عاجز احوالِ زبوں سے وہ ستم کوش ہوا

آفریں[6] دل میں رہی خنجرِ دشمن کے سبب — اپنے قاتل سے خفا تھا کہ مَیں خاموش ہوا

درد[7] شانہ سے ترا محوِ نزاکت خوش ہے — کہ میں ہمدوش ہوں گو غیر بھی ہمدوش ہوا

وہ[8] ہے خالی تو یہ خالی یہ بھرے تو وہ بھرے — کاسۂ عمرِ عدو حلقۂ آغوش ہوا

تُو[9] نے جو قہرِ خدا یاد دلایا مومن
شکوۂ جورِ بتاں دل سے فراموش ہوا

---

۱ واثر و نہ اثر = اُلٹے اثر والا۔ جب کسی کو ہچکیاں آتی ہیں تو خیال کیا جاتا ہے کہ کسی دوست نے اسکو یاد کیا مگر چونکہ میرے گریہ کی تاثیر اُلٹی ہے میں ہچکیوں سے سمجھتا ہوں کہ محبوب نے مجھے فراموش کر دیا اور اس لیے میرا جوش بیتابی اور بڑھ جاتا ہے۔ ۲ میں جلوۂ یار سے بیہوش تھا۔ جب ذرا ہوش میں آیا تو اُسنے مجھے دوبارہ بیخود کرنے کی غرض سے شراب پی تاکہ اپنی مے جلوہ کو دوآتشہ کرے۔ غرض میں تو ہوش میں آگیا مگر وہ (نشۂ شراب سے) بیہوش ہوگیا۔
۳ گل گوش = معشوق جسکے کان گُل سے مشابہ ہیں۔ ۴ مشہور ہے کہ قبر کی پہلی رات بھاری ہوتی ہے۔
۵ وہ ظالم میرے احوال زبوں سے عاجز آگیا ہے کہ گو وہ خود مجھ پر وار نہ کرے مگر اسکا کیا علاج کہ مجھپر شمشیر نگہ خود بخود آپڑتی ہے۔ ۶ میرے قاتل نے مجھپر رقیب کے خنجر سے وار کیا۔ مَیں نے چاہا کہ اُسکی چابکدستی اور صفائی پر آفریں کہوں مگر خنجر رقیب کی وجہ سے مَیں خاموش ہوگیا اور آفریں دل کی دل میں رہ گئی۔ عاشق کو قتل کی شکایت نہیں بلکہ خنجر دشمن سے قتل ہونے کی شکایت ہے۔ ۷ محو نزاکت سے عاشق مراد ہے۔
ہمدوش کے دو معنی ہیں۔ ایک ہمسر اور دوسرے ہم بغل۔ مطلب یہ ہے کہ اُدھر غیر کے ہمدوش ہونے کی وجہ سے تیرے شانہ (یا دوش) میں درد پیدا ہوگیا ہے۔ اِدھر تیرا عاشق درد شانہ میں مبتلا ہے۔ اس اعتبار سے عاشق کو اطمینان ہے کہ تجھ سے یک گونہ نسبت حاصل ہوگئی اور تیری ہمدوشی میسر آئی (گو کسی معنی میں سہی)۔
۸ جب تک عمر عدو کا کاسہ (پیمانہ) خالی ہے میرا حلقۂ آغوش بھی خالی ہے اور جب اُسکا کاسۂ عمر بھرے گا میرا حلقۂ آغوش بھی بھرے گا۔ یعنی دوست سے میرا وصال رقیب کے مرنے پر موقوف ہے۔
۹ یعنی قہر خدا جور بتاں سے بھی بڑھا ہوا ہے۔

۴۹

چلمن[1] کے بدلے مجھکو زمیں پر گرا دیا
اُس شوخ بے حجاب نے پردہ اُٹھا دیا

برق آہ کو جو میں نے کہا مسکرا دیا
دل گرمیوں[2] نے اُس کی کلیجا جلا دیا

فرماتے[3] ہیں وصال ہے انجام کارِ عشق
کیا ناصحِ شفیق نے مژدہ سنا دیا

دھوتا[4] ہے عہد نامۂ غیر اپنا حال دیکھ
آبِ حیا نے خطِ جبیں کیا مٹا دیا

تاثیر[5] سوزِ دل کرۂ نار ہے مگر
اُس شعلہ رو کو سینہ سے میرے لگا دیا

کیا[6] شاد شاد ہوں کہ وہ ہے تلخ کام تر
میری جو شورشوں نے عدو کو مزا دیا

دیکھا[7] نہ میرے نالۂ آہن گداز نے
آئینہ دیکھنے کا تماشا دکھا دیا

رشکِ[8] فغاں کی ہائے رقیب آفرینیاں
محشر نے خفتگانِ زمیں کو جگا دیا

مٹی[9] نہ دی مزار تلک آ کے اس پہ بھی
کہتے ہیں لوگ خاک میں اُس نے ملا دیا

١؎ اُس شوخ بے حجاب نے چلمن اُٹھا کر مجھے جلوہ دکھا دیا جسکے اثر سے میں غش ہو کر گر پڑا۔ گویا اسنے چلمن کے بدلے مجھے زمین پر گرا دیا۔ ٢؎ دل گرمی = شوخی۔ شرارت۔ ٣؎ شاعر نے وصال کے لفظ سے فائدہ لیا ہے۔ ناصح کی مراد تو یہ تھی کہ وصال (موت) انجام کارِ عشق ہے۔ عاشق نے یہ سمجھا کہ وصل کی اُمید دلاتا ہے۔ شعر میں صنعت القول بالموجب ہے۔ ٤؎ معشوق اپنی رسوائی دیکھکر شرمندہ ہوتا ہے اور غیر سے جو عہدِ محبت اُس نے کیا تھا اُسکو شکست کرتا ہے۔ گویا آبِ خجالت اسکے خطِ جبیں کے مٹانے کا باعث ہوا۔ خطِ جبیں سے مراد عہدِ محبت ہے جس کو نوشتۂ قسمت کی طرح پہلے اُس نے اپنے ذمے لازم کر لیا تھا۔ ٥؎ میرے سوزِ دل کی تاثیر نے شعلہ رو معشوق کو میرے سینے سے لگا دیا۔ ہو نہ ہو میرا سوزِ دل کرۂ نار کا حکم رکھتا ہے چونکہ ہر چیز اپنے اصل کی طرف رجوع کرتی ہے اسلیے شعلہ کا کرۂ نار کی جانب کھنچ آنا ضروری ہے۔ ٦؎ میری بیتابیوں سے دشمن نے لطف اُٹھایا۔ مگر چونکہ وہ بیتابیاں تلخکامی (غم) کا نتیجہ تھیں اسلیے اس نسبت سے وہ (دشمن) مجھ سے بھی زیادہ تلخکام ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں شاد شاد ہوں۔ تلخکام۔ شورش اور مزہ میں ایہام تناسب ہے۔ ٧؎ نالۂ آہن گداز = وہ نالہ جسکی گرمی لوہے کو پگھلا دے یعنی میں نے جو نالہ آہن گداز کیا تو اُسکے اثر سے آئینہ پگھل گیا اور معشوق کو خود بینی کا نتیجہ مل گیا۔ واضح رہے کہ پہلے لوہے کو صیقل کر کے آئینہ بنایا کرتے تھے۔ ٨؎ میری فغاں کے رشک میں محشر نے شور برپا کر کے خفتگانِ زمیں کو جگا دیا اور اس طریقہ سے میرے لاکھوں رقیب پیدا ہو گئے کیونکہ قیامت کے مجمع عام میں جس نے معشوق کو دیکھ لیا فریفتہ ہو گیا۔ رقیب آفرینیاں کی ترکیب اور تخئیل دونوں مومن کا حصہ ہیں۔ ٩؎ خاک میں ملا دینا دو معنی رکھتا ہے۔ پہلے حقیقی اور دوسرے مجازی یعنی تباہ کر دینا۔ لوگوں نے اسکو مجازی میں بیان کیا مگر شاعر حقیقت کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ شعر میں خاص شوخی اور طنز ہے۔

ہمدم دکھا اب اس کو کسی ڈھب کہ رحم آئے — ناصح کو میرے حالِ زبوں نے رُلا دیا

اُس کی شرارتوں[۱۰] سے جگر داغ داغ ہے — گل کھانے کو رقیب کا چھلّا منگا دیا

ایسی غزل کہی یہ کہ جھکتا ہے سب کا سر
مومن نے اس زمین کو مسجد بنا دیا

(۹) ۱۵۰

دل قابلِ محبّتِ جاناں نہیں رہا — وہ ولولہ وہ جوش وہ طغیاں نہیں رہا

ٹھنڈا ہے[۱] گرمجوشیِ افسردگی سے جی — کیسا اثر کہ نالہ و افغاں نہیں رہا

کرتے[۲] ہیں اپنے زخمِ جگر کو رفو ہم آپ — کچھ بھی خیالِ جنبشِ مژگاں نہیں رہا

دل[۳] سختیوں سے آئی طبیعت میں نازکی — صبر و تحمّلِ قلقِ جاں نہیں رہا

کیا[۴] اچھے ہوگئے کہ بھلوں سے بُرے ہوئے — یاروں کو فکرِ چارہ و درماں نہیں رہا

غش[۵] ہیں کہ بے دماغ ہیں گل پیرہن نمط — ازبس دماغ عطرِ گریباں نہیں رہا

آنکھیں نہ بدلیں شوخ نظر کیونکہ اب کہیں — مفتونِ[۶] لطفِ نرگسِ فتّاں نہیں رہا

ناکامیوں[۷] کا گاہ گلہ گاہ شکر ہے — شوقِ وصال و اندہِ ہجراں نہیں رہا

۲

---

۱۰ گُل کھانا = لوہے وغیرہ کو گرم کرکے اپنے جسم پر داغنا۔ شرارت یہ ہے کہ میرے گل کھانے کو اپنے چھلّے کے بدلے اُس نے رقیب کا چھلّا منگا دیا۔

۱ گرمجوشیٔ افسردگی یعنی افسردگی کی شدت سے جی ٹھنڈا ہے (طبیعت کو سکون ہوگیا ہے) یہ پوری غزل مسلسل ہے اور ترکِ عشق کے مضمون پر ہے۔

۲ ہم اپنے زخمِ جگر کو خود رفو کر رہے ہیں اور جنبشِ مژگاں (التفاتِ نگاہِ یار) سے جو رفو کی توقعات وابستہ تھیں سب چھوڑ بیٹھے۔ ۳ محبوب کی سخت دلی سے ہماری طبیعت میں قوت برداشت نہ رہی۔

۴ ہم تندرست ہوکر دوستوں کی نظرِ التفات سے بھی محروم ہوگئے کیونکہ اب وہ درد ہی نہیں جو وہ فکرِ درماں کریں۔ ۵ غش یہاں خوش کے معنی میں ہے۔ گل پیرہن نمط = معشوقِ گل پیرہن کی طرح۔ یعنی ہم اس سے خوش ہیں کہ معشوق کی طرح بے نیاز و مغرور ہیں کیونکہ اب ہمیں معشوق کے گریبان کے عطر سے لطف اُٹھانے کا ارمان باقی نہیں رہا۔

۶ مفتون = فریفتہ۔ فتّاں = فتنہ انگیز۔

۷ شوقِ وصال باقی نہ رہنے کا گلہ ہے اور اندوہِ ہجراں نہ رہنے کا شکر ہے اور یہ سب ناکامیٔ محبت کی بدولت ہوا۔ نہ یہ مایوسی ہوتی نہ ہم شوقِ وصال اندوہِ ہجراں سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔

۸ بے تو وہ تودہ خاک سبکدوش ہو گئے
سر پر جنون عشق کا احساں نہیں رہا

۹ ہر لحظہ مہر جلووں سے ہے چشم پوشیاں
آئینہ زار دیدۂ حیراں نہیں رہا

۱۰ پھرتے ہیں کیسے پردہ نشینوں سے منہ چھپائے
رسوا ہوئے کہ اب غم پنہاں نہیں رہا

۱۱ آسیب چشم قہر پری طلعتاں نہیں
اے انس اک نظر کہ میں انساں نہیں رہا

۱۲ بیکاری امید سے فرصت ہے رات دن
وہ کاروبار حسرت و حرماں نہیں رہا

۱۳ اب سیر دشت و بادیہ لگنے لگا ہے جی
اور اُس خراب گھر میں کہ ویراں نہیں رہا

۱۴ کیا تلخکامیوں نے لب زخم سی دیئے
وہ شور اشتیاق نمکداں نہیں رہا

بے اعتبار ہو گئے ہم ترک عشق سے
ازبسکہ پاس وعدہ و پیماں نہیں رہا

۱۵ نیند آ گئی فسانۂ گیسو و زلف سے
وہم و گمانِ خواب پریشاں نہیں رہا

۸ جب تک سر پر جنون عشق کا احسان تھا خاک اُڑاتے تھے۔ اب کہ عشق سے طبیعت سیر ہو گئی ہے اور خاک اُڑانا موقوف ہو گیا ہے سُبک۔ وشی کیوں نہ حاصل ہو۔ تودہ تودۂ خاک = خاک کی کثرت۔ ۹ مہر جلوہ = وہ معشوق جسکا جلوہ آفتاب جیسا ہے۔ میں اب ہر لحظہ حسینوں سے آنکھ چُرانے لگا ہوں اسلیے میرے دیدہ حیران میں آئینہ زار کی کیفیت نہیں رہی۔ حیرت یا تجلی جمال کی وجہ سے آنکھ کو آئینہ زار کہا ہے۔ ۱۰ ترک محبت کی وجہ سے میں انگشت نما ہو گیا ہوں اور اسی انگشت نمائی یا رسوائی کے باعث حسینوں کا سامنا کرتے ہوئے حجاب آتا ہے۔ پردہ نشینوں کے لفظ کی رعایت سے غم عشق کو غم پنہاں قرار دیا ہے۔ ۱۱ جب تک میں انسانیت سے متصف تھا اور دولت عشق سے مالا مال۔ اس وقت تک پری رخوں کی نگاہ غضب سے ڈرتا تھا۔ لیکن اب مجھ پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ اے عشق (اُنس) مدد کر کہ پھر وہی اگلا سماں پیش نظر ہو۔ آسیب۔ پری۔ انسان۔ اُنس میں رعایت شاعرانہ ہے۔ ۱۲ یعنی پہلے عشق میں آمیدوں کے ہوائی قلعے بنایا کرتے تھے جو آخر میں حرمان (مایوسی) کے ہاتھوں زمین پر آ رہتے تھے غرض اچھا خاصا شغل رہتا تھا۔ اب اُمید کیسر بیکار ہے اور کوئی شغل نہیں ملتا۔ ۱۳ عاشق یا شاعر کے نزدیک گھر کی ویرانی ہی عین آبادی ہے۔ اب گھر ویران نہیں وہ اُس کو "خراب" قرار دیتا ہے۔ ۱۴ پیشتر لب ہائے زخم نمک کے طالب تھے یعنی محبت کی ایذا میں لذت محسوس ہوتی تھی لیکن آخر اس قدر تلخکامیاں اُٹھائیں کہ زخموں کو نمکدان کی خواہش نہیں رہی۔ تلخ۔ شور نمکدان کی رعایت ظاہر۔ ۱۵ عشق میں ہمیشہ خواب پریشاں سے کام رہا۔ اِدھر سوئے اُدھر گھبرا کر چونک پڑے اب افسانہ زلف سُنکر بھی نیند آ جاتی ہے۔ خواب پریشان کا تو کہیں نام و نشان بھی نہیں۔

کس کام کے رہے جو کسی سے رہا نہ کام
سر ہے مگر غرور کا ساماں نہیں رہا

مومنؔ یہ لافِ الفتِ تقویٰ ہے کیوں مگر
دلّی میں کوئی دشمنِ ایماں نہیں رہا

۵۱

کیا[1] رم نہ کروگے اگر ابرام نہ ہوگا
الزام سے حاصل بجز الزام نہ ہوگا

کاش آپ وہ آئیں جو سنوں تازکی باتیں
قاصد سے ادا پاسخِ پیغام نہ ہوگا

ہاں[2] جوشِ طپش چھیڑ چلی جائے کہ پر تو
جھڑ جائیں گے فرسودہ اگر دام نہ ہوگا

ناکامی[3] اُمید پہ صبر آئے تو کیا آئے
ہر بات پہ کہتے ہو کہ یہ کام نہ ہوگا

منقوش[4] دلِ خلق ہے پرہیز کی خوبی
کتنا ہی کرے ظلم وہ بدنام نہ ہوگا

مسلسل

بیٹھا[5] رہوں کیا منتظرِ دور میں ساقی
اتنوں میں کوئی میکدہ آشام نہ ہوگا

[1] ابرام = اصرار۔ رم = وحشت۔ گریز۔ یعنی جب مَیں تم سے ملنے پر اصرار کرتا ہوں تو تم گریز کرتے ہو اور مجھ پر ابرام کرنے کا الزام رکھتے ہو کہ اسی سے مجھکو (معشوق کو) نفرت ہوتی ہے۔ مگر وقت یہ ہے کہ جب میں ابرام نہ کرونگا تو بھی تم رم سے باز آنے والے نہیں۔ غرض اس الزام کا نتیجہ بجز الزام کچھ نہیں۔ یعنی پھر تم موردِ الزام ٹھہروگے اور یہ ثابت ہو جائے گا کہ کوئی ابرام کرے نہ کرے تمھاری عادت ہی رم کرنے کی ہے۔ یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ پھر تم مجھے الٹا الزام دوگے کہ یہ (عاشق) خود ابرام نہیں کرتا۔ میری بلا کو کیا غرض جو ایسے شخص سے التفات کرے [2] جوش تیز ہے کم از کم اتنا فائدہ تو ہوگا کہ پر گر جائیں گے اور حسرت پرواز جاتی رہے گی۔ [3] مَیں ناکامیِ اُمید پر صبر کرلیتا مگر مشکل یہ ہے کہ تم ہر بات پر کہتے ہو کہ یہ کام نہ ہوگا۔ اسلیے گمان ہوتا ہے کہ شاید اس موقع پر بھی تمھارا یہ کہنا بر بنائے مقتضائے عادت ہو نہ بر بنائے واقعیت اور دراصل حصولِ اُمید کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ [4] دُنیا پرہیز کو قابلِ ستایش سمجھتی ہے۔ اسلیے معشوق جو عاشق سے پرہیز کرتا ہے (کہ دراصل عاشق کے حق میں ظلم ہے) بدنام نہیں ہوسکتا۔ دنیا سمجھے گی کہ یہ پرہیز کرتا ہے کوئی جرم نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ پرہیز خلق کے نزدیک مذموم نہیں بلکہ محمود ہے۔ [5] میکدہ آشام = وہ بلا نوش جو میکدہ کا میکدہ چڑھا جائے۔ مومن کی خاص ترکیب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر میں دورِ شراب کا انتظار کروں اور کوئی رند میکدہ کا میکدہ خالی کرجائے تو مَیں محروم ہی رہ جاؤنگا۔

اس جوشِ تپش پر ہوئی مشکل سے رسائی[۶]
صد شکر گذر غیر کا تا بام نہ ہوگا

کیا کیجیے[۷] دل شوخیِ فطرت پہ جو آجائے
یہ تو میں سمجھتا تھا کہ وہ رام نہ ہوگا

گلرنگ ہوا گریۂ خوں سے مرا دامن
کیا اب بھی خجل چرخِ سیہ فام نہ ہوگا

خو[۸] ہو گئی ہجراں میں تڑپنے کی شبِ وصل
گو چین ہو دل کو مجھے آرام نہ ہوگا

ہیں پاک نظر ہم تو لے ذوق فزا عشق
بے چاشنیِ بوسۂ دشنام نہ ہوگا

کم ظرفیِ[۹] اغیار پہ ساقی کو نظر ہے
افسوس مے آلودہ لبِ جام نہ ہوگا

وہ[۱۰] شوخ فریبِ تملقِ غیر میں آیا
اب مجھ سے تو صبر اے دلِ ناکام نہ ہوگا

کیا[۱۱] فتنۂ محشر کو قدِ یار سے نسبت
ہے خاص کشی ولولۂ عام نہ ہوگا

اغیار[۱۲] سے بے فائدہ ہے گرمیِ صحبت
کاہے کو جلے گا جو کوئی خام نہ ہوگا

ہے[۱۳] مہر تجھے دیکھ کے شرمندہ و مشتاق
اتنا کہ ظہورِ سحر و شام نہ ہوگا

۶ یعنی رقیب کا عشق صادق نہیں اس لیے میرا سا جوش تپش اُس کو کہاں نصیب۔ جب مجھے اس جوش تپش کے باوجود بمشکل رسائی حاصل ہوئی تو اُس کی کامیابی معلوم۔ ۷ محبوب میں فطرۃً شوخی ہے اسلیے اس کا قابو میں آنا محال ہے۔ میں جو عاشق ہوا تو اس اُمید پر نہیں کہ وہ میرے قابو میں آجائے گا۔ بلکہ مجبور تھا کہ شوخی ہی پر میرا دل آگیا۔ ۸ یعنی ترک عادت باعثِ اذیت ہوتا ہے۔ شب وصل کا تعلق مصرع ثانی سے ہے۔ ۹ ساقی اغیار کی کم ظرفی کا خیال پیش نظر رکھتا ہے اس لیے اُن کو جام لبریز نہیں دیتا۔ اندیشہ یہ ہے کہ اُن کمظرفوں پر قیاس کرکے ہمارے ساتھ بھی وہی سلوک نہ کرے۔ لب جام کا مے آلودہ ہونا جام کا لبریز ہونا۔ ۱۰ میں پاس ضبط سے صبر کیے بیٹھا ہوں لیکن جب دیکھتا ہوں کہ وہ شوخ غیر کی مصنوعی بیتابی کے دھوکے میں آگیا اور اُسکی جانب ملتفت ہوگیا۔ تو اب مجھ سے کبھی صبر ناممکن ہے۔

۱۱ فتنۂ محشر کا کام عام کشی (قتل عام) ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جب سب بلا تخصیص ہلاک ہو جائیں گے ولولۂ عام پیدا نہیں ہو سکتا۔ مگر قد یار خاص خاص عشاق کو قتل کے لیے منتخب کرتا ہے۔ اس لیے باقی لوگوں میں شوق شہادت پیدا ہوتا ہے اور جوش پھیلتا ہے۔ اس لیے فتنۂ محشر قد یار کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ ۱۲ تمھاری اغیار سے بے تکلفی اس غرض سے ہے کہ مجھے جلاؤ۔ مگر اس سے مُنہ دھو رکھو۔ میں جلنے والا نہیں جو چیز خام ہوتی ہے وہ جلتی ہے اور میں ٹھہرا پختہ کار۔ ۱۳ آفتاب تیرے جلوہ سے شرمندہ ہے اس لیے سامنے نہیں آئیگا کہ طلوع سحر ہو اور تیرا مشتاق بھی ہے۔ اس لیے غروب نہ ہوگا کہ ظہور شام ہو۔

بلبل کے سے نالے کہ صبا کی سی کروں سعی ۔۔۔ میرا نہ ہوا ہے وہ گل اندام نہ ہوگا

وہ[۱۱] مشق رہی اور نہ وہ شوق ہے **مومن**
کیا شعر کہیں گے اگر الہام نہ ہوگا

۵۲

گر میں کمبخت وہ بخیل ہوا ۔۔۔ مجھکو چھیڑ آسماں ذلیل ہوا
گر یہی بیخودی ہے صہبا میں ۔۔۔ کون مشتاق سلسبیل ہوا
آسماں[۱] راہ پر نہیں آتا ۔۔۔ دعوئ خضرؑ بے دلیل ہوا
ہائے[۲] وہ لا فہائے خودکامی ۔۔۔ غیر ہر کام میں دخیل ہوا
اب[۳] تغافل ہے واں مگر گردوں ۔۔۔ میرے آزار کا کفیل ہوا
کس قدر تیز رو ہے سوئے صنم ۔۔۔ نامہ بر میرا جبرئیل ہوا
اثر[۴] حسن و عشق تھا بے مثل ۔۔۔ میں ترا تو مرا عدیل ہوا
العطش[۵] زن سپہر و یار و عدو ۔۔۔ بے گنہ خوں مرا سبیل ہوا

[۱۱] یعنی اب اگلی سی مشق وشوق تو ہے نہیں ہاں الہام کی مدد ہوتی ہے تو شعر کہہ لیتا ہوں۔ اگر الہام نہ ہوگا تو میرا شعر کہنا معلوم۔
[۱] حضرت خضرؑ گم کردہ راہوں کو راہ بتاتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ دعویٰ بے دلیل ہے۔ اگر صحیح ہوتا تو آسمان کبھی تو راہ پر آتا۔ [۲] ہائے اب معشوق کے وہ دعویٰ ہائے خودرائی کہاں گئے۔ اب تو یہ حال ہے کہ غیر اُسکے ہر معاملے میں دخیل ہو گیا ہے اس سے تو وہی خودرائی اچھی تھی۔ کہ کسی کی نہیں سنتا تھا۔ یہی مضمون دوسرے جگہ لکھتے ہیں۔ حیف صد حیف اگر غیر کے دم میں آئے + میں اسی بات پہ مرتا تھا کہ تم ہو عیار۔ [۳] محبوب کی توجہ کا مقصد محض مجھپر ظلم کرنا تھا۔ اب توجہ کی عوض مجھ سے تغافل ہے۔ شاید اسکی وجہ یہ ہوگی کہ اُسکو اطمینان ہوگا کہ اب آسمان نے ستم کرنے کی خدمت اپنے ذمے لیلی ہے۔ میں آزار دینے کی زحمت کیوں اُٹھاؤں۔ یہ پہلو بھی ہو سکتا ہے کہ محبوب مجھ سے تغافل کرتا ہے۔ پھر بھی میں مورد بیداد ہوں۔ شاید اسکی وجہ یہ ہوگی کہ اب آسمان نے اپنے ذمہ یہ کام لے لیا ہے۔ [۴] تو حسن کی وجہ سے اور میں عشق کی بدولت بے مثل تھا۔ اسلیے بے مثل ہونے میں میں تیرا عدیل (مثل) ہوا اور تو میرا۔ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ تیرے حسن کے اثر نے مجھکو ہمہ تن حسن بنا دیا اور میرے عشق کے جذب نے تجھکو یکسر عشق کر دیا۔ اسلیے جو تو تھا وہ اب میں ہوں اور جو میں تھا وہ تو ہے۔ [۵] العطش زن = العطش کہنے والا۔ پیاسا۔

آپ کی کون سی بڑھی عزت | مَیں اگر بزم میں ذلیل ہوا
آتشِ آہ بے اثر سے مری[1] | آسماں گلشنِ خلیل ہوا
کوتہی کی جواب میں جوں جوں | اور بھی خط مرا طویل ہوا

ہائے[2] مومن شہادتِ بے اجر
بہرِ وصلِ صنم قتیل ہوا۔

۵۳

غصہ بیگانہ وار ہونا تھا | بس یہی تجھ سے یار ہونا تھا
کیا شبِ انتظار ہونا تھا | ناحق اُمیدوار ہونا تھا
کیوں نہ ہوتے عزیز غیر تمھیں | میری قسمت میں خوار ہونا تھا
مجھے[1] جنت میں وہ صنم نہ ملا | حشر اور ایک بار ہونا تھا
گر نہ تھی اے دل اُسکے رنج کی تاب | کیوں شکایت گذار ہونا تھا
خاک ہوتا نہ مَیں تو کیا کرتا | اس کے در کا غبار ہونا تھا
ہرزہ[2] گردی سے ہم ذلیل ہوئے | چرخ کا اعتبار ہونا تھا
مرگ[3] شامِ وصال حرماں ہائے | صبحدم جاں نثار ہونا تھا

[1] گلشن خلیل سے مُراد وہ آگ ہے جو حضرت ابراہیمؑ پر باغ و بہار ہو گئی تھی مطلب یہ ہے کہ میرے آہ کی آگ آسمان تک گئی مگر چونکہ بے اثر تھی اسلیے آسمان کو جلا نہ سکی۔ گویا آسمان کی وہی کیفیت ہوئی جو گلشن خلیل کی تھی یہی تشبیہ ہے۔ [2] شاعر نے اپنے قتل کو شہادت اسلیے کہا کہ "مومن" کا قتل تھا اور بے اجر اسلیے کہ اس شہادت کا صلہ کہ اُسکے نزدیک وصل صنم تھا۔ حاصل نہ ہوا۔

[1] حشر کے بعد مومن کو جنت ملی مگر صنم نہ ملا۔ اسلیے کہتا ہے کہ حشر اور ایکبار ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ (شاعر کے نزدیک) جو حشر کا مقصود تھا وہ تو حاصل نہ ہوسکا۔ [2] میں نے اتنی ہرزہ گردی کی کہ ذلیل ہوگیا ورنہ اس سے پہلے آسمان ہرزہ گردی میں بدنام تھا۔ اب میرے مقابلہ میں اُس کی آوارہ گردی کی شہرت کم ہو گئی۔ دراصل یہ مقدر ہوچکا تھا کہ اُسکی یہ بدنامی دور ہو اور عزت بڑھے۔ [3] عاشق اپنی محرومی کا شکوہ سنج ہے کہ شام وصل خوشی سے کیوں مر گیا۔ اگر مرنا تھا تو صبح شبِ وصال مرتا۔ کہ وصال یار سے محروم تو نہ رہتا۔

اور سے ہمکنار رہے دشمن / آج تو ہمکنار ہونا تھا
شکوۂ دہر پر کہا تم کو / آفتِ روزگار ہونا تھا
چشمِ بے اعتبار جاناں میں / کیا مرا اعتبار ہونا تھا
صبر کر صبر ہو چکا جو کچھ / اے دلِ بیقرار ہونا تھا
کوئے دشمن میں جا پکڑتا[4] کیوں / کیا مجھے شرمسار ہونا تھا
وہ نمک پاش کبھی نہیں ہوتے / یوں ہی دل کو فگار ہونا تھا
خاک[5] میں حیف یہ شراب ملے / محتسب بادہ خوار ہونا تھا
نہ گیا[6] تیر نالہ سوئے رقیب / مرغِ عرشی شکار ہونا تھا

رات دن بادہ وصنم مومن
کچھ تو پرہیزگار ہونا تھا

۵۴

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا / رنج[1] راحت فزا نہیں ہوتا
بیوفا کہنے کی شکایت ہے / تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا
ذکر اغیار[2] سے ہوا معلوم / حرفِ ناصح بُرا نہیں ہوتا

[4] جا پکڑنا = سکونت اختیار کرنا۔ [5] اے محتسب اگر تو بادہ خوار ہوتا تو شراب کی ایسی بیقدری نہ کرتا۔ دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ خدمت احتساب کسی بادہ خوار کو سپرد ہونی چاہئے تھی تاکہ اگر محتسب ہونے کی بنا پر شراب کو ضبط کرتا تو بادہ خوار ہونے کی وجہ سے اُس کو پی جاتا۔ شراب ضائع تو نہ جاتی۔ [6] مرغِ عرش = فرشتہ۔ یہ قسمت میں تھا کہ میرے نالے کے تیر سے طائرِ عرش شکار ہو۔ سو وہی ہوا۔ مگر جو اصل نشانہ تھا (یعنی رقیب) وہ بچ گیا۔

[1] اگر محبوب میرے رنج سے متاثر ہو کر مجھ پر مہربان ہو تو یہ رنج میرے حق میں راحت فزا ہو جائے مگر آہ ایسے نصیب کہاں۔ [2] میں ناصح کی باتوں کو بُرا سمجھتا تھا مگر ذکرِ اغیار اُن سے بڑھکر دلخراش ہے۔ اب ذکرِ اغیار کے مقابلے میں حرفِ ناصح کی مجھے قدر ہوئی کہ وہ اس قدر بُرا نہ تھا۔

کس[۳] کو ہے ذوقِ تلخ کامی لیک — جنگ بن کچھ مزا نہیں ہوتا

ہم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا

اُس نے کیا جانے کیا کیا لیکر — دل کسی کام کا نہیں ہوتا

امتحاں[۴] کیجئے مرا جب تک — شوق زور آزما نہیں ہوتا

ایک[۵] دشمن کہ چرخ ہے نہ رہے — تجھ سے یہ اے دعا نہیں ہوتا

آہ طولِ[۶] امل ہے روز افزوں — گرچہ اک مدعا نہیں ہوتا

نارسائی[۷] سے دم رُکے تو رُکے — میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

تم[۸] مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حال دل یار کو لکھوں کیونکر — ہاتھ دل سے جُدا نہیں ہوتا

رحم[۹] کر خصم جانِ غیر نہ ہو — سب کا دل ایک سا نہیں ہوتا

دامن[۱۰] اُس کا جو ہے دراز تو ہو — دستِ عاشق رسا نہیں ہوتا

---

۳ جنگ کی تلخی کس کو اچھی لگتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جنگ کے بغیر صلح میں لُطف بھی نہیں آتا۔ کہ الاشیاء تُعرف با ضدادہا۔ ۴ جب تک میرا شوق اپنا اثر نہیں دکھاتا اُس وقت تک آپ میرا امتحان محبت کیجئے جب میرے شوق کی کشش ہوگی آپ خود کھنچے چلے آئیں گے۔ پھر امتحان کی کیا ضرورت ہوگی۔ ۵ اے دعا تجھ سے یہ کبھی نہیں ہوتا کہ منجملہ میرے اور دشمنوں کے ایک اِس دشمن ہی کو (کہ چرخ ہے) فنا کردے۔ مصرعِ اول کی بندش اچھی نہیں۔ ۶ اگرچہ ایک مدعا کبھی پورا نہیں ہوتا تاہم آرزوئیں ہیں کہ بڑھتی چلی جارہی ہیں۔ ۷ خفا (خفہ) کے لفظ میں ایہام ہے کیونکہ اُسکے لغوی معنی دم گھُٹے ہوتے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میرا دم اپنی نارسائی کی وجہ سے رُکے تو اُس پر تو (لغتہً) خفگی کا اطلاق ممکن ہے۔ ورنہ میری عادت خفگی کی نہیں۔ ۸ جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو میرا تصور تم کو لاکر میرے پیش نظر کردیتا ہے۔ یہ شعر اس قدر مطابق فطرت اور بلیغ ہے کہ بقول مولانا حالی مرزا غالب کہا کرتے تھے کہ ”کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھکو دیدیتا“ ۹ رقیب کے ساتھ دشمنی نہ کر ورنہ وہ کم ہمت ترک عشق کر بیٹھے گا کیونکہ سب میری طرح باوفا نہیں ہوتے ۱۰ اُس کا فیض عام ہی مگر عاشق اپنی بدقسمتی کا کیا علاج کرے۔

ہر چہ ہست از قامتِ ناساز و بے اندام ماست + ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

ر چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

کیوں[1] سُنے عرضِ مضطر اے مومن
صنم آخر خُدا نہیں ہوتا

۵۵

کیا[2] ہوا ہو اگر وہ بعدِ امتحاں اپنا — بیگنہ سزا پائے اب وہ دل کہاں اپنا
خار[3] و خس میں گلشن کے بوئے گل جو آتی تھی — رشک سے کیا برباد آپ آشیاں اپنا
روز کا بگاڑ آخر جان پر بنا دے گا — ان کو شوقِ آرائشِ دل ہے بدگماں اپنا
دشمنہ چھین لیگا کیا ہمنشیں شبِ فرقت — آپ جب نہیں اپنے کون میری جاں اپنا
بعد[4] مدت اس کوئے یوں پھرے تنگ آکر — جائے جائے پھرتے ہیں پوچھتے مکاں اپنا
صبر[5] بعد آسایش اس قلق پہ مشکل تھا — عیشِ جاوداں نکلا رنجِ جاوداں اپنا
عشق[6] بُت میں خود اب تو درخورِ پرستش ہیں — نام ہوگیا اتنا گم کیا نشاں اپنا
دل[7] کے لینے تک ہے بس آپ کی خریداری — کیوں کریں وہ سودا ہم جس میں ہو زیاں اپنا

[1] قرآن مجید میں ہے اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ یعنی (خدا کے سوا) کون ہے جو مضطر کی دعا کو سُنے شاعر کہتا ہے یہ تو خدا ہی کی صفت ہے۔ صنم آخر خدا تو نہیں جو عرض مضطر سنے۔
[2] اگر دوست امتحانِ وفا کے بعد مہربان ہوگا تو کیا حاصل۔ کیونکہ اب دل میں وہ طاقت نہیں رہی کہ امتحان کے لیے آمادہ ہو اور اس طرح بے گناہ سزا جھیلے۔ [3] میں نے اپنے آشیان کے خار و خس کو اس رشک سے خود برباد کر دیا کہ اُن میں گُل کی بو آتی تھی۔ [4] اتنے عرصہ کے بعد کوئے یار سے واپسی ہوئی کہ اپنا گھر بھول گئے۔ جائے جائے = جگہ جگہ۔ [5] اگر پہلے آسائش نصیب ہو چکی ہوتی پھر یہ قلق پیش آتا تو صبر کرنا دشوار تھا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ شروع سے رنج جاوداں سے کام پڑا۔ جس نے درحقیقت عیش جاوداں کا اثر دکھایا ع ”مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں“۔ [6] ہم نے بت کے عشق میں اپنی ہستی اسقدر مٹادی کہ خلق میں شہرت ہوگئی اور ہماری بے نشانی مستحق پرستش ٹھہری۔ عاشق نے بے نشانی کی بنا پر اپنے کو معبودِ برحق کا مماثل قرار دیا ہے
[7] خریداری سے یہاں التفات یار مراد ہے۔

دلؔ کی بیقراری سے ہر طپش زمیں فرسا | ق | بہر خرمن گردوں شعلہ ہر فغاں اپنا
دیکھئے بس مر دن حالِ جسم و جاں کیا ہو | | مدعی زمیں اپنی دشمن آسماں اپنا

دیر و کعبہ یکساں ہے عاشقوں کو اے مومن
ہو رہے وہیں سکے ہم جی لگا جہاں اپنا

	۵۶	
ہم جانؔ فدا کرتے گر وعدہ وفا ہوتا		مرنا ہی مقدر تھا وہ آتے تو کیا ہوتا
اسؔ حسن پہ خلوت میں جو حال کیا کم تھا		کیا جانئے کیا کرتا گر تو مری جا ہوتا
ایک ایک ادا سو سو دیتی ہے جواب اسکے		کیونکر لبِ قاصد سے پیغام ادا ہوتا
اچھیؔ ہے وفا مجھ سے جلتے ہیں جلیں دشمن		تم آج ہوا سمجھو جو روز جزا ہوتا
جنت کی ہوس واعظ بیجا ہے کہ عاشق ہوں		ہاں سیر میں جی لگتا گر دل نہ لگا ہوتا
اسؔ تلخیٔ حسرت پر کیا چاشنیٔ الفت		کب ہم کو فلک دیتا گر غم میں مزا ہوتا
تھےؔ کوسنے یا گالی طعنوں کا جواب آخر		لب تک نہ غم غیر آتا گر دل میں بھرا ہوتا
ہےؔ صلح عدو بیخط تھی جنگ غلط فہمی	یُتَیے	جینا ہے تو آفت ہے مرتا تو بلا ہوتا

؎ میری ہر تڑپ زمین کو پامال کئے ڈالتی ہے اور میری ہر فریاد شعلہ بنکر آسمان کو جلا دیتی ہے یہ اور شعر مابعد قطعہ بند ہیں۔ نفغاں و افغاں کو مومن نے مذکر باندھا ہے۔

؎ ہم اس وقت ہجر یار میں جان دے رہے ہیں۔ اگر وہ آتا تو اُسکے مقدم کی خوشی میں جان فدا کرتے غرض جان ہر طرح جانے والی تھی۔ وہ وعدہ وفا کرتا یا نہ کرتا۔ ؎ تیرے اس حسن پر خلوت میں تو نے جو بے باکی اور بے تکلفی کا اظہار کیا تھوڑا تھا۔ اگر تو ہماری جگہ ہوتا تو نجانے کیا کرتا۔ ؎ تم مجھ سے وفا کرتے ہو اسپر دشمن اگر جلتے ہیں تو جلنے دو آخر روز جزا دوزخ میں جلنا انکے نصیب میں تھا ہی۔ آج ہی سہی۔ ؎ فلک کی عداوت اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ اگر غم میں مزا ہوتا تو وہ ہمیں غم بھی نہ دیتا۔ جب یہ حالت ہے تو پھر غم عشق سے ہمارا لطف اندوز ہونا کیونکر ممکن ہے کیونکہ اُس تلخی حسرت نے بدمزہ کر دیا ہے۔ ؎ عاشق اپنے دل کو تسلی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے معشوق کو طعنۂ الفت غیر دیا جسکے جواب میں گالی کوسنے تھے اس سے معلوم ہوا کہ یہی اُسکے دل میں بھرے تھے۔ اگر عشق رقیب اُسکے دل میں ہوتا تو وہ ضرور زبان تک آتا کیونکہ كُلُّ إِنَاءٍ يَتَرَشَّحُ بِمَا فِيهِ - ؎ رقیب سے صلح تو بے لطف ہے ہی جنگ بھی نادانی ہے کیونکہ وہ زندہ ہے تو آفت ہے۔ مرتا تو بلا ہوتا۔

ہوتا[۶] تھا وصال اک شب قسمت میں بلا سے گر — تو مجھ سے خفا ہوتا میں تجھ سے خفا ہوتا

ہے بیخودیٔ دائم کیا شکوہ تغافل کا — جب میں نہ ہوا اپنا وہ کیونکہ مرا ہوتا

اس بخت پہ کوشش سے تھکنے کے سوا حاصل — گر چارۂ غم کرتا رنج اور سوا ہوتا

اچھی[۸] مری بدنامی تھی یا تری رسوائی — گر چھوڑ نہ دیتا میں پامال جفا ہوتا

دیوا[۹]نے کے ہاتھ آیا کب بند قبا اسکا — ناخن جو نہ بڑھ جاتے تو عقدہ یہ وا ہوتا

ہم[۱۰] بندگیٔ بت سے ہوتے نہ کبھی کافر
ہر جائے گر اے **مومن** موجود خدا ہوتا

۵۷

عدم میں رہتے تو شاد رہتے اُسے بھی فکرِ ستم نہ ہوتا — جو ہم نہ ہوتے تو دل نہ ہوتا جو دل نہ ہوتا تو غم نہ ہوتا

ہوئی خجالت[۱۱] سے نفرت افزوں گلے کئے خوب آخرِ دم — وہ کاش اک دم ٹھہر کے آتے کہ میرے لب پر بھی دم نہ ہوتا

پڑا ہے مرنا بس اب تو ہم کو جو اُس نے خط پڑھ کے نامہ بر سے — کہا کہ گر سچ یہ حال ہوتا تو دفتر انتظار قلم نہ ہوتا

کسی[۱۲] کے جلنے کا دھیان آیا وگرنہ دودِ فغاں سے میرے — اگر ہزاروں سپہر بنتے تمہاری آنکھوں میں نم نہ ہوتا

---

۶ قسمت میں ایک رات تو وصال ہونا چاہئے تھا۔ خواہ باہمی رنجش ہی میں گذر جاتی۔ ۷ سلسلۂ محبت قائم رکھنے میں عاشق پامال جفا ہوتا۔ یہ ظلم درحقیقت معشوق کے لیے موجب رسوائی ہے۔ رہا ترک محبت۔ سو یہ عاشق کے لیے باعث بدنامی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں نے محبت جو ترک کی اُسکی وجہ یہ تھی کہ میں نے اپنی بدنامی کے مقابلے میں تمہاری بدنامی کا پاس کیا۔ یہ مومن کا مکر شاعرانہ ہے۔ ۹ قاعدہ ہے کہ ناخن سے گرہ کھل جاتی ہے۔ عشق میں اسکے برعکس صورت پیش آئی۔ یعنی جب عاشق دیوانہ کے ناخن بڑھے معشوق کو اسکی دیوانگی سے اور نفرت ہوئی اور بند قبا تک رسائی اور دشوار۔ گویا ناخنوں کے بڑھ جانے سے دیوانہ کا عقدہ یکسر لاینحل ہوگیا۔ ۱۰ اس شعر میں مومن نے اہل حدیث کے عقیدہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ خدا ہر جگہ نہیں۔ البتہ اس کا علم ہر جگہ ہے۔
۱۱ جب دم آخر وہ میرے دیکھنے کو آئے تو میں نے خوب گلے کئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کو خجالت ہوئی اور خجالت سے نفرت بڑھی۔ کاش وہ میرے مرنے کے بعد آتے تو یہ نوبت نہ پہونچتی۔ ۱۲ میری آہوں کے دھوئیں سے ہزاروں آسمان بنتے تو بھی تمھاری آنکھیں پُرنم ہونے والی نہ تھیں۔ ہونہ ہو تمھارے آب دیدہ ہونے کا باعث یہ ہے کہ کہیں رقیب ان آہوں کے اثر سے نہ جل جائے۔ ظاہر ہے کہ دھوئیں سے آنکھیں پُرآب ہوجاتی ہیں۔

جو آپ[۳] در سے اٹھا نہ دیتے کہیں نہ کرتا میں جبہہ سائی
اگرچہ یہ سر نوشت میں تھا تمہارے سر کی قسم نہ ہوتا

وصال کو ہم ترس رہے تھے جواب[۴] ہوا تو مزہ نہ پایا
عدو کے مرنے کی جب خوشی تھی کہ اسکو رنج و الم نہ ہوتا

جہان تنگ و ہجوم وحشت غرض کہ دم پر بری بنی تھی
کہاں میں جاتا نہ جی ٹھہرتا کہیں جو دشتِ عدم نہ ہوتا

مگر[۵] رقیبوں نے سر اٹھایا کہ یہ نہ ہوتا تو بیمروت
نظر سے ظاہر حیا نہ ہوتی حیا سے گردن میں خم نہ ہوتا

وہاں[۶] ترقی جمال کو ہے یہاں محبت ہے روز افزوں
شریک زیبا تھا بوالہوس بھی جو بیوفائی میں کم نہ ہوتا

غلط[۷] کہ صانع کو ہو گوارا خراش انگشت ہائے نازک
جواب خط کی امید رکھتے جو قول جَفَّ القلم نہ ہوتا

یہ بے تکلف پکار رہی ہے کشش دلِ عاشقاں کی اسکو
وگرنہ ایسی نزاکتوں پہ خرامِ ناز اک قدم نہ ہوتا

وصال[۸] تو ہے کہاں میسر مگر خیالِ وصال ہی میں
مزے اڑاتے ہوس نکلتی جو ساتھ اندازِ رم نہ ہوتا

ہوا[۹] مسلماں میں اور ڈر سے نہ درسِ واعظ کو سن کے مومن
بنی تھی دوزخ بلا سے بنتی عذاب ہجر صنم نہ ہوتا

[۳] آپ نے مجھے اپنے در سے اٹھا دیا۔ اگر ایسا نہ کرتے تو میں ہرگز کسی دوسرے (حسین) کے در پہ جبیں سائی نہ کرتا۔ دوسرے در کی ناصیہ فرسائی اگر میرے مقدر میں ہوتی تو بھی میں یقیناً اس صورت میں اس کا مرتکب نہ ہوتا۔ [۴] اب یعنی عدو کے مرنے کے بعد ہمیں وصال یار میسر ہوا۔

[۵] تیری حیا درپردہ رقیبوں کے اختلاط و بیباکی کی پردہ دری کر رہی ہے۔

[۶] اگر معشوق کے جمال میں روزانہ ترقی ہے۔ تو میری محبت بھی روز افزوں ہے۔ یعنی دونوں اپنے وصف میں کامل ہیں، وہ حسن میں۔ تو میں عشق میں۔ رہا رقیب۔ سو اس کو بھی ہم شریک کر لیتے بشرطیکہ اس میں بھی کوئی کمال ہوتا۔ مگر خرابی یہ ہے کہ وہ بے وفائی میں بھی کامل نہیں۔ [۷] حدیث شریف میں ہے جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ یعنی قلم قدرت تمام امور کونیہ لکھکر خشک ہو گیا۔ اب تغیر محال ہے۔ شاعر کی مراد یہ ہے کہ محبوب سے جواب خط کی امید رکھنی عبث ہے کیونکہ صانع تقدیر کو اس کی انگشت نازک کی خراش گوارا نہ ہوگی اور امور تقدیر میں رد و بدل ٹھہرا ناممکن۔ [۸] رم = گریز۔ یعنی خیال وصال میں بھی رم کی کیفیت ہے۔ ادھر آیا ادھر چلدیا۔ ورنہ اسی سے متمتع ہوتے۔ [۹] واعظ نے کہا تھا کہ مسلمان عذاب سے محفوظ رہیں گے۔ میں یہ سنکر اس خیال سے مسلمان ہو گیا کہ شاید اسلام کی برکت سے عذاب ہجر صنم سے (جو عذاب کی سخت ترین قسم ہے) بچ جاؤں ورنہ عذاب دوزخ کی مجھے پروا نہیں۔

ردیف الباء

۵۸ جگایا

گئے[1] وہ خواب سے اُٹھ غیر کے گھر آخر شب — اپنے نالے نے دکھایا یہ اثر آخر شب

صبحدم[2] وصل کا وعدہ تھا یہ حسرت دیکھو — مر گئے ہم دمِ آغازِ سحر آخر شب

ق

سوزِ دل سے گئی جاں بخت چمکنے کے قریب — کرتے ہیں موسمِ گرما میں سفر آخر شب

شعلۂ[3] آہ فلک رتبہ کا اعجاز تو دیکھ — اوّل ماہ میں چاند آئے نظر آخر شب

ملے[4] ہو غیر سے بے پردہ تم انکار کے بعد — جلوہ خورشید کا سا تھا کچھ اُدھر آخر شب

صبحدم[5] آنے کو تھا وہ کہ گواہی دے ہے — رجعتِ قہقری چرخ و قمر آخر شب

غیر نکلا ترے گھر سے گئی اس وہم میں جان — غُل ہوئے چور کے اُس کوچے میں گر آخر شب

دی تسلّی بھی تو ایسی کہ تسلّی نہ ہوئی — خواب میں تو مرے آئے وہ مگر آخر شب

مو[6] سفیدی کے قریب اور ہے غفلت مومن
نیند آتی ہے یہ آرام دگر آخر شب

[1] میرے نالے نے یہ الٹا اثر دکھایا کہ وہ آخر شب خواب سے اُٹھ کر اپنے گھر سے غیر کے گھر چلے گئے۔
[2] یہ شعر اور شعر ما بعد قطعہ بند ہیں۔ سوزِ دل کو موسم گرما سے اور بخت چمکنے کے قریب ساعت کو (جبکہ صبح وصل کی آمد آمد تھی) آخر شب سے تعبیر کیا ہے۔ [3] میری آہِ شبگیر کے شعلہ کا معجزہ دیکھو کہ اُس پر خلق کو مہینہ کے آغاز میں باوجود آخر شب چاند کا دھوکا ہونے لگا۔ عام قاعدہ تو یہ ہے کہ مہینہ کے آغاز میں چاند اوّل حصّہ شب میں نظر آتا ہے مگر میری آہ نے (جو آخر حصّہ شب میں بلند ہوئی) معجزہ کا اثر دکھایا تشکل کے اعتبار سے خود آہ کو فلک سے اور شعلۂ آہ کو چاند سے تشبیہ دی گئی۔ [4] رقیب یا معشوق کے یہاں آخر شب آفتاب کی سی جھلک تھی جس سے عاشق نے یہ نتیجہ نکالا کہ معشوق رقیب سے بے پردہ ملا ہوگا ورنہ جلوۂ خورشید کی کوئی وجہ نہ تھی اور انکار کے بعد ملا ہوگا ورنہ آخر شب کی بجائے۔ اول شب ہی جلوہ خورشید نظر آتا۔ [5] رجعت قہقری یعنی اُلٹے پاؤں واپس جانا۔ اصطلاح نجوم میں سیاروں کا اپنی سیر طبعی سے مشرق کی بجائے مغرب کی طرف واپس جانا رجعت کہلاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آخر حصّہ شب میں چرخ و قمر کا (جو رجعت سے مستثنیٰ ہیں) اُلٹے پاؤں پھرنا اور اوّل حصّہ شب کی طرف واپس جانا اس امر کی علامت ہے کہ معشوق کا قصد میرے یہاں صبحدم آنے کا تھا ورنہ یہ اُلٹے پیچ کیوں پڑتے صبح کے بجائے پھر شام کے آثار پیدا ہونا میری برگشتگی تقدیر کا کرشمہ ہے۔ [6] بڑھاپے کے قریب غفلت اور آخرت سے بیخبری اور بھی بڑھ گئی ہے جس طرح کہ صبح کے قریب زیادہ گہری نیند آتی ہے۔ بالوں کی سفیدی کو سفیدۂ سحر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

قتلِ[۱] عدو میں عذر نزاکت گراں ہے اب — مجھ میں ستم اُٹھانے کی طاقت کہاں ہے اب

وحشت سے میری سارے اَحبا چلے گئے — آنا ہے گر تو آؤ کہ خالی مکاں ہے اب

سجدے[۲] پہ سر قلم ہو دعا پر زباں کٹے — گویا نہ وہ زمیں ہے نہ وہ آسماں ہے اب

قتلِ[۳] عدو نے شوق شہادت مٹا دیا — لب پر ہمارے غلغلۂ الاماں ہے اب

پیری[۴] میں وصل غیرتِ یوسف ہوا نصیب — بختِ وفا مثال زلیخا جواں ہے اب

کہدیں[۵] رقیب نے تری بے التفاتیاں — ناصح ہمارے حال پہ کچھ مہرباں ہے اب

رکھ[۶] لے سر اپنے زانوے نازک پہ شوق سے — تیرا مریض عشق بہت ناتواں ہے اب

چشمِ غضب سے مشورۂ قتل کھل گیا — جو بات دل میں تھی سو نظر سے عیاں ہے اب

بے[۷] طاقتی سے مجھ میں نہیں تاب التفات — بیہودہ فکر جور و سرِ امتحاں ہے اب ۵۹

مقطع

وہ دن گئے کہ لاف و گزاف جہاد تھا
مومن ہلاکِ خنجرِ نازِ بتاں ہے اب

[۱] تم قتل عدو میں جو نزاکت کا عذر کرتے ہو یہ مجھکو گراں گزرتا ہے۔ کیونکہ اب شدت ضعف سے مجھ میں اس قسم کے ستم اُٹھانے کی طاقت نہیں رہی۔ عذر نزاکت کو ستم قرار دیا ہے اور نزاکت کی رعایت سے گراں کا لفظ استعمال کیا ہے۔ [۲] سجدہ و دعا اور زمین و آسمان میں لف و نشر مرتب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب ایسا انقلاب ہوگیا ہے کہ پہلے جن باتوں کی قدر ہوتی تھی اب تمھارے نزدیک وہی مستوجب عقوبت ٹھہرتی ہیں۔ [۳] یعنی اب اگر ہم قتل ہوئے تو بوالہوس کی ہمسری ٹھہرے گی جو ہمارے جذبۂ غیرت کے لیے باعث ننگ ہے۔ [۴] زلیخا کو پیری میں شباب عطا ہوا تھا اور حضرت یوسفؑ کی ملاقات نصیب ہوئی تھی۔ اسی طرح مجھے پیری میں وصال یار میسر ہوا۔ گویا اب میری وفا کا نصیب بھی زلیخا کی طرح جواں ہے۔ [۵] تیری نامہربانیاں سُنکر اب ناصح کو بھی میرے حال پر ترس آنے لگا ہے۔ [۶] تیرا مریض عشق اس قدر "ناتواں" ہوگیا ہے کہ اب اُسکا سر تیرے زانوے "نازک" پر بار نہیں ہوسکتا۔ [۷] اب ظلم کی فکر یا آزمایش کا خیال بیکار ہے۔ میری بے طاقتی اس درجے کو پہونچ گئی ہے کہ تمھارا انداز التفات ہی میرے ہلاک کرنے کو کافی ہے۔

۶۰ تم بھی[1] رہنے لگے خفا صاحب — کہیں سایہ مرا پڑا صاحب

ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب — غیر اور تم بھلے بھلا صاحب

کیوں اُلجھتے ہو جنبشِ لب سے — خیر ہے مَیں نے کیا کہا صاحب

کیوں لگے دینے خطِ آزادی — کچھ گنہ بھی غلام کا صاحب

ہائے ری چھیڑ رات سُن سُن کے — حال میرا کہا کیا صاحب

دمِ آخر بھی تم نہیں آتے — بندگی اب کہ مَیں چلا صاحب

ستم آزار ظلم و جور و جفا — جو کیا سو بھلا کیا صاحب

ق کس سے بگڑے تھے کس پہ غصّہ تھا — رات تم کس پہ تھے خفا صاحب

کس کو دیتے تھے گالیاں لاکھوں — کس کا شب ذکرِ خیر تھا صاحب

نام عشقِ بُتاں نہ لو مومن
کیجئے بس خدا خدا صاحب

۶۱ تھی[2] وصل میں بھی فکرِ جدائی تمام شب — وہ آئے تو بھی نیند نہ آئی تمام شب

واں طعنہ تیر بار یہاں شکوہ زخم ریز — باہم تھی کس مزے کی لڑائی تمام شب

رنگیں[3] ہے خون سر سے وہ ہاتھ آج کل رہے — جس ہاتھ میں وہ دستِ حنائی تمام شب

[1] جس طرح مَیں اپنے سے خفا رہتا ہوں تم بھی مجھ سے خفا رہنے لگے۔ سایہ پڑنا = اثر پڑنا۔ صاحب مومن کی منظورِ نظر کا تخلص ہے۔ شاید اُسی کی طرف اشارہ ہے۔

[2] تعجب ہے کہ اہلِ دہلی کے خلاف مومن اس جگہ فکر کو مونث باندھ گئے ہیں بعض نسخوں میں مذکر استعمال ہوا ہے

[3] کل رہے کا تعلق مصرعِ ثانی سے ہے یعنی میرا وہ ہاتھ جس میں کل تک محبوب کے دستِ حنائی رہے آج سر پھوڑنے کی وجہ سے سر کے خون سے رنگین ہے۔

تالو سے یاں زبان سحر تک نہیں لگی
تھا کس کو شغلِ نغمہ سرائی تمام شب

یکبار دیکھتے ہی مجھے غش جو آگیا
بھولے تھے وہ بھی ہوش ربائی تمام شب

مر جاتے کیوں نہ صبح کے ہوتے ہی ہجر میں
تکلیف کیسی کیسی اُٹھائی تمام شب

گرمِ[3] جوابِ شکوۂ جورِ عدو رہا
اُس شعلہ خو نے جان جلائی تمام شب

کہتا ہے مہر وش[4] تمھیں کیوں غیر گر نہیں
دن بھر ہمیشہ وصل جدائی تمام شب

دھر[5] پاؤں آستاں پہ کہ اس آرزو میں آہ
کی ہے کسی نے ناصیہ سائی تمام شب

مومن میں اپنے نالوں کے صدقے کہ کہتے ہیں
اُس کو بھی آج نیند نہ آئی تمام شب

ردیف الباء الفارسی

۶۲

یاں سے کیا دنیا سے اُٹھ جاؤں اگر رکتے ہیں آپ
رُک گیا میرا بھی دم کیوں اس قدر رکتے ہیں آپ

ضبطِ[1] نالہ بوالہوس کا ننگ کے باعث نہیں
شرم سے آہ و فغانِ بے اثر رکتے ہیں آپ

سنگ[2] رہ ہے امتحاں تاثیرِ حسن و عشق کا
ہم اِدھر رکتے ہیں آپ اور وہ اُدھر رکتے ہیں آپ

جذبِ دل نے غیر کے بھی کیا کہیں تاثیر کی
آج کیوں آتے ہوئے ہر گام پر رکتے ہیں آپ

[3] گرم شعلہ خو۔ جان جلانا رعایتاً شاعر نے استعمال کیے ہیں پہلے مصرع میں توالی اضافت ہے۔ [4] چونکہ مہر دن بھر ظاہر رہتا ہے اور شب کو غائب ہو جاتا ہے۔ اسلیے رقیب معشوق کو مہر وش کہتا ہے۔ اس میں معشوق کی ہرجائی روش کی طرف اشارہ ہے کہ وہ شب میں کسی اور کے پاس جاتا ہے۔ شب خدا جانے کہاں وہ ستم ایجاد رہا۔ [5] یعنی اپنے کاشانۂ ناز سے باہر آ۔
[1] بوالہوس کا ضبطِ نالہ اس خیال سے نہیں کہ نالہ کرنا عشق کے لیے موجب ننگ ہے۔ بلکہ اُسکی آہ و فغاں بے اثر خود شرم نارسائی کے باعث رکی ہوئی ہے۔ [2] ہمارے ارتباط باہمی میں تاثیر حُسن و عشق کا امتحان سدِ راہ ہے۔ یعنی اُدھر اُن کو یہ انتظار ہے کہ میری کشش حُسن سے عاشق خود کھنچ آئے۔ اِدھر میں یہ راہ دیکھ رہا ہوں کہ میرے جذبِ عشق سے وہ خود اس طرف متوجہ ہو۔

جائیے پھر اسکے کوئے دلکشا میں کس لیے — حضرتِ دل سینے میں آٹھوں پہر رکتے ہیں آپ

سچ کہو ہے کس سے وعدہ آج جاؤ گے کہاں — خود بخود بیٹھے ہوئے کیوں اپنے گھر رکتے ہیں آپ

پاس تم کو ہی نہیں تو جائیے غیروں کے پاس — مَیں نہ روکوں روکنے سے میرے گر رکتے ہیں آپ

وصل شیریں کی تمنا کوہکن کو کیا کہوں — صحبتِ شاہاں سے اربابِ ہنر رکتے ہیں آپ

دل[51] کسی بُت کو دیا اے حضرتِ مومن کہیں
وعظ میں کیوں برہمن کو دیکھکر رکتے ہیں آپ

ردیف التاء

٦٣

کیا دیکھتا[1] خوشی سے ہے غیروں کے گھر بسنت — پھولی ہے یاں کچھ اور ہی لے بے خبر بسنت

واں تو ہے زرد پوش یہاں مَیں ہوں زرد رنگ — واں تیرے گھر بسنت ہے یاں میرے گھر بسنت

یہ کس کے زرد چیرہ[52] کا اب دھیان بندھ گیا — میری نظر میں پھرتی ہے آٹھوں پہر بسنت

آوارگی ہے باعثِ نشو و نما کہ دیکھ — سرسبز[53] جب ہوئی کہ پھری دربدر بسنت

ہم قیدیوں کو چاہئیں سونے کی بیڑیاں — اے چارہ گر جہان میں ہے جلوہ گر بسنت

اُس رشکِ گُل کے ہاتھ تلک کب پہونچ سکے — سرسوں[54] ہتیلی پر نہ جمائے اگر بسنت

---

[51] مومن مصروف وعظ ہیں کہ برہمن آگیا جس کو دیکھکر مومن خاموش ہوگئے۔ اس خیال سے کہ مبادا وعظ میں بتوں کی مذمت آجائے اور برہمن کے ذریعہ سے بتوں کو خبر پہونچے۔

[1] بسنت پھولنا = نیا شگوفہ کھلنا۔ [52] چیرہ = دستار رنگین و منقش۔ [53] قاعدہ ہے کہ لوگ بسنت میں نئی بالی مبارکباد کے طور پر گھر گھر لے جاتے ہیں۔ [54] ہتیلی پر سرسوں جمانا = کوئی مشکل کام جلد انجام دینا۔ واضح رہے کہ بسنت سرسوں پھولنے کا زمانہ ہے۔

کس کو بھلا خلل یرقان[1] کا ہے اے طبیب
ہے اوّلِ بہار سیہ مستیوں کا جوش

پھولی ہے باغِ عشق کی یاں آنکر بسنت
دکھلائے ہے کچھ اپنی بہار دگر بسنت

مومن[2] یہ کیا کہا کہ ہے رسمِ ہنود اب
کا ہیکو لائیں گے وہ مری گور پر بسنت

٦٤

سودا تھا بلا کے جوش پر رات
بستر پہ بچھائے نیشتر رات

بگڑے تھے یہاں وہ آنکر رات
بے طور بنی تھی جان پر رات

ہم تا سحر آپ میں نہیں تھے
کیا جانئے رہے وہ کسکے گھر رات

افسانہ[3] سمجھ کے سو گئے وہ
کام آئی فغان بے اثر رات

آئینہ[4] میں ہو نہ موم جادو
سوتے نہیں اب وہ تا سحر رات

تارے آنکھیں جھپک رہے تھے
تھا بام پہ کون جلوہ گر رات

ق

اندھیر پڑا زمانے میں ہائے
نہ دن کو ہے مہر نہ قمر رات

اس لیل و نہار غم نے مارا
ہے روز سیہ سیاہ تر رات

ق

کیا پوچھو ہو منکر و نکیر آہ
بگڑے جو وہ طعن غیر پر رات

---

[1] یرقان = ایک مرض جس میں چہرہ اور جسم زرد ہو جاتا ہے۔ [2] بعض جگہ مسلمانوں میں رواج ہے کہ قبروں پر بسنت مناتے ہیں۔ حالانکہ بسنت کی رسم دراصل ہنود سے لیگئی ہے۔
[3] ہماری فغاں بے اثر نے اتنا اثر تو کیا کہ وہ اسکو افسانہ سمجھ کے سو گئے۔ [4] قاعدہ ہے کہ جب جادو جگانا ہوتا ہے تو اس میں منجملہ اور چیزوں کے موم بھی استعمال کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ غالباً معشوق کے آئینہ میں جادو کا موم لگا ہوا ہے جسکا اثر یہ ہے کہ اب اُسے رات بھر صبح تک نیند نہیں آتی۔ (یا وہ دن رات محو آرایش رہتا ہے) آئینہ کو جمانے کی غرض سے موم لگانے کا عام رواج تھا۔

یہ بات بڑھی کہ مر گئے ہم	موت آئی تھی قصہ مختصر رات

اُس[۵۳] گھر میں ہے عیش خلد مومن
کیا جانے کہاں ہے دن کدھر رات

۶۵

کرتے[۵۴] ہیں عدو وصل میں حرماں کی شکایت
تھی بارے موثر غم ہجراں کی شکایت

یوں کرتے تھے وہ کب دلِ نالاں کی شکایت
کی ہو گی فلک نے مرے افغاں کی شکایت

اے پردہ نشیں چاہوں اُٹھا دے کہ نہ جل جائے
کرتا ہوں میں سوزِ غم پنہاں کی شکایت

ہم خاک میں بھی مل گئے لیکن نہ ملے وہ
دل ہی میں رہی رنجشِ جاناں کی شکایت

پامال ستم ہے دلِ ناکام کے ہاتھوں
کس مُنہ سے کروں ولولۂ جاں کی شکایت

صد شکر وہ اُلجھی ہوئی تقریر نہ سمجھا
تھی برہمیِ زلف پریشاں کی شکایت

ہے کس لیے مجھ سے اُسے دل دینے کا شکوہ
کرتا ہے جہاں میں کوئی احساں کی شکایت

کیا باب[۵۵] اجابت پہ گذر ہووے دعا کا
سُنتا ہے اثر کب ترے درباں کی شکایت

اے شور[۵۶] جنوں ڈر ہے زباں بند نہ ہو جائے
گر آئے لبوں پہ مرے زنداں کی شکایت

---

۵۳ خلد میں دن رات کا امتیاز نہ ہوگا۔ کاشانۂ یار میں بھی فرط طرب یا محویت میں عاشق کو دن رات کی تمیز نہیں اسلیے اس کو خلد قرار دیتا ہے۔

۵۴ رقیب وصل میں بھی بے التفاتِ یار کے شاکی ہیں۔ میں نے جو غم ہجر کی شکایت کی تھی شاید اُسی کا یہ اثر ہوا۔ ۵۵ میں تیرے درباں کی بے رُخی کی شکایت اور تیرے در تک رسائی کی دعا کیا کروں۔ کیونکہ اثر سے یہ اُمید نہیں کہ تیرے درباں کا شکوہ سُنے۔ ایسی صورت میں دعا کا مقرونِ اجابت ہونا معلوم۔

۵۶ شورِ جنوں میں آدمی بکا کرتا ہے۔ شاعر شورِ جنوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ زنداں کی پابندیاں اس حد تک پہونچ گئی ہیں کہ اگر مصائب زنداں کی شکایت کرونگا تو خوف ہے کہ مبادا زباں بندی ہو جائے اور بولنے کی آزادی بھی جاتی رہے۔

کیوں[۵۳] طعنہ سمجھکر ہے گلہ شکرِ جفا کا
کس[۵۴] واسطے اے شمع زباں کاٹتے ہیں لوگ

جانے دو کہ بیجا ہے پشیماں کی شکایت
کیا تو نے بھی کی تھی شبِ ہجراں کی شکایت

حورانِ بہشتی کو بتوں کا سا نہ پایا
مومن مجھے کیونکر نہ ہو ایماں کی شکایت

ردیف الثاء

اظہار شوق[۵۵] شکوہ اثر اُس سے تھا عبث
مَیں ایک سخت جان ہوں گردونسے پوچھ لو

تھا[۵۶] ہم پہ لطف تو پئے افزائش الم
اے مہروش یہ حسن تو ہرگز نہ چھپ سکے

اُمید[۵۷] وعدہ بھی تو نہیں روزِ ہجر میں
اس[۵۸] ضعف میں تو سینے سے آتا ہے لبتلک

یعنی کہا کہ مرتے ہیں تم پر کہا عبث
تم کو خیال ہے مرے آزار کا عبث

صد شکر غیر ہو گئے اُس سے خفا عبث
چلون تو کیا ہے پردے کا بھی چھوڑنا عبث

ہم سے وفائے زندگیٔ بیوفا عبث
کہتے ہیں اپنے نالے کو ہم نارسا عبث

۵۳ مَیں تمھاری بیداد کا شکر کرتا ہوں اور تم طعنہ سمجھکر گلہ کرتے ہو - جانے دو میں اپنے کیے پر پشیمان ہوں جو شخص پشیمان ہو جائے اُسکی شکایت نہیں کیا کرتے - ۵۴ گلگیر سے شمع کے کترنے کو زبان کاٹنا قرار دیا ہے -
۵۵ شوق شکوہ اثر = وہ شوق جس کا اثر شکوہ کا سا تھا - مومن کی مخصوص ترکیب ہے -
۵۶ معشوق نے ہم پر جو لطف کیا تو اُس کا مقصد یہ تھا کہ ستم کی تکلیف کا احساس اور زیادہ ہو مگر صد شکر کہ رقیبوں نے اُس کو حقیقی التفات پر محمول کیا اور معشوق سے ناحق بگڑ بیٹھے - ۵۷ روزِ ہجر میں زندگیٔ بیوفا نے وفا بھی کی تو بیکار - کیونکہ معشوق سے اُمید وعدہ بھی تو نہیں جس پر زندہ رہنا گوارا ہو -
۵۸ شاعر نے شعر میں طنز کا پہلو نظر رکھا ہے اور لفظ نارسا میں ایہام سے کام لیا ہے - یعنی جب نالہ باوجود ضعف سینے سے نکلکر لبتک پہونچ جاتا ہے تو پھر اُسکو نارسا کہنا غلط ہے - گویا میرے حق میں اُسکا رسا ہونا اسی قدر ہے مرزا غالب نے بھی یہی مضمون باندھا ہے - دل میں آجائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے ؂ اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں -

کیا[5] اپنے دودِ دل کا بھی شکوہ نہ کیجئے — اُلجھے ہے بات بات پہ زلفِ دوتا عبث

گو چارہ ساز حضرتِ عیسیٰ ہی کیوں نہ ہوں — گر دردِ عشق ہے تو اُمیدِ شفا عبث

جس[6] غم میں مر رہے تھے وہ غم ہی نہیں رہا — (دیکھا) افسوس مر کے سمجھے کہ جینا ہے کیا عبث

اے روزِ حشر کچھ شبِ ہجراں بھی کم نہیں — بدنام ہو جہان میں تیری بلا عبث

ہرگز نہ رام وہ صنمِ سنگدل ہوا
مومن ہزار حیف کہ ایماں گیا عبث

ردیف الجیم

۶۷

ہو نہ[1] بیتاب ادا تمھاری آج — ناز کرتی ہے بیقراری آج

اُڑ گیا[2] چرخ پر غبار اپنا — ہو گئی خاک خاکساری آج

نزع[3] ہے اور روزِ وعدۂ وصل — ہے بہر طور دم شماری آج

مانعِ قتل کیوں ہوا دشمن — جان ہی جائے گی ہماری آج

تیرے آتے ہی دم میں دم آیا — ہو گئی یاس اُمیدواری آج

کوئی بھینچے ہے دل کو پہلو میں — کس نے کی اس سے ہمکناری آج

[5] میں اپنے دودِ دل (آہ) کی شکایت کرتا ہوں۔ زلف کا گلہ نہیں کرتا۔ پھر وہ کیوں برہم ہوتی ہے۔ دود اور زلف کی مشابہت ظاہر ہے۔ [6] زندگی بھر جس غم میں مرتے رہے وہ غم اب نہیں رہا۔ افسوس مر کر یہ تجربہ ہوا کہ زندگی بیکار تھی۔ اسلئے کہ غم جو حاصل زندگی تھا وہی جاتا رہا۔

[1] کہیں تمھاری اداؤں میں (میری بیقراری کے اثر سے) بیتابی کی شان نہ پیدا ہو گئی ہو جو آج میری بیقراری اس قدر نازاں ہے۔ [2] مجھے اپنی خاکساری پر ناز تھا مگر مرنے کے بعد جب میرا غبار اُڑ کر آسماں پر گیا تو دعوائے خاکساری باطل ہو گیا۔ [3] وعدہ کے انتظار نے اس قدر طول کھینچا کہ نزع کی ساعت آگئی۔ اب تک تو ہم وعدہ کی وجہ سے دم شماری کر رہے تھے۔ اب نزع کے باعث دم شماری کر رہے ہیں۔

اُسکے شکوہ سے ہے اثر ظاہر — کچھ تو کہتی ہے آہ وزاری آج

اک نئی آرزو کا خون ہوا — ہم ہیں اور تازہ سوگواری آج

چھُٹ گئے مرکے نیشِ ہجراں سے — کام آیا ہے زخم کاری آج

بیکسی کیوں ہے نعش پر مجمع — کیا ہوئی تو مری پیاری آج

بھولے حضرت نصیحت اے ناصح — ہے کسی کی تو یادگاری آج

مومن اُس بُت کو دیکھ آہ بھری — کیا ہوا لافِ دینداری آج

ردیف الجیم الفارسی

پنجۂ شانہ سے تو زلف گرہ گیر نہ کھینچ — ۴۸ دل سے دیوانہ کو مت چھیڑ یہ زنجیر نہ کھینچ

ہم تو بچتے نہیں تا شام وہ آئے بھی تو کیا — اے دعائے سحری منتِ تاثیر نہ کھینچ

اے ستم پیشہ مرے بعد کہاں نشۂ عشق — دیکھ خمیازۂ حسرت ہے یہ شمشیر نہ کھینچ

ہے دوا میری وہی سو نہیں ممکن کہ ملے — چارہ گر رنج و مصیبت پئے تدبیر نہ کھینچ

سلہ میری آہ وزاری نے کچھ تو تاثیر کی ورنہ معشوق شکوہ کیوں کرتا۔ اسی سے آہ وزاری کا اثر ظاہر ہے مطلب یہ ہے کہ معشوق نے میری فریاد وفغاں پر برہم ہو کر اُلٹی شکایت کی۔ اتنا اثر تو ضرور ہوا (اگر اسکو اثر کہہ سکتے ہیں) ورنہ حقیقت میں فریاد کا موثر ہونا معلوم۔ سلہ مرنے کے بعد نعش پر تماشائیوں کا مجمع ہے جس پر عاشق بیکسی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے بیکسی! عمر بھر تیری بدولت میں اکیلا رہا آج تو کہاں ہے۔ تیرا تقاضا تو یہ تھا کہ آج میری نعش بھی تنہا رہتی۔ اسی سے ملتا ہوا مضمون مومن نے فارسی میں ادا کیا ہے۔

بیکسی بنگر کہ بر تابوت من + چشم گریانست خاص وعام را

سلہ دلِ عاشق کو جو زلف میں بندھا ہوا ہے دیوانہ اور زلف کو اُسکی زنجیر قرار دیا ہے۔ سلہ میرے بعد کوئی ایسا نہیں جو نشۂ عشق سے سرشار ہو۔ اسلیے تو مجھے قتل کرکے پچھتائے گا گویا یہ شمشیر کا کھینچنا نہیں خمیازۂ حسرت کھینچنا ہے۔ شمشیر کو خم کے لحاظ سے خمیازہ (انگڑائی) سے تشبیہ دی ہے۔ سلہ وہی = معشوق۔

میں ۴۹ نہ کہتا تھا مصوّر کہ وہ ہے شعلہ عذار ... دیکھ تو صفحۂ قرطاس پہ تصویر نہ کھینچ

ہم جوانمرد محبّت بھی سمجھ لیں گے بھلا ... اپنی ایذا سے تو ہاتھ لے فلک پیر نہ کھینچ

روز غم کون بھلا اُن کے ہوتا ہے شریک ... انتظار اثر اے نالۂ شبگیر نہ کھینچ

اتنی فرصت ہے ستمگر کہ پہونچے جا جل ... دم کے دم اور بھی سینے سے مرے تیر نہ کھینچ

مومن ۵۰ آئینِ محبّت میں کہ ہے سب جائز
حسرت حرمتِ صہبا و مزامیر نہ کھینچ

ردیف الحاء

۶۹

گر چند ۵۱ سے اور یہ ہی رہی یار کی طرح ... ہم بھی بنیں گے بوالہوس اغیار کی طرح

آواز ۵۲ گنبد اُس سے شکایت عدو کی تھی ... ناچار چپ ہیں صورتِ دیوار کی طرح

سونے دیا نہ اُس نے شبِ وصل میں بھی کیا ... ہم جاگتے ہیں طالع بیدار کی طرح

پھرتا ہے پھر گشتِ عشاق کو بکو ... گردش میں ہے وہ چرخ ستمگار کی طرح

۴۹ شعلہ عذار = شعلہ رخسار - یعنی میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اُسکی شعلہ رخساری کے اثر سے تصویر کا کاغذ جل جائے گا۔ ۵۰ صہبا = شراب - مزامیر = (مزمار کی جمع) بانسری - ساز موسیقی۔ اے مومن تو شراب اور موسیقی کے حرام ہونے کی تکلیف کیوں اُٹھاتا ہے - مذہب عشق اختیار کر اُس میں یہ سب چیزیں جائز ہیں ۵۱ اغیار ہیں (جو معشوق کے مورد التفات ہیں) اور ہم میں اگر کوئی فرق ہے تو یہ کہ وہ بوالہوس ہیں ہم عاشق صادق - آئندہ سے ہم بھی بوالہوس بنیں گے تاکہ اسی صورت سے اُسکی عنایت کے مستحق ٹھہریں - پہلے مصرع میں طرح بمعنی ادا ہے۔ ۵۲ آواز گنبد کی بازگشت مشہور ہے ع ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے میں نے اُس سے عدو کی شکایت کی جس پر وہ اُلٹی میری شکایت کرنے لگا - ناچار مجھے صورت دیوار کی طرح خاموشی اختیار کرنی پڑی -

ہوتے ہیں پایمال گُل اے بادِ نو بہار
کس سے اُڑائی تو نے یہ رفتار کی طرح

چینِ جبیں بلا و نگاہِ غضب ستم
کرتی ہے قتل اُس بُتِ خونخوار کی طرح

خو رنج رشکِ غیر کی بھی ہم کو ہو گئی
اب اور کچھ نکالئے آزار کی طرح

ہوتے[۵۳] ہیں قتل غیر اب ادھر ہے نگاہِ لطف
ارماں مرے نکلتے ہیں تلوار کی طرح

کرتا ہے ابر اپنا لہو پانی ایک کیوں
کب رو سکے گا دیدۂ خونبار کی طرح

بس نازکی ضعف کہ گلگشت باغ میں
چُبھتے ہیں میرے پاؤں میں گُل خار کی طرح

دل[۵۴] میں ہوائے بُتکدہ ظاہر میں کیا حصول
رہنا حرم میں مومنِ مکّار کی طرح

رویا کرینگے آپ بھی پہروں اسی طرح
اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی مری طرح

آتا نہیں ہے وہ تو کسی ڈھب سے داؤ میں
بنتی نہیں ہے ملنے کی اُسکے کوئی طرح

تشبیہ کس سے دوں کہ طرحدار کی مرے
سب سے نرالی وضع ہے سب سے نئی طرح

مرجائیے[۵۵] کہیں کہ تو غمِ ہجراں سے چھوٹ جائے
کہتے تو ہیں بھلے کی وہ لیکن بُری طرح

نے تاب ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں
کم بخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح

لگتی ہیں گالیاں بھی ترے مُنہ سے کیا بھلی
قربان تیرے پھر مجھے کہہ لے اسی طرح

---

۵۳ اب رقیب قتل ہوتے ہیں اور ہماری طرف دوست کی نگاہ لُطف ہے اور ہمارے ارمان اس طرح نکلتے ہیں جیسے رقیبوں پر تلوار نکلتی ہے۔ ۵۴ وضاحت مطلب کے لیے اس شعر کی ترتیب نثر کافی ہے یعنی دل میں ہوائے بتکدہ (اور) ظاہر میں مومن مکار کی طرح حرم میں رہنا (آخر اس سے) کیا حصول۔
۵۵ مرکر غم ہجراں سے چھوٹ جانا میرے حق میں بھلائی ہے۔ وہ بھی یہی بات کہتے ہیں مگر اس بُرے انداز سے کہ سراسر دشمنی مترشح ہوتی ہے۔

پامال ہم نہ ہوتے فقط جورِ چرخ سے
آئی ہماری جان پہ آفت کئی طرح[4]

نے جائے واں بنے ہے نہ بن جائے چین ہے
کیا کیجیے ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح

معشوق اور بھی ہیں بتا دے جہان میں
کرتا ہے کون ظلم کسی پر تری طرح

ہوں جاں لبِ بتانِ ستمگر کے ہاتھ سے
کیا سب جہاں میں جیتے ہیں مومن اسی طرح

۷ ردیف الخاء

۱۷

عدو[1] نے دیکھے کہاں اشکِ چشمِ گریاں سُرخ
نہ آستیں ہے نہ رومال ہے نہ داماں سُرخ

نمودِ حسن[2] خطِ یار سے نہ ہو کیونکر
بہار ہے جو تہ سبز ہو نمایاں سُرخ

تمھارے[3] دشنہ کا دستِ خفہ نے کام کیا
ہے زرد رنگ گلو حلقۂ گریباں سُرخ

زبس فگار ہوئے پانوں خار و خارا[4] سے
تمام دشت ہے جوں وسعتِ گلستاں سُرخ

ملی[5] ہیں غیر نے پائے نگار سے آنکھیں
سرشک خوں سے نہیں پنجہ ہائے مژگاں سُرخ

[4] کئی طرح یعنی بیدادِ یار۔ ظلم رقیب وغیرہ۔

[1] یہ غم عدو کو کہاں نصیب۔ [2] سبز (مثلاً پتوں) کے نیچے سے سُرخ (پھولوں) کا نمایاں ہونا بہار دیتا ہے۔ پھر خط (سبز) سے محبوب (کے روئے رنگیں) کا حُسن کیوں نہ ظاہر ہو۔

[3] دشنہ = خنجر۔ دست خفہ = وہ ہاتھ جس سے گلا گھونٹا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے گلا گھونٹ کر اپنا کام تمام کیا اور اپنے ہاتھ سے خنجر کا کام لیا۔ جس کے اثر سے (ضعف کے باعث) رنگ گلو زرد ہے اور گلے کے نشان سُرخ ہیں۔ [4] خارا = سنگ سخت۔

[5] رقیب کے پنجہ ہائے مژگاں (پلک) اشک خون سے سرخ نہیں بلکہ اُس نے معشوق کے (حنائی) پانوؤں سے آنکھیں ملی ہیں جس کا یہ اثر ہے۔

	آنج	
گمانِ قہر سے اپنا تو رنگ زرد ہے اور		سیاہ مستیِ مے سے ہے چشمِ جاناں سُرخ
موا ہوں عشق میں گل پیرہن کے لازم ہے		مرا کفن بھی ہو جوں جامۂ شہیداں سُرخ
سرایتیں ہیں یہ طوفانِ اشکِ خونیں کی		کہ ایک ایک شجر ہے برنگِ[۶] مرجاں سُرخ
کرم جو غیر پہ دیکھا لہو اتر آیا		نہ پوچھ کیوں تری آنکھیں ہیں[۷] نکلے ناداں سُرخ
نوید مرگ انھیں جو ہیں زخمی لبِ یار		کہ رنگ پان سے ہوئے اور لعلِ خنداں[۸] سُرخ
نظارۂ[۹] رخِ مردم سے کیوں نہ غم ہو کہ تھا		ہمارا رنگ بھی پیشِ از دردِ ہجراں سُرخ
ہمارے[۱۰] خون کا دھبہ نہ جائے حشر تلک		وہ لاکھ بدلے قبا پر رہیگا داماں سُرخ

غریق[۱۱] گریۂ خونیں رہا نہ کر مومن
لباس یعنی پہنتے نہیں مسلماں سُرخ

ردیف الدال

	۷۲	
ہم دامِ محبت سے ادھر چھوٹے ادھر بند		پرواز بھی کی آہ تو جوں طائرِ پر بند
دیکھا[۱۲] نہ کسی کی طرف ایک ایسے حیا سے		جادو کو کیا نرگسِ جادو نے نظر بند
یہ مشتِ پرِ سوختہ پھونکیں گے قفس کو		تو ساتھ کسی کے سبھے صیاد نہ کر بند

۶ مرجاں = مونگا۔ ۷ مصرع ثانی میں تعقید ہے۔ ترتیب نثر یوں ہے۔ ناداں نکلے نہ پوچھ (کہ) تیری آنکھیں کیوں سُرخ ہیں۔ ۸ لب یار کو سُرخی اور خندہ کے اعتبار سے لعلِ خنداں کہا ہے۔
۹ اب ہجر کے ہاتھوں ہمارا سُرخ رنگ زرد ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تندرست لوگوں کے چہروں کو دیکھکر ہمیں غم ہوتا ہے۔ ۱۰ وہ لاکھ قبا بدلے مگر ہمارے خون کا داغ (مجازی معنی میں) نہ جائیگا۔ اس لیے دامن ہمیشہ سُرخ رہے گا۔ ۱۱ شرعاً سُرخ لباس ممنوع ہے اور ظاہر ہے کہ گریۂ خونیں میں غرق رہنے سے لباس سُرخ ہو جائے گا۔
۱۲ ایمارہ = اشارہ۔ نرگسِ جادو = مراد چشمِ معشوق۔ یعنی آنکھ کا سحر آنکھ ہی میں بند رہا۔

وہ آخر شب آئے ہیں کچھ بات تو کرلوں
کر اپنی زباں دم کے دم لے مرغ سحر بند

کیا ٹھہرے[۲] دلِ بوالہوساں میں تری الفت
شیشہ میں پری کرتے ہیں ارباب ہنر بند

جا سکتے[۳] نہیں جاتے ہیں اُس کُو میں جو ناصح
چھُٹ جائینگے قصہ سے کیا تو نے اگر بند

شاید[۴] کہیں تو نے بھی اسے خواب میں دیکھا
آنکھیں تری اے بخت ہیں کیوں آٹھ پہر بند

اے[۵] سوزشِ سینہ مجھے وہ سینہ دکھا دے
کھولے تری گرمی سے وہ گھبرا کے مگر بند

کیا حضرت **مومن** کہیں کعبے کو سدھارے
سنسان ہے گھر کس لئے کیوں آج ہے در بند

۷۴

غربت میں گل کھلائے ہے کیا کیا وطن کی یاد
جیسے قفس میں مُرغ چمن کو چمن کی یاد

گلگوں قبا پہن کے کیا قتل غیر کو
کیا آئی اپنے کشتۂ خونیں کفن کی یاد

از[۱] خویش رفتگی ہے عناں کش زماں زماں
دکھلائیگی عدم ہی کہیں اُس دہن کی یاد

تو آب[۲] زن نہ ہوئے تو کیا جانئے کیا کرے
دشمن کے دل سے میرے دمِ شعلہ زن کی یاد

---

[۲] رقیبوں کے دل میں تیری محبت نہیں ٹھہر سکتی اسلیے کہ شیشہ میں پری بند کرنا ہرکس و ناکس کا کام نہیں۔ صرف اہل ہنر کرسکتے ہیں اور رقیب ٹھہرے بے ہنر (یہ مومن کے مستاہاب میں سے ہے) دل کو شیشہ اور الفت کو پری سے تعبیر کیا ہے۔ [۳] ناصح! جب ہم دوست کی گلی میں جانے کا قصد کرتے ہیں تو رسائی نہیں ہوتی۔ اگر تو نے ہمیں قید کیا تو اس کشمکش سے چھوٹ جائیں گے اور طبیعت یکسو ہو جائے گی۔ [۴] شاعر نے اپنے خفتہ بخت ہونے کی نئی توجیہ کی ہے۔ وہ اپنے بخت سے کہتا ہے کہ تو نے شاید محبوب کو خواب میں دیکھا ہے جو آٹھ پہر اس تمنا میں تیری آنکھیں بند رہتی ہیں کہ وہ جلوہ پھر نظر آجائے۔ بخت کے سونے سے مراد بدقسمتی ہے۔
[۵] مومن اپنے سینہ کی جلن سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اپنی گرمی کا اثر دکھا۔ تاکہ اُسکی وجہ سے محبوب گھبرا کر بند قبا کھول ڈالے اور اُس کا سینہ نظر آجائے۔
[۱] دہن یار کی یاد میں جو از خود رفتگی ہے وہ مجھے بار بار عدم کی طرف کھینچتی ہے۔ یہ واقعی کسی روز عدم ہی میں پہونچا کر رہیگی۔ دہن کو عدم سے نسبت دینا شعرا کے یہاں عام ہے۔ [۲] اگر تو آب زن نہ ہو تو میری آہِ شعلہ زن کی یاد دشمن کے دل کو جلا کر چھوڑے۔ آب زن = پانی چھڑکنے والا۔ بجھانے والا۔ یہاں تسکین دینے والا یا مہربانی کرنے والا مُراد ہے۔

اسکے[۳] محتسب نہ توڑیو شیشہ کو دیکھنا
آتی ہے مجھکو سنگدلِ دلشکن کی یاد

تا[۴] شکوہ غیر کا نہ کروں مجھ سے کہتے ہیں
کیوں سرگذشت تم کو بھی ہے کوہکن کی یاد

پھر پیرہن کے ہوتے ہیں ٹکڑے برنگ گل
پھر مجھکو آگئی کسی گل پیرہن کی یاد

ایسے[۵] ہی روزگر ستمِ نو بنو رہے
تم کو بھلا رہے گی سپہر کہن کی یاد

ہے[۶] کفر و بدعت ایک نہیں تار سُبحہ سے
زنار مومن آئے ہے کیوں برہمن کی یاد

ردیف الذال

۴۷

نامہ رونے میں جو لکھا تو یہ بھیگا کاغذ
کہ بنا ہم گہرِ[۷] صفحۂ دریا کاغذ

اُس کے کوچے سے چلا آئے ہے اُڑتا کاغذ
پھاڑ کر پھینک دیا کیا مرے خط کا کاغذ

کیا جواب آئے کہ کثرت سے خطوں کے میرے
کیمیا یاب سیاہی بنی عنقا کاغذ

[۳] تیرے شیشہ توڑنے سے مجھے بُت سنگدل کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس نے اسی طرح میرا شیشۂ دل توڑ دیا تھا
[۴] خسرو وصل شیریں سے کامران تھا اور کوہکن محروم۔ معشوق مجھکو سرگذشت کوہکن یاد دلاکر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ یہ ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے۔ پھر شکوۂ رقیب بے سود۔ [۵] اگر چرخ کہن کے ستم نو بنو ہمپر اسی طرح اور جاری رہے تو ہمکو تمھارے ظلموں کی یاد کیونکر رہ سکتی ہے۔ یعنی آسمان کے مقابلہ میں تمھاری بیداد بھی فراموش ہو جائیگی اور اس میں تمھاری توہین ہے۔ اسلئے تمھیں چاہئے کہ عاشق کو آسمان کے تیر ستم کا ہدف بننے سے بچاؤ۔ نو اور کہن میں تضاد ہے۔ [۶] شعر میں تعقید ہے۔ اصل میں بندش یوں ہے۔ کفر و بدعت ایک ہے۔ ورنہ اسے مومن تار سُبحہ سے برہمن کی زنار کیوں یاد آئے ہے۔ واضح رہے کہ سبحہ (تسبیح) بدعت ہے اور زنار کفر ہے اور تار سُبحہ کی مشابہت زنار برہمن سے ظاہر ہے۔
[۷] ہم گہر = ہم اصل۔

سب نوشتے ترے اغیار کو دکھلاؤنگا — جانتا ہے تو مرے پاس ہیں کیا کیا کاغذ

لکھ[15] کے بدمستیِ غم تاکہ وہ میکش پڑھ لے — باندھ دیتا ہوں سرِ شیشۂ صہبا کاغذ

مشق[16] کرتے ہیں وہ کیوں لفظ نظر بازی کی — پردۂ دیدۂ مشتاق ہے یہ یا کاغذ

رنگ اُڑ جانے کا احوال اُسے لکھنا ہے — زردیِ رُخ سے زرافشاں میں کرونگا کاغذ

وصف لکھوں میں تری آنکھ کے ڈورونکا اگر — رگِ گل خامہ دے اور نرگسِ[17] شہلا کاغذ

ہوگیا اس لبِ لعل و دُرِ دنداں کے سبب — غیرتِ نسخۂ اکسیر مسی کا کاغذ

ضد یہ ہے خط سے مرے تاؤ ہزاروں کھائے — دستِ اغیار میں بھی گر کبھی دیکھا کاغذ

یاں تلک تو ہوں سیہ کار کوئی پڑھ نہ سکا — حشر میں جب مرے اعمال کا کھولا کاغذ

قبر میں چھوٹے عذابِ دلِ بیتاب سے ہم — نام جب لکھ کے ترا سینہ پہ رکھا کاغذ

تو غزل سنج ہے یا مرثیہ خواں اے مومن
رو دیا جس نے کہ دیکھا ترا لکھا کاغذ

[15] میں اپنی بدمستیِ غم لکھ کر کاغذ کو شیشۂ شراب پر باندھ دیتا ہوں تاکہ اُس میکش (معشوق) کی نظر پڑے اور وہ میری حالت سے آگاہ ہو۔

[16] معشوق کاغذ پر لفظ نظر بازی کی مشق کرتا ہے گویا اُسنے کاغذ کو عاشق کا پردۂ چشم قرار دیا ہے جس پر نظر بازی کی مشق کیجاتی ہے (مشق نظر بازی سے مراد اس صورت میں عاشق سے آنکھیں لڑانا ہے)۔

[17] نرگس شہلا = وہ نرگس جس کا پھول سیاہی مائل ہوتا ہے اور جو چشم انسان سے مشابہ ہے بخلاف نرگس عبہر جس کا پھول زرد ہوتا ہے۔

ردیف الراء

۷۵

نہ کیونکر بس ہوا جاؤں کہ یاد آتا ہے رہ رہ کر
وہ تیرا مسکرانا کچھ مجھے ہونٹوں میں کہہ کہہ کر

کہاں لختِ جگر ہیں سیلِ گریہ میں چڑھا دریا
چلے آتے ہیں یہ ڈوبے ہوؤں کی لاشے بہہ بہہ کر

بہارِ باغ دو دن ہے غنیمت جان اے بلبل
ذرا ہنس بول لے ہو زمزمہ پرداز چہ چہ کر

نوید[1] اے دل کہ رشکِ غیر سے چھوٹے اسے ہم نے
ستم کا کر دیا خوگر جفا و جور سہہ سہہ کر

ستم[2] ہے شدتِ گریہ سرایت خوں نے کی پر کی
رکھے رومال چشمِ خونفشاں پر لا کے تہہ تہہ کر

لگی ہچکی ہے سرزانوے غم پر ہے کہ یاد آیا
کسی کا ہاتھ ہر دم مارنا زانو پہ قہ قہ کر

خدا کو مان اپنی راہ لے کعبہ کو جا مومن
صنم خانہ میں کیا یوسے گا اے گم گشتہ رہ رہ کر

۷۶

اسے تند خو آ جا کہیں تیغا کمر سے باندھ کر
کن مدتوں سے ہم کفن پھرتے ہیں سر سے باندھ کر

یا وہ ڈبوئیگا زمیں یا ہم ڈبوئیں گے فلک
آ جائے تو روتے ہیں ہم شرط ابرِ تر سے باندھ کر

خط[3] میں تو لکھ سکتا نہیں احوال سوزِ دل اسے
پر بھیجدوں جی میں ہے پروانے کے پر سے باندھ کر

دشمن[4] سگِ کوچہ نہ ہو اس شوخ آہو چشم کا
نادم ہوں کعبِ گرگ پائے نامہ بر سے باندھ کر

---

[1] ہم نے ظلم سہہ سہہ کر معشوق کو ظلم کرنے کا خوگر بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ غیر پر بھی ظلم و جفا کرے گا اور غیر کی ثابت قدمی معلوم۔ بالآخر وہ (غیر) دعواے الفت سے کنارہ کرے گا اور ہمیں رشک سے نجات ملیگی۔ اُسے ہم نے کا تعلق مصرع دوم سے ہے۔ [2] میرے گریہ خونیں کی شدت غضب ہے جسکی وجہ سے خون رومال کی تہوں میں سرایت کرے گا اور راز عشق افشا ہوگیا۔ کی پر کی بین تکرار تاکید کی غرض سے ہے۔

[3] مطلب یہ ہے کہ میں خط میں تو معشوق کو احوال سوز دل لکھ نہیں سکتا اسلئے خط اسکے اثر سے جل جائے گا۔ لہذا چاہتا ہوں کہ دل ہی کو پروانے کے پر سے باندھکر بھیجدوں کیونکہ وہ بھی سوختہ ہے یہ بھی۔ معشوق خود مطلب سمجھ لے گا۔

[4] مشہور ہے کہ اگر بھیڑیئے کے ٹخنے (کعب) کی ہڈی نامہ بر کے پاؤں میں باندھ دیجائے تو وہ تھکتا نہیں۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے نامہ بر کے پاؤں سے کعب گرگ باندھکر شرمندہ ہوں۔ اسلئے کہ کہیں معشوق کی گلی کا کتا ہڈی کی بو پاکر نامہ بر کا دشمن نہ ہو جائے۔ سگ آہو گرگ میں مراعاۃ النظیر ہے۔ سگ و گرگ کی دشمنی مشہور ہے۔

ہے سُرخ پٹکا اور خونِ غیر میں رنگا ہوا — کیا قتل[۳] پر میرے کمر نکلے ہو گھر سے باندھکر

آجھانک تو بھی تو کہیں بے دید[۴] کیسی ٹکٹکی — بیٹھے ہوئے ہیں روزنِ دیوار و در باندھکر

جرّاح[۵] کیا سوچا بتا کیا رنگ دیکھا کیا ہوا — کیوں کھول لی پٹّی مرے زخمِ جگر سے باندھکر

دیوانۂ نازک ہوں مَیں فصادِ[۶] مژگاں نشتر — لے فصد میرے ہاتھ کو تارِ نظر سے باندھکر

مومن سے اچھی ہو غزل تھا اسلیے یہ زور و شور — کیا کیا مضامیں لائے ہم کس کس ہنر سے باندھکر

جاتے تھے صبح رہ گئے[۱] بیتاب دیکھکر — طالع ہمارے چونک پڑے خواب دیکھکر

پایا[۲] جو دشمنوں نے ترے پاس اعتبار — آنکھیں چُراتے ہیں مجھے احباب دیکھکر

یہ تشنہ[۳] کامیِ نگہ گرم دیکھنا — حسرت سے رو دیا طرفِ آب دیکھکر

---

[۳] یہ سب میرے قتل کا سامان ہے کیونکہ میں اس آرائش کی ادا پر یا حسد پر رشک سے ہلاک ہوجاؤنگا۔ پٹکا کمر میں ہوتا ہے اسلئے مصرع ثانی کے محاورے (کمر باندھکر نکلے ہو) نے لطف پیدا کر دیا۔ [۴] بے دید = بے مروت۔ کیسی ٹکٹکی کا تعلق مصرعہ ثانی سے ہے۔ اس قسم کی بندش مومن کے یہاں کثیر الوقوع ہے۔ [۵] پہلے جراح نے عاشق کے زخم جگر سے پٹّی باندھی اور پھر لا علاج سمجھکر فوراً کھول لی۔ اس پر عاشق سوال کرتا ہے۔ [۶] فصادِ مژگاں نشتر وہ فصّاد جس کے مژگاں نشتر کا کام دیں۔ یہاں معشوق مراد ہے۔ قاعدہ ہے کہ دیوانہ کی فصد کھولی جاتی ہے اور فصد سے پہلے دوران خون روکنے اور رگ نمایاں کرنے کے لیے پٹّی باندھی جاتی ہے۔ عاشق کہتا ہے کہ میں دیوانۂ نازک ہوں۔ اس لیے دیوانگی کے ساتھ نزاکت کی رعایت بھی ضروری ہے۔ اگر مژگاں نشتر ہے تو تار نظر پٹّی ہو۔ مراد یہ ہے کہ میرے جنون کا علاج تیری نگاہ توجہ ہے

[۱] معشوق صبح وصل رخصت ہو رہا تھا مگر ہمیں بیتاب دیکھکر رک گیا گویا ہمارے نصیب سو رہے تھے جاگ اُٹھے۔ جیسے سوتے میں کوئی شخص خواب دیکھکر چونک پڑے معشوق کی تیاری رخصت کو اپنی خفتہ طالعی اور رک جانے کو طالع کی بیداری سے تعبیر کیا ہے۔ [۲] احباب مجھ سے اسلیے آنکھیں چراتے اور اغماض کرتے ہیں کہ میں تیری نگاہوں میں حقیر ہوگیا ہوں۔ [۳] میرا دل محبوب کی نگہ گرم (نظر عتاب) کے اثر سے جلنے لگا اور اس جلن نے اسقدر تشنگی پیدا کر دی کہ ہم پانی کو دیکھکر حسرت سے رو دیا۔ حسرت کی وجہ یہ ہے کہ یہ پیاس پانی سے بجھنے والی نہیں یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ ہم دوست کی نظر عتاب کا اسقدر پیاسا (طالب) تھا کہ پانی کو دیکھ کر رو دیا۔ کیونکہ یہ (پانی) دنیا کی پیاس بجھائے۔ مگر میری تشنہ کامی اس سے دور ہونے والی نہیں۔

توبہ کہاں کدورتِ باطن کے ہوش تھے
غش ہوگیا میں رنگ مئے ناب دیکھکر

اُٹھی نہ نعش بھی ترے کوچے سے بعدِ قتل
ہم رہ پڑے زمین کو شاداب دیکھکر

روئے وہ میرے حال پہ حیران کیوں نہوں
آنکھیں سی کھل گئیں دُرِ نایاب دیکھکر

شوقِ وصال دیکھ کہ آیا عدو کے گھر
سوجھا نہ کچھ مجھے شبِ مہتاب دیکھکر

ہے ہے تمیزِ عشق و ہوس آجتک نہیں
وہ چھپتے پھرتے ہیں مجھے بیتاب دیکھکر

مومن یہ تاب کیا کہ تقاضائے جلوہ ہو
کافر ہوا میں دین کے آداب دیکھکر

۷۸

یاد اس کی گرمیِ صحبت دلاتی ہے بہار
آتشِ گل سے مرا سینہ جلاتی ہے بہار

کوہ و صحرا میں پئے فرحت پھراتی ہے بہار
میں تو کیا ان کو بھی دیوانہ بناتی ہے بہار

کھل چکی نرگس کہ شرمائی ہی جاتی ہے بہار
دیکھکر اس کی بہار آنکھیں چُراتی ہے بہار

توبہ! مجھے اس قدر ہوش کہاں رہے کہ شراب ناب کی باطنی کدورت پر نظر کرتا - میں تو اُس کا رنگ دیکھتے ہی غش ہوگیا - باطنی کدورت سے شراب کی تلچھٹ وغیرہ بھی مُراد ہوسکتی ہے اور اُس کی اخلاقی مضرت بھی - آنکھیں کھل جانا = حیران ہونا - محبوب کے اشکوں کو دُرِ نایاب کہاہے اسلیے کہ اُسے شاذونادر کسی کے حال پر رونا آتا ہے - شکل کے لحاظ سے اشک کی مشابہت موتی سے ظاہر ہے -
شبِ مہتاب (جو محرک جذبات ہوتی ہے) دیکھکر مجھے انجام نہ سوجھا اور تیری تلاش میں سیدھا رقیب کے گھر پہونچا - یعنی پردہ بوالہوس سے چاہئے تھا - نہ کہ عاشق سے -
اہل دین کو یہ تاب نہیں کہ تقاضائے جلوۂ دوست (معشوقِ حقیقی) کر سکیں اور اگر کوئی جنابِ کلیمؑ کی طرح تقاضائے ارنی کر بیٹھتا ہے تو اُسے جواب لن ترانی سُننا پڑتا ہے - دین میں یہ پابندیِ آداب دیکھ کر میں کافر ہوگیا کہ بُتوں کے یہاں یہ قیود تو نہیں - امید وعدۂ دیدار حشر پہ مومن - یہ بے مزہ تھا کہ حسرت کشِ بتاں نہ ہوا
آتشِ گل (سرخیِ گل) دیکھ کر مجھے محبوب کی گرمیِ صحبت یاد آتی ہے اور سینہ جلنے لگتا ہے - محبوب کے کوہ و صحرا میں پھرنے کو (خواہ بہ نیت تفریح کیوں نہ ہو) دیوانگی سے مماثل ٹھہرایا - معشوق کی بہار دیکھ کر خود بہار شرم سے آنکھیں چُراتی ہے - نرگس کو بہار کی آنکھ قرار دیا ہے - کھل چکی = اب نہیں کھل سکتی ہے

جلوۂ[3] لالہ رقیبوں کو دکھاتی ہے بہار
داغ کھانے پر مرے کیا داغ کھاتی ہے بہار

آمد آمد ہے چمن مین کس سمن اندام کی
سبزۂ خوابیدہ سے مخمل بچھاتی ہے بہار

خاک تو مرغِ گلستاں کو خزاں ہی دے گیا
دیکھئے اب آنکر کیا خاک اُڑاتی ہے بہار

ہے[4] خزاں میں بھی وہی جوشِ جنوں کیا ہو گیا
اب کہیں پاس اپنے ہم کو بھی بُلاتی ہے بہار

جوشِ[5] گل سے یاد آتی ہیں تری رنگینیاں
رنگ رفتہ سے مرے کیا رنگ لاتی ہے بہار

داغ اور زخم اس میں ہیں جو لالہ و گل اُسمیں ہیں
فصل ہے یا آپکے عاشق کی چھاتی ہے بہار

امتیازِ[6] دلدہی و دلبری میں فرق ہے
تم کو بھاتی ہے خزاں اور ہم کو بھاتی ہے بہار

محوِ حیرت کو وصال و ہجر دونوں ایک ہیں
بُلبُل[8] تصویر کو کب یاد آتی ہے بہار

میری[9] ضد سے غیر پر تیری عنایت دیکھکر
سبزۂ بیگانہ کے قربان جاتی ہے بہار

ابتدائے فصل ہی میں غیر بھی کھاتے[10] ہیں گل
دیکھئے اس سال کیا کیا گل کھلاتی ہے بہار

---

[3] مَیں نے عشق میں جو داغ کھائے ہیں اُن کے غم سے خود بہار داغ کہاتی ہے۔ جنکا اثر لالے کی شکل میں نمودار ہوا ہے۔ تاکہ رقیبوں کو غیرت آئے۔ [4] دورِ خزاں میں بھی جب وہی جنون کی کیفیت ہے تو شاید مر کر چین ملے۔ بہار خود تو عدم میں گئی۔ ہمیں بھی اپنے پاس بلاکر رہے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام آگ بہار ہی کی لگائی ہوئی ہے۔ [5] بہار میرے رنگ رفتہ سے یہ سلوک کرتی ہے کہ جب اُس کا جوشِ گل دیکھ کر مجھے تیری رنگینیاں یاد آتی ہیں تو رنگ رُخ زیادہ متغیر ہو جاتا ہے۔ رنگ کو رفتہ اس لیے کہا کہ وہ عشق کے باعث پہلے ہی سے اُڑا ہوا ہے۔

[6] عشق اور حُسن کے پسند میں بڑا فرق ہے۔ دیکھ لو۔ تم نے خزاں (دل عاشق کو) انتخاب کیا اور میں نے بہار (ذات معشوق) کو۔ اس میں عاشق یک گونہ اپنی فوقیت ثابت کرتا ہے۔ دلدہی یہاں عاشقی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

[8] تصویر میں جو بُلبل کی شکل بنائی جائے اُس کو محوِ حیرت کہا ہے۔

[9] تو میری ضد سے غیر پر جو عنایت کرتا ہے اُس کو دیکھ کر بہار بھی سبزۂ بیگانہ پر قربان ہونا سیکھ گئی۔ غیر کو سبزۂ بیگانہ اور معشوق کو بہار سے نسبت دی ہے۔

[10] گل کھانا = داغ کھانا۔ اور گل کھلانا = کارِ عجیب کرنا۔

چشمِ[۱۱] گلشن پر قدم رکھتا ہوا کون آئیگا
عطرِ فتنہ میں گُلِ نرگس بساتی ہے بہار

خندۂ[۱۲] دیوانگی یاں بعد مُردن بھی رہا
خاک سے اُگتے ہیں گُل ان کو ہنساتی ہے بہار

کچھ[۱۳] سوائے گریہ جوں ابر اپنی قسمت میں نہیں
زعفراں کی کیوں نہ ہو مجھکو رُلاتی ہے بہار

غنچہ[۱۴] ہائے آرزوئے مومن اب کِھلنے کو ہیں
خیر مقدم گلشنِ ایماں میں آتی ہے بہار

۷۹ عشق

بیمروت ناتواں[۱۵] ہیں ہنس دے روتا دیکھکر
دل دیا مَیں نے اُسے کیا جانئے کیا دیکھکر

خواب[۱۶] میں کیا خوش ہو یوسف کو زلیخا دیکھکر
کُھل گئیں آنکھیں تجھے لے جلوہ آرا دیکھکر

تجھی[۱۷] جہنم وہ نگاہِ گرم بھی سوئے عدو
سوجھی اپنی عاقبت کی ہم کو دنیا دیکھکر

قیس کی دیوانگی میں عقل کیا حیراں ہے
مجھکو وحشت ہوگئی تصویرِ لیلا[۱۸] دیکھکر

---

۱۱ چشمِ گلشن یعنی نرگس - ۱۲ ہماری خاک سے گُل اُگتے ہیں اور گُل بہار میں خندہ زن ہوا کرتے ہیں۔ اسی کو شاعر نے اپنا خندۂ دیوانگی قرار دیا ہے - ۱۳ ہماری قسمت میں ابرِ بہار کی طرح رونا ہی لکھا ہے - اگر زعفران کی بہار ہو تو بھی ہمیں گریہ کے سوا کوئی کام نہیں - عام قاعدہ ہے کہ زعفران کی بہار دیکھکر ہنسی آتی ہے - ۱۴ اس شعر میں مومن نے اپنے امام سید احمد صاحب سے اظہار عقیدت کیا ہے - مطلب یہ ہے کہ اُن کے مساعی سے گلشنِ ایمان میں بہار آنے والی ہے -

۱۵ ناتواں بیں = حاسد - جو کسی کا بُرا چاہے - یہاں معشوق مراد ہے -

۱۶ مشہور ہے کہ زلیخا حضرت یوسفؑ کو خواب میں دیکھکر عاشق ہوئی تھی - مطلب یہ کہ تجھے دیکھکر زلیخا کی آنکھیں کُھل گئیں - کہ "ایسے حسین بھی ہوتے ہیں پیدا خدا کی شان" - اب ممکن نہیں کہ اُسے جمالِ یوسفی پسند آسکے - خواب اور آنکھیں کُھل گئیں میں ایہام تضاد ہے -

۱۷ دشمن پر محبوب کی نگاہ لُطف تو درکنار نگاہ گرم بھی ہمارے لیے عذابِ جہنم کا حکم رکھتی تھی - یعنی خلافِ جذبۂ غیرت تھا کہ وہ دشمن کی طرف دیکھے - خواہ یہ نظر عتاب ہی کیوں نہ ہو - غرض دُنیا کا یہ رنگ دیکھکر ہمیں انجامِ عشق نظر آیا کہ ایسے شخص سے ہمارا نباہ ناممکن ہے - ۱۸ لیلیٰ سیاہ فام تھی - مجھے حیرت ہے کہ اُس پر قیس کیوں دیوانہ ہوا "مجھکو وحشت ہوگئی" کا پہلو اس شعر میں نہایت لطیف ہے -

چشمِ نرگس بد نظر ہے اور گُل بے اعتبار — ہو فا سیرِ گُلستاں کیا کرے گا دیکھکر

خاک میں کیونکر نہ لوٹوں بندھگیا سودے میں دھیان — اُس کے صحنِ خانہ کا پہنائے[۵] صحرا دیکھکر

تاش[۶] کا ہمدم کفن لانا کہ بس مَیں مرگیا — چلونوں سے جلوۂ خورشید سیما دیکھکر

یاد آیا[۷] سوئے دُشمن اُس کا جانا گرم گرم — پانی پانی ہوگیا مَیں موج دریا دیکھکر

اُس کے ہٹتے ہی اندھیرا آگیا ایسا کہ بس — گر پڑا میں روزنِ دیوار کو وا دیکھکر

کیا[۸] تماشا تھا جھپکنا آنکھ کا بے اختیار — آئینہ کو ہاتھ سے اُس نے نہ چھوڑا دیکھکر

مَیں[۹] نہ مانونگا کہ چشمِ آبلہ بے دید ہے — یہ نہ دیکھے روئے غیر اپنے کفِ پا دیکھکر

پھر[۱۰] گئی آنکھوں کے آگے اُسکی چشمِ نرگسیں — پھر گئیں آنکھیں مری نرگس کا جھکنا دیکھکر

دشمنی[۱۱] دیکھو کہ تا الفت نہ آجائے کہیں — لے لیا مُنہ پر دوپٹہ حال میرا دیکھکر

کیوں[۱۲] نہ گھبرائے وہ مَیں گھبرا گیا بلبے ہجوم — حسرتیں آتی ہیں کیا کیا اس کو تنہا دیکھکر

---

۵ پہنا = وسعت ۶ تاش کرکری کی قسم کا ایک دھاری دار کپڑا جس میں ایک تار گوٹے کا ہوتا ہے ریشم کا۔ خورشید سیما = معشوقِ خورشید جبین چونکہ میں چلمن سے معشوق مہر وش کا جلوہ دیکھ کر ہلاک ہوا ہوں۔ اسلیئے اس مناسبت سے کفن بھی تاش کا چاہیئے۔ یہ غزل مومن کی ابتدائی مشق کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے جبکہ انھوں نے رنگ ناسخ کا تتبع کرنا چاہا تھا۔ پھر ترک کرکے اپنا خاص رنگ اختیار کیا۔ پہلے غالب نے بھی اس کو اختیار کیا تھا پھر چھوڑ کر طرز میر پسند کی۔ ۷ موج دریا کی رفتار دیکھکر مجھے محبوب کا تیزی کے ساتھ رقیب کے یہاں جانا یاد آگیا اور مَیں غیرت سے پانی پانی ہوگیا۔ پانی پانی اور موج دریا میں ایہام تناسب ہے۔ ۸ محبوب نے دمِ تزئین آئینہ اُٹھایا مگر آئینہ میں اپنا جمال دیکھکر بے اختیار آنکھ جھپک گئی اور ایسی بیخودی چھائی کہ آئینہ ہاتھ کا ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ ۹ میں چشمِ آبلہ کو بے مروت نہیں کہہ سکتا۔ یہ میرے پاؤں دیکھکر غیر کا مُنہ دیکھنے والی نہیں۔ یہاں شاعر نے اپنی وحشتِ عشق کا بیان کیا ہے اور محاورے سے کام لیا ہے۔ آبلہ کو شکل کے اعتبار سے چشم سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ۱۰ پہلے مصرع میں پھرنا نقشہ پیش نظر ہوجانے کی معنی میں مستعمل ہوا ہے اور دوسرے میں بحالت نزع تیور بدل جانے کے معنی میں۔ ۱۱ مُنہ چھپانے کا باعث عموماً کسی دردناک منظر کی تاب نہ لانا ہوا کرتا ہے مگر معشوق نے اس خیال سے مُنہ چھپایا کہ کہیں مروت نہ آجائے۔ ۱۲ ہجوم سے مراد یہاں ہجومِ حسرت ہے قاعدہ ہے کہ انسان ہجوم میں گھبرا جاتا ہے۔

انتظارِ ماہوش میں تو نہ ہوں آنکھیں سفید
شب یہ وہم آیا ہے سوئے چرخ خضرا دیکھکر

کاٹ لینے دو گلا تم شوق سے گھر جائیو
لیک رقصِ نیم بسمل کا تماشا دیکھکر

ق

سب ستم ہائے نہاں نظروں میں تھے ناصح نہ پوچھ
کیا کہوں مَیں غش ہوا کیا سو چلکر کیا دیکھکر

جو نقاب اُٹھی مری آنکھوں پہ پردہ پڑ گیا
کچھ نہ سوجھا عالم اُس پردہ نشیں کا دیکھکر

کر لیا خاک آپ کو اُس بُت کے در پر ہائے ہائے
جل گیا جی لاش کو مومن کی جلتا دیکھکر

ردیف الراء الہندی

۸۰

مومن خدا کے واسطے ایسا مکاں نہ چھوڑ
دوزخ میں ڈال خلد کو کوئے بتاں نہ چھوڑ

عاشق تو جانتے ہیں وہ لے دل یہی سہی
ہر چند بے اثر ہے پر آہ و فغاں نہ چھوڑ

اِس طبع نازنیں کو کہاں تاب انفعال
جاسوس میرے واسطے اے بدگماں نہ چھوڑ

ناچار دینگے اور کسی خوبرو کو دل
اچھا تو اپنی خوئے بدلے بدزباں نہ چھوڑ

زخمی کیا حسد کو تو مرنا محال ہے
قربان جاؤں تیرے مجھے نیمجاں نہ چھوڑ

آسمان کو دیکھکر مجھے رات یہ وہم آیا کہ کہیں اسکی آنکھیں بھی اُسی ماہوش کے انتظار میں سفید نہ ہو گئی ہوں۔ ستاروں کو استعارۃً آسمان کی آنکھیں کہا گیا۔ چرخ خضرا = نیلا آسمان۔

اے بدگمان تو میرے واسطے جاسوس مقرر کرتا ہے تاکہ میرے جرائم کی تفتیش کریں۔ لیکن چونکہ مَیں بے قصور ہوں نتیجہ یہ ہوگا کہ جاسوس تیری توقع کے خلاف آکر اطلاع دینگے اور تیری طبع نازک کو منفعل ہونا پڑے گا۔

تم نے جو رقیب کو زخمی کیا ہے تو اس رشک سے میں بھی بسمل ہو گیا ہوں مگر محض اتنی بات سے میرا مرنا محال ہے۔ اگر تم (صدمہ رشک سے) مجھے بالکل ہلاک کرنا چاہتے ہو تو میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ مجھے نیمجاں نہ چھوڑو اور اس کی صرف ایک صورت ہے۔ یعنی رقیب کو بالکل قتل کر دو۔ میں خود غیرت سے مر جاؤں گا۔ یہ مکر شاعرانہ مومن سے مخصوص ہے۔

کچھ کچھ درست ضد سے تری ہو چلے ہیں وہ
یک چند اور کجروی اے آسماں نہ چھوڑ

جس کوچہ میں گذار صبا کا نہ ہو سکے
اے عندلیب اسکے لیے گلستاں نہ چھوڑ

گر پھر بھی اشک[۱] آئیں تو جانوں کہ عشق ہے
حُقّہ کا مُنہ سے غیر کی جانب دھواں نہ چھوڑ

ہوتا[۲] ہے اس جحیم میں حاصل وصال حور
مومن عجب بہشت ہے دیرِ مغاں نہ چھوڑ

ردیف الزاء

۸۱

ہے چشم بند پھر بھی ہیں آنسو رواں ہنوز
جی سرد ہو گیا ہے و لے دل طپاں ہنوز

یہ دن[۳] دکھائے ہیں شبِ فرقت[۴] نے ہم کو اور
وہ رشکِ آفتاب نہیں مہرباں ہنوز

مر بھی گئے جُدائی میں پردہ نشیں کے پر
آیا نہیں زبان پہ دردِ نہاں ہنوز

ہم تیرہ بخت خاک میں بھی مل گئے و لے
کچھ کم نہیں غبارِ دلِ آسماں ہنوز

یاں[۵] امتحانِ مرگ سے فارغ ہوئے ہیں یار
واں اپنے ہی پہ مرنے کا ہے امتحاں ہنوز

تشبیہ[۶] دی تھی مَیں نے کہیں انگبین سے
تبخالہ خیز ہے لبِ شیریں دہاں ہنوز

باغِ جہاں میں گو مہِ[۷] خورداد آگیا
یاں ہے اُسی بہار پہ فصلِ خزاں ہنوز

[۱] رقیب کے اشکوں کا باعث عشق نہیں بلکہ حُقّہ کا دھواں ہے۔ [۲] مومن اس نام نہاد دوزخ (دَیر) میں حوروں (حسینوں) کا وصال نصیب ہوتا ہے اس لحاظ سے یہ (دَیر) بھی عجب بہشت ہے اس کو چھوڑنا نہ چاہیے جحیم = دوزخ۔ آتش پرستوں کے معبد (دَیرِ مغاں) کو جحیم کہنے میں یہ نکتہ ہے کہ وہاں ہر وقت آگ روشن رہتی ہے [۳] دِن۔ شب۔ آفتاب۔ مہر (ماہ) میں رعایت شاعرانہ ہے۔ [۵] یہاں میرے احباب میرے امتحانِ مرگ سے فارغ ہو گئے یعنی یہ تحقیق کر چکے کہ عاشق مرضِ عشق سے واقعی مر گیا۔ وہاں معشوق کو ابھی یہی آزمائش منظور ہے کہ یہ مجھ پہ مرتا بھی ہے یا نہیں دوسرے مصرع میں مرنا عاشق ہونے کے معنی میں ہے۔ [۶] میں نے لبِ معشوق کو کہیں شہد سے تشبیہ دی تھی۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ لبِ معشوق پر برابر ابتک حرارتِ غضب سے چھالے نمودار ہو رہے ہیں۔ کیونکہ شہد سے تشبیہ اُسکی توہین ہے۔ انگبین = شہد۔ تبخالہ = چھالا۔ [۷] مہ خورداد شمسی مہینہ کا نام جو زمانہ بہار ہے۔

روزِ جزا نہ قتل کا انکار کر کہ ہے
دامن پہ تیرے میرے لہو کا نشاں ہنوز

یاں اپنا اُن کی چاہ میں مرنا یقیں ہوا
واں اور ہی کے چاہنے کا ہے گماں ہنوز

مومن تو مدتوں سے ہوئے پر بقول دردؔ
دل سے نہیں گیا ہے خیالِ بُتاں ہنوز

۸۲

ہجراں[1] کا شکوہ لب تلک آیا نہیں ہنوز
لُطفِ وصال غیر نے پایا نہیں ہنوز

اے جذبِ دل وہ شوخِ ستمگر تو یکطرف
پیغام لے کے بھی کوئی آیا نہیں ہنوز

جا چک[2] خدا کے واسطے اے موسمِ بہار
خاکِ عدو پہ پھول وہ لایا نہیں ہنوز

یہ[3] اہتمام جور ہے کیا تو نے اے فلک
انداز غفلت اُس سے اُڑایا نہیں ہنوز

یکچند[4] اور کاہشِ غم چشم التفات
مَیں یار کی نظر میں سمایا نہیں ہنوز

واعظ ہمارے سامنے کرتا ہے وصفِ حُور
سمجھا ہے اُس نے جلوہ دکھایا نہیں ہنوز

ہو[5] خوں گرفتہ یار و شفاعت سے فائدہ
صیدِ اجل کسی نے چھوڑایا نہیں ہنوز

[1] غیر کو لُطف وصال جبھی میسّر ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے غم ہجر سے دوچار ہو لے۔ کیونکہ الاشیاء تُعرف باضدادہا یہ مومن کا مکرِ شاعرانہ ہے۔ [2] اگر موسم بہار زیادہ دیر تک ٹھیرا رہا تو ڈر ہے کہ محبوب جو ہنوز قبرِ عدو پر پھول نہیں لایا اب لے آئے۔ [3] معشوق کا انداز تغافل ہی جور و ستم کا قائم مقام ہے بلکہ یک گونہ جور سے بڑھکر۔ اگر فلک بھی اُس سے یہ انداز سیکھ لیتا تو عشاق پر ظلم کرنے کے لیے اُس کو اس قدر اہتمام کیوں کرنا پڑتا۔ مکرِ شاعرانہ ہے۔ [4] اے کاہش غم ذرا مجھپر اور نظرِ عنایت کر کہ زیادہ کاہیدہ ولاغر ہو جاؤں تاکہ معشوق کی نگاہ توجہ میں میری گنجائش پیدا ہو سکے۔ اس کا ظاہری پہلو تو یہ ہے کہ کوئی چیز جب تک کاہیدہ نہ ہو آنکھ میں سما نہیں سکتی۔ معنوی پہلو یہ ہے کہ عاشق جب تک غم الفت سے لاغر نہ ہو مورد التفات نہیں ہوتا۔ [5] خوں گرفتہ = اجل گرفتہ۔ جس کی قضا آگئی ہو۔

کیونکر مجھے گناہ زلیخا[۶] یقین آئے
دامن کو تیرے ہاتھ لگایا نہیں ہنوز

کیا سوزِ رشک[۷] کی دلِ اغیار کو خبر
دوزخ نے کافروں کو جلایا نہیں ہنوز

ایسے[۸] ستم کئے کہ مرا جی بٹھا دیا
ہر چند سر فلک نے اُٹھایا نہیں ہنوز

ناصح[۹] رقیب سے ہے بدآموز تر کہیں
پر مَیں نے تیرا حال سُنایا نہیں ہنوز

اب کی وفورِ عشق صنم میں ہے گفتگو[۱۰]
مومن وہ لب پہ ہائے خدایا نہیں ہنوز

۸۳

لب پہ دم آیا و لے نالہ نہیں ہے ہنوز
نغمۂ[۱] غم بھی ترا پردہ نشیں ہے ہنوز

ہائے پس مرگ بھی دفن کریں مجھکو غیر
خاک میں ملجائے چرخ بر سر کیں ہے ہنوز

لیکے دل و عقل و دیں پھر پڑے غارت پے عشق
اے[۲] اجل آ جا کہیں جانِ حزیں ہے ہنوز

روزِ جزا[۳] کیوں کیا خوں کا مرے اتہام
مہر عدو بدگماں تجھکو یقیں ہے ہنوز

۶ زلیخا کا گناہ یہ تھا کہ حضرت یوسفؑ کا دامن پکڑ کر کھینچا تھا اور اپنی طرف راغب کرنا چاہا تھا شاعر کہتا ہے کہ مجھے گناہ زلیخا کا یقین نہیں آتا۔ کیونکہ مجھے تو آجتک تیرا دامن چھونے کی جسارت نہیں ہوئی ۷ سوزِ رشک کو دوزخ اور اغیار کو کافر ٹھہرایا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ عذاب دوزخ کفار کو ابھی نہیں ہوگا۔ آخرت میں ہوگا۔ ۸ سر اُٹھانا یہاں محاورہ نہیں بلکہ حقیقی معنی میں مستعمل ہے۔ یعنی ہنوز فلک سرنگوں ہے۔ اُس پر یہ حال ہے۔ اگر سر اُٹھاتا تو نجانے کیا کرتا۔ بٹھانا اور اُٹھانا میں ایہام تضاد ہے۔ ۹ ناصح رقیب سے کہیں زیادہ بدآموز ہے۔ خیر گذری کہ میں نے اُس کو تیرا حال نہیں سُنایا ورنہ شاید وہ بھی میرا رقیب بن بیٹھتا۔ ناصح کو حال یار سُنانے کی وجہ یہ ہوسکتی تھی کہ وہ پند و نصیحت سے باز آجاتے مگر اسی خوف سے مَیں حال کہنے سے محترز رہا۔ بدآموز = بُری صلاح دینے والا۔ ۱۰ گفتگو = شبہہ۔ کلام۔

۱ نغمۂ غم سے مراد نالہ ہے۔ نغمہ اور پردہ میں ایہام تناسب ہے۔ ۲ اے اجل میری جان مغموم باقی ہے۔ اسکو آکر لیلے ورنہ یہ بھی عشق کے ہاتھوں تاراج ہوجائے گی۔ ۳ قیامت میں مَیں نے تجھپر اپنے قتل کا دعویٰ کیا اور تونے اس خیال سے رقیب پر ٹال دیا کہ یہ میری محبت میں اس غلط الزام کو اپنے سر اوڑھ لے گا۔ افسوس تجھے اب تک رقیب کے عشق کا یقین ہے جو اُس سے اتنی بڑی توقع رکھتا ہے۔

مردہ[3] و حیراں میں کیا شبہ پڑا دیکھنا ... محو خود آرا ترا آئینہ میں ہے ہنوز
چاک سراپردہ سے جھانکے تھے وہ ایک دن ... سجدۂ محراب در شغل جبیں ہے ہنوز
کیوں[4] نہیں لاتا اُسے آہ مری یاد ہے ... کہد و فلک سے دمِ بازپسیں ہے ہنوز
دود[5] دل و گرد غم کیوں یہ اُمیدِ اثر ... وہ ہی فلک ہے ہنوز وہ ہی زمیں ہے ہنوز
جھوٹ نہیں تیرے پاس بیٹھتے ہیں بدتمیز ... چین بجبیں کیوں نہ ہوں فرش میں چیں ہے ہنوز

وصل بتاں کی دعا کرتے ہو شکرِ خدا
حضرتِ مومن تمھیں دعوئ[6] دیں ہے ہنوز

ردیف السین

۱۴
یوں ہے شعاعِ داغ مرے دل کے آس پاس ... ہالہ ہو جس طرح مہ کامل کے آس پاس
ڈوبا[7] جو کوئی آہ کنارے پہ آگیا ... طغیان بحر عشق ہے ساحل کے آس پاس

[3] اے خود آرا تیرا محو دیدار اب تک آئینہ دیکھ رہا ہے - یعنی لوگ اس خیال سے اُسے آئینہ دکھا رہے ہیں کہ معلوم ہو جائے کہ یہ واقعی مرگیا یا محو حیرت جمال ہے - قاعدہ کہ سکتہ کی حالت میں آئینہ مُنہ کے سامنے رکھتے ہیں کہ تنفس باقی ہے یا نہیں - اس میں نکتہ یہ ہے کہ تیری خود آرائی نے عاشق پر بھی یہ اثر کیا کہ وہ آئینہ بن گیا - [4] آسمان معشوق کو میرے گھر کیوں نہیں لاتا - کیا اُس کو میری آہ یاد نہیں؟ ابھی تو آخری سانس باقی ہے - اگر میں نے آہ کی تو آسمان کو جلا کر خاک کر دونگا - [5] اے آہ دل و غبار غم تاثیر کی اُمید نہ رکھو - جو آسمان و زمین پہلے تھے اب بھی ہیں - پھر کیا نئی بات پیدا ہو گئی جو اثر کی توقع کیجائے - دود کی مناسبت آسمان سے اور گرد کی زمین سے ظاہر ہے - [6] یعنی شکر ہے کہ تم ابھی خدا سے دعا کے قائل ہو - اتنی دینداری تو باقی ہے - اس میں کچھ طنز کا پہلو ہے - [7] جو دریائے عشق عبور کر کے کنارے پر آگیا سمجھ لو کہ وہی ڈوب گیا - یعنی اس دریا میں کنارے کی تمنا کرنا ہی عین ہلاکت ہے - اسلیے کہ (اور دریاؤں کے برخلاف) یہاں طوفان کا تمام زور ساحل کے قریب ہے اور وسط بحر خطرہ سے محفوظ ہوتا ہے - "جو موج ڈبودے ساحل ہے یوں نام کا ساحل کوئی نہیں" مومن کے شعر میں ڈوبا مجازی معنی میں مستعمل ہوا ہے -

یہ غیرتِ[۱] وفا کا اثر ہے کہ بوالہوس
بسمل تڑپتے ہیں ترے بسمل کے آس پاس

کیا دعویٰ[۲] آہ جب نہ رہائیں ہی کس لیے
ہیں جمع اقربا مرے قاتل کے آس پاس

اے[۳] قیس تیرے نالے کی غیرت کو کیا ہوا
لیلیٰ نے زنگ باندھے ہیں محمل کے آس پاس

مرجائیں[۴] تا خوشی سے عدو سُن وصال کی
یار و دعا کرو گلے مل مل کے آس پاس

کیا[۵] کیا جلی ہے بزم میں تجھ سے نہ جب پھرے
پروانے شمع شعلہ شمائل کے آس پاس

ہے تو ہی بیوفا نہیں باور تو دیکھ لے
گُل جامہ دَر ہیں گورِ عنادل کے آس پاس

کافر[۶] ہے کون ہم میں سے مومن پھرے ہے تو
کعبے کے آس پاس تو ہیں دل کے آس پاس

۸۵

کھا گیا جی غمِ نہاں افسوس
گھُل گئی غم کے مارے جاں افسوس

میرے مرنے سے بھی وہ خوش نہ ہوا
جی گیا یوں ہی رائگاں افسوس

شکوہ آزارِ غیر کا جو کروں
ہنس[۷] کے کہتا ہے وہ کہ ہاں افسوس

مرتے[۸] ہم غیر چھوٹتے نہ کیا
تو نے الفت کا امتحاں افسوس

---

[۱] میری وفا دیکھ کر رقیبوں کو بھی غیرت آئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادھر میں بسمل پڑا ہوں اُدھر وہ بسمل ہو کر میرے پاس پڑے تڑپتے ہیں یعنی میں تیغ عشق کا بسمل ہوں اور رقیب میری غیرت وفا کے۔ [۲] عاشق اقربا کا قاتل کے پاس جمع ہونا بھی اپنے جذبہ غیرت کے منافی سمجھتا ہے

[۳] اگر تیرا نالہ کسی قابل ہوتا تو وہی زنگ کا کام دیتا۔ لیلیٰ کو محمل میں زنگ باندھنے کی کیوں ضرورت پڑتی۔ زنگ = گھنٹہ۔ جرس۔ [۴] وصال یہاں بمعنی موت استعمال کیا ہے یعنی میرے مرنے کی دعائیں کرو تاکہ عدو سُنکر اور میری مصیبت سے آگاہ ہو کر خوشی سے مرجائیں۔ وصال کی دوسرے مصرع سے متعلق ہے۔

[۵] شعلہ شمائل = شعلہ کی صورت رکھنے والی۔ یعنی جب تیری موجودگی میں پروانے شمع کے پاس نہ پھٹکے تو وہ تجھ سے کس قدر جلی ہے۔ [۶] مراد یہ ہے کہ کافر تو ہے۔ اسلیے کہ کعبہ ایک زمانہ میں بتخانہ بھی رہ چکا ہے اور دل تو عرش اللہ ہے۔ [۷] یعنی طنزاً کہتا ہے۔ [۸] اگر تو امتحان الفت لیتا تو ہم جان دیتے اور غیر جی چھوڑ کر کنارہ کش ہو جاتے۔ نہ کیا کا تعلق مصرع دوم سے ہے۔

۸۵

گلِ[۳] داغِ جنوں کھلے بھی نہ تھے — آ گئی باغ میں خزاں افسوس

کشتۂ روزِ ہجر کا اُس کے — مرگ کرتی ہے ہر زماں افسوس

بیوفائی[۴] ہوئی وفا کا سبب — غیر سے ہے وہ بد گماں افسوس

مرگ پر اپنے ناتواں کی ترے — دل سے آیا نہ تا زباں افسوس

موت بھی ہو گئی ہے پردہ نشیں — راز[۵] رہتا نہیں نہاں افسوس

تھا عجب کوئی آدمی **مومن** — مر گیا کیا ہی نوجواں افسوس

ردیف الشین

۸۶

گل[۱] دیکھ کے وہ عذار آتش — کیا کیا ہی جلی ہے یار آتش

پھونکا[۲] تپ غم نے جی کو نکلے — دل کے ترے اب بخار آتش

ہووے نہ مقابل تفِ دل — بھڑکائے کوئی ہزار آتش

ہاں سیر دکھا۔ لگا کہیں تو — اے نالۂ شعلہ بار آتش

اُف ری تپ گرمیِ محبّت — اِس نام پہ جاں نثار آتش

[۳] ابھی جوشِ جنوں کے حوصلے بھی نہ نکلے تھے کہ موسم بہار ختم ہو گیا۔ [۴] افسوس رقیب کی بیوفائی معشوق کی بدگمانی کا باعث ہوئی یعنی اُسے یہ خیال ہوا کہ جب اس (رقیب) کا ابھی یہ حال ہے تو ظلم پر دعوی الفت سے بالکل دستبردار ہو کر بیٹھ جائے گا۔ چنانچہ اس خوف سے وہ رقیب سے وفا کرنے لگا۔ [۵] یعنی کاش موت آ جاتی تو رازِ عشق فاش نہ ہوتا۔

[۱] گل تیرے رخسار کو آگ (یعنی سُرخ) دیکھ کر آگ رشک سے کس قدر جلی ہے۔ [۲] نکلے کا تعلق مصرع ثانی سے ہے۔

دل کو مرے پوج گبر[۵۳] جس کو
سجدے کرے بار بار آتش

تو نے تو وہاں لگائی مہندی
یاں دل میں لگی نگار آتش

مت آئیو میری خاک پر تو
برسے ہے سر مزار آتش

میں آہ زبانہ کش[۵۴] جو کھینچوں
باندھے ہے ابھی حصار آتش

دیکھے[۵۵] ہے تو اور لگی ہے دل میں
اے دیدۂ اشکبار آتش

پڑھتا ہے کہیں غزل جو مومن
لگ اُٹھتی ہے ایک بار آتش

۸۷

کہاں نیند تجھ بن مگر آئے غش
تو یک صورتِ خواب دکھلائے غش

تمہاری[۱] کدورت سے ہوش آگیا
کیا بوئے گل نے مداوائے غش

نہ ٹھہرے[۲] بس آئینہ کو دیکھکر
وہ اتنا کہ دیکھیں تماشائے غش

قیامت[۳] جنوں میں ہوں نازک دماغ
نہ کیوں نکہتِ گل سے آجائے غش

ترے[۴] بال لاکر سونگھائے کہیں
کہ غش ہو گئے چارہ فرمائے غش

[۵۳] گبر یعنی آتش پرست۔ [۵۴] زبانہ کش= شعلہ زن۔ قاعدہ ہے کہ آسیب سے محفوظ رہنے کے لیے چاروں طرف حصار باندھ لیتے ہیں۔ [۵۵] یعنی تیرا فرض تھا کہ اس آگ کو بجھاتا۔

[۱] تمہاری کدورت کی وجہ سے مجھے ہوش آگیا یعنی انجام محبت سوجھ گیا۔ کدورت کی مناسبت سے بوئے گل اور ہوش کی رعایت سے مداوا اسلئے غش استعمال کیا ہے۔ قاعدہ ہے کہ حالت غش میں مٹی سنگھاتے ہیں۔ [۲] دم زینت آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر وہ اتنا بھی نہ سنبھل سکے کہ اپنے محو زینت (عاشق) کے غش ہونے کا تماشا دیکھتے۔ [۳] قیامت نازک دماغ ہوں یعنی بلا کا نازک دماغ ہوں۔

[۴] شاید میرے غش کا علاج کرنے والوں نے علاج کی خاطر مجھے تیرے بال لاکر سنگھائے جو خود اُنکی خوشبو سے بیہوش ہو گئے۔ "غش ہو گئے" میں ایک بعید پہلو (عاشق ہو گئے) کا بھی نکلتا ہے۔

نہ ہو جب کہ میرا خیالِ وفات خبر لو مری تم کہاں تک رہے	تو کیا اُس ستمگر کو پروائے غش یہ حالت کہ غش پر چلا آئے غش

خُدائی کا جلوہ ہے مومن کہ تو
گر اُس بُت کو دیکھے تو ہو جائے غش

ردیف الصاد

۸۸

روز ہوتا ہے بیاں غیر کا اپنا اخلاص	چشم بد[1] دور تمھیں ہم سے بھی ہے کیا اخلاص
غیر کرتا ہے بیاں مجھسے تو مَیں کہتا ہوں	بارے اب تک تو نہیں تجھ سے مرا سا اخلاص
غیر[2] سے لُطف کی باتیں ہیں مرے چھیڑنے کو	دشمنی کہتے ہیں جس کو وہ تمھارا اخلاص
ہم یہاں[3] سورۂ اخلاص کا پڑھتے ہیں عمل	اور بڑھتا ہے وہاں غیر سے اُس کا اخلاص
مجھ سے مل ورنہ رقیبوں سے مَیں سب کہدونگا	دشمنی ابکی تری اور وہ پہلا اخلاص
جنبشِ لب کی ترے پوچھنے کو کیفیت	ترے بیمار سے کرتا ہے مسیحا اخلاص

ل۱ اس میں طنز کا پہلو ہے۔

ل۲ تم غیر سے اوپری دل سے لُطف کی باتیں کرتے ہو جن کا مقصد محض مجھے چھیڑنا ہے۔ مگر میرے نزدیک تمھارے اس اخلاص و بے تکلفی (چھیڑ) میں بھی دشمنی کا شائبہ شامل ہے۔ کیونکہ مجھے غیر کے ساتھ تمھارا اتنا ربط بھی گوارا نہیں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ تمھارا غیر پر کرم اُس کے حق میں اخلاص ہے مگر میرے حق میں دشمنی۔ الفاظ سے بظاہر یہی معنی متبادر ہوتے ہیں۔

ل۳ یعنی مراد تو بر آتی ہے مگر ہماری نہیں۔ غیر کی۔ کس غضب کی شوخی ہے۔

اُس ستمگر نے بناوٹ کی لگاوٹ بھی نکی		ہائے قسمت مرے کچھ کام نہ آیا اخلاص
پس قتل آمری خاطر سے ٹھہر جاتا دفن	ابّ	ظالم آخر تجھے مجھ سے بھی کبھی تھا اخلاص
چاہتا ہے کہ دل اُس تنگ قبا سے پھٹ جائے		میرے ناصح کا ہے دُنیا سے نرالا اخلاص
اب اُنھیں لکھتے ہیں ہم خط میں سراسر دشمن		جن کو لکھتے تھے سدا یار سراپا اخلاص
موت بھی آ نہ پھری پاس ہمارے شب ہجر	ابتک	سچ تو یہ ہے کہ بُرے وقت میں کیسا اخلاص

مومن اس بدریائی سے بھی کیا بدتر ہے
اُس بُتِ دشمنِ ایماں سے ہمارا اخلاص

ردیف الضاد

بے صبر کو کہاں تپ داغِ جگر سے فیض	۸۹	گلچیں کو کب ہوا شجرِ بارور سے فیض
زاہد نگاہ بھر کے وہ بے دید دیکھ لے		اتنا ہوا نہ خدمتِ اہلِ نظر سے فیض
یادِ خطِ نگار میں ہم زہر کھا موئے		کیا آب زندگی کا ہوا ہے خضر سے فیض
بالطبع گر کرم ہو تو مفلس بھی ہے کریم		ہوتا ہے سایہ کا شجرِ بے ثمر سے فیض

کے میرے ساتھ دکھاوے کا اختلاط بھی نہ برتا۔

لے زاہد تو مجھے اہل نظر (اہل دل) کی خدمت کی ترغیب عبث دیتا ہے۔ اُن کی خدمت سے مجھے اتنا فیض بھی تو حاصل نہ ہوا کہ وہ بے مروت (معشوق) مجھے نگاہ بھر کے دیکھ لیتا۔

سے نگار (معشوق) کے خط سبز کو خضر اور زہر کھا کر مرنے کو طنزاً آب زندگی (آب حیات) کہا ہے حضرت خضر اور آب حیات کی روایت مشہور ہے۔ حضرت خضر جنکا اصلی نام ارمیا ہے اس وجہ سے خضر (سبز) کہلاتے ہیں کہ جس زمین پر وہ بیٹھتے تھے وہ سبز ہو جاتی تھی۔

ہے چرخ سے اُمید کشائش عبث نہیں
کس کو ہوا ہے خانۂ وابستہ در سے فیض

ملنے کو خاک ہی میں بخیلوں کا مال ہے
دیکھو تو ہے کسی کو بھی غنچے کے زر سے فیض ۳ه

شب بھر کیا ہے مُبدءِ فیاض کا گلہ ۴ه
تو بھی عیاں ہوا نہ دعائے سحر سے فیض

ترسا صنم پہ مر گئے ہم آہ جب نہیں ۵ه
جاری مسیح کے لبِ اعجاز اثر سے فیض

تصویر سے تری مجھے تسکین دل کہاں
کیا خاک تشنہ کام کو آبِ گہر سے فیض

کیونکر نہ غم ہو خلق کو مومن کی مرگ کا
تھا سب کو اُس کی ذات سراپا ہنر سے فیض

۹۰ پورے

ہاں مان کہا بیچ بوئے زلف دوتا قرض
جان اب تو نہیں حشر کے دن دینگے صبا قرض

سمجھیں گے قیامت میں ستم پیشہ دمِ قتل ۶ه
دیکھا نہ ادھر تو نے رہا خون بہا قرض

کیونکر دے فلک دامِ عدو کو درمِ داغ ۷ه
مفلس کو جہاں میں کوئی دیتا ہے بھلا قرض

گر کہیے کہ کیوں لیتے ہو تم دل کو تو وہ شوخ
کس ناز سے کہتا ہے کہ یوں دیتے ہو یا قرض ۸ه

کچھ دینے کا بھی دیکھ لے اے آہ ٹھکانا
کس برتے پہ لیتی ہے تو تاثیرِ دعا قرض

۳ه زر یا زرِ گل پھول کی زیرہ کو کہتے ہیں۔ غنچہ کی مٹھی بند رہتی ہے۔ اس لئے اُس کو بخیل قرار دیا۔ قاعدہ ہے کہ جب پھول کھلتا ہے تو زیرہ زمین پر گر پڑتا ہے۔ ۴ه میں نے رات بھر اللہ تعالیٰ کا گلہ کیا کہ شاید اسی طرح وہ میرے انجاح مقاصد پر مائل ہو جائے لیکن پھر بھی دعا سے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ مُبدءِ فیاض۔ تمام اشیاء کا آغاز کرنے والا جو بڑا فیض رساں ہے۔ یعنی حق تعالیٰ۔ اس شعر میں حد سے زیادہ شوخی ہے۔ ۵ه ہماری برگشتہ طالعی دیکھو کہ ہم بُت ترسا پر ایسے زمانہ میں مرے جبکہ حضرت مسیحؑ کے لبِ معجز نما کا فیض (مردہ کو زندہ کرنا) بھی جاری نہیں۔ ترسا یعنی نصرانی۔ ۶ه ظالم ہم تجھے قیامت میں سمجھیں گے کیونکہ تو نے وقتِ قتل ہماری طرف نہ دیکھا اور تجھ پر ہمارا خون بہا قرض رہا۔ معشوق کے دیکھنے ہی کو شاعر نے خون بہا قرار دیا ہے۔ دمِ قتل مصرع دوم سے متعلق ہے۔ ۷ه دام = قرض۔ رقیب دولت وفا نہیں رکھتا۔ اس لئے مفلس کہا۔ ۸ه یعنی تم دل مفت دے رہے ہو یا قرض کیوں لیتے ہو = آیا لیتے ہو (یا نہیں)

افلاس سے کھایا کیئے غم سبز خطوں کا
افسوس کہیں زہر بھی ہم کو نہ ملا قرض

گن گن کے دیئے داغ فلک نے مجھے گویا
آتا تھا یہ اس پر زر نایاب مرا قرض

آمد سے فزوں خرچ ہے اے شور محبت
بخیوں کا مرے زخم سے کیونکر ہوا دا قرض

ہم قرض پہ نقد دل اُسے دیتے ہیں مومن
جس نے نہ کبھی آج تلک لیکے دیا قرض

ردیف الطاء

۹۱

ہر غنچہ لب سے عشق کا اظہار ہے غلط
اس بحث صحیح کی تکرار ہے غلط

کہنا پڑا درست کہ اتنا رہے لحاظ
ہر چند وصل غیر کا انکار ہے غلط

کرتے ہیں مجھ سے دعوئ الفت وہ کیا کریں
کیونکر کہیں مقولہ اغیار ہے غلط

یہ گرم جوشیاں تری گو دل سے ہوں ولے
تاثیر نالہ ہائے شرربار ہے غلط

سبز خطوں اور زہر (جس کے کھانے سے رنگ سبز ہو جاتا ہے) کی مناسبت ظاہر ہے۔ "افلاس کی وجہ سے غم کھانے" میں بھی لطافت ہے۔ اور ایسا کوئی کیا بے سروسامان ہوگا۔ کہ مجھے زہر بھی دیجئے گا تو احسان ہوگا (مومن) اے شور محبت میرا زخم بخیوں کے احسان کا قرض کس طرح ادا کرسکتا ہے۔ کیونکہ میرے یہاں آمدنی سے زیادہ خرچ ہے۔ یعنی ایک زخم لگتا ہے تو دس زخم ہائے سوزن لگتے ہیں۔

ہر حسین سے اظہار عشق بے معنی ہے۔ یہ بحث (عشق) تو صحیح ہے مگر اسکی تکرار (اعادہ) غلط ہے۔ ہر چند معشوق کا انکار وصل غیر صحیح نہیں۔ تاہم مجھے "درست" کہنا پڑا کہ کم از کم اُسے اتنا لحاظ تو رہے اور بے باک نہ ہوجائے۔ اُن کو اغیار کا اسقدر پاس ہے کہ ان کی بات کو جھٹلا نہیں سکتے۔ حتیٰ کہ جب اغیار یہ افواہ اُڑاتے ہیں کہ معشوق کو مومن سے الفت ہے تو بھی وہ تردید نہیں کرتے بلکہ اُن کی بات رکھنے کی خاطر مجھ سے دعوئ الفت کرتے ہیں۔ تیرا اختلاط و احتیاط اگر بناوٹ سے نہیں تو بھی اس کو میرے نالوں کا اثر نہیں کہا جا سکتا کیونکہ میرے نالوں کے ایسے نصیب کہاں؟

کرتے ہو مجھ سے راز کی باتیں تم اس طرح	گویا کہ قول محرم اسرار ہے غلط
اٹھ جا کہاں تلک کوئی باتیں اٹھائیگا	ناصح تو خود غلط تری گفتار ہے غلط
تھا ربط غیر میں مرے مرنے کا انتظار	اے شوخ بیوفا تو وفادار ہے غلط
کیا جذب انتظار کی تاثیر بے وفا	منکر نہ ہو تو پہلے ہی اقرار ہے غلط
ہے حرف کامیابی دشمن میں ہمنشیں	مت کہہ درست وہم غلط کار ہے غلط

سچ تو یہ ہے کہ اس بت کافر کے دور میں
لاف و گزاف مومن دیندار ہے غلط

ردیف الظاء

	۹۲ لغو	
ہاں تو کیونکر نہ کرے ترک بتاں اے واعظ		ایسی حوریں تری قسمت میں کہاں اے واعظ
منتظر ہی کسی بت کا تو نہیں تو کیوں ہے		مجلس وعظ میں ہر سو نگراں اے واعظ

تم مجھ سے بظاہر اسقدر رازداری کی باتیں کرتے ہو کہ میں یہ باور کرلوں کہ تم کو مجھ سے درحقیقت خلوص ہے اور تمھارے رازدار نے مجھے جو خبر دی ہے (کہ معشوق رقیب سے اتحاد رکھتا ہے) وہ درست نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ معشوق مومن کے ساتھ وفادار ہے اسلئے کہ جب تک مومن نہ مرگیا اُس نے رقیب کے ساتھ ربط ضبط نہ رکھا۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ قول غلط ہے اسلئے کہ وفاداری کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ رقیب سے کبھی بھی نہ ملتا۔ گویا وہ اسکے لئے مومن کی موت کا منتظر تھا۔ اس میں یہ پہلو بھی نکلتا ہے کہ وہ رقیب سے بھی وفادار نہیں کیونکہ اس (رقیب) سے ملنے کے لئے مومن کی موت کا انتظار روا رکھا۔

معشوق نے عاشق کے جذب انتظار کی تاثیر کا انکار کیا اور کہا کہ اگر تمھارا جذب انتظار صادق ہوتا تو مجھے ضرور کھینچ بلاتا۔ عاشق جواب دیتا ہے کہ تم میرے جذب کی تاثیر کا انکار نہ کرو۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تم نے آنے کا جو اقرار کیا تھا وہی پہلے سے غلط تھا۔ پھر اُس غلط وعدہ کی بنیاد پر میں نے جو انتظار کا ہوائی قلعہ بنا کھڑا کیا وہ بھی اگر بنا ر الفاسد علی الفاسد کی طرح کمزور ثابت ہوا تو میری کیا خطا۔ تمھارا ہی قصور ہے۔ میں نے کامیابی رقیب کے متعلق جو تخیل قائم کیا تھا وہ میرے وہم غلط کار کی تخلیق تھی۔ مگر اصلاً مجھے اسکی کامیابی میں شبہ ہے۔ ہمنشین۔ خدا کے لئے اس (واہمہ) کو سچ نہ جان حرف بمعنی شبہہ۔

اب[1] ذرا جان دہی کوئے بتاں کی باتیں
سچ ہے کافر تری تقریر سے کیونکر نہ جلیں

ہو چکا تذکرۂ باغ جناں اے واعظ
شعلۂ آتشِ دوزخ ہے زباں اے واعظ

حور کی مدح میں کیا ترک صنم کا مذکور
یہی باتیں ہیں مرے دل پہ گراں اے واعظ

ڈر[2] مری آہ سے ظالم نہ جلا جی کہ نہیں
یہ جہنم سے تو کم شعلہ فشاں اے واعظ

اہلِ جنت سے کرو دلبری حور کا ذکر
ایسی باتیں کوئی سنتا نہیں یاں اے واعظ

جو[3] ملیں تجھ سے بصد شوق وہ کیا ہونگی نہ کر
بس مرے سامنے حوروں کا بیاں اے واعظ

کیسے[4] آرام بسِ مرگ، مگر کافر تو
اہلِ اسلام کا ہے دشمنِ جاں اے واعظ

شرم[5] کی بات نہیں ہے یہ اثر ہو کیونکر
نہ میں مومن ہوں نہ تو پیرِ مغاں اے واعظ

ردیف العین

۹۳

کس[1] ضبط پر شرار فشاں ہے فغانِ شمع
اک برق تھی جو لال نہ ہوتی زبانِ شمع

دل[2] گرمیِ فریب پہ بھی میں نثار ہوں
پروانہ کیا مجال کرے امتحانِ شمع

[1] کوئے بتاں میں جاں دہی (جاں بخشی) کی جو خاصیت ہے اسکا بھی ذرا ذکر چھیڑ [2] تو جہنم سے ڈرا کر مجھے ترک عشق کی نصیحت کرتا اور میرا جی جلاتا ہے۔ مگر میری آہ سے نہیں ڈرتا۔ یاد رکھ یہ بھی جہنم سے کم نہیں کہیں اس پر تجھے جلا کر خاک نہ کر دے۔ [3] جو حوریں تجھ جیسے شخص سے بصد شوق ملیں گی وہ کس حیثیت کی ہونگی ظاہر ہے۔ [4] تو اہل اسلام کو مرنے کے بعد آرام کی اُمید دلاتا ہے تاکہ وہ راحت اُخروی کی تمنا میں دنیا سے بیزار اور موت کے طلبگار ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تو مسلمانوں کا دشمن جان ہے۔ [5] میں مومن ہوتا یا تو پیر مغاں ہوتا تو تاثیر ہوتی۔ یعنی مومن پر واعظ کا بیان اثر کرتا اور مجھ پیر مغاں کی بات اثر کرتی۔ مگر یہاں یہ دونوں باتیں مفقود ہیں۔ یہاں مومن نے اپنے کو غیر شخص تصور کیا ہے۔

[1] شمع کی فغان (خاموش) ضبط کے باوجود شرار سے برسا رہی ہے۔ اگر اس کی زبان لال (گونگی) نہ ہوتی تو دنیا کو برق کی طرح پھونک دیتی۔ شمع کی لو کو زبان شمع کہا جاتا ہے۔ [2] دل گرمی = گرمجوشی۔ اختلاط۔ میں معشوق کی تصنع آمیز گرمجوشی پر بھی قربان ہوں میری مثال پروانہ کی سی ہے اور اس کی شمع کی سی۔ پھر میں کیونکر اس کے صدق و کذب کا امتحان کرسکتا ہوں۔

روشن ہے اہل بزم پہ شکوہ نسیم کا — اس بہکتی زبان پہ دیکھو بیان شمع

آتا ہے بیکسوں پہ تو جلاد کو بھی رحم — روتی ہے شمع آپ سر کشتگان شمع

مجھ بیگنہ کے قتل میں کیوں سوچ دیکھ لے — بن بولے لوگ کرتے ہیں قطع زبان شمع

ہے تار گریہ تار نفس اہل سوز کو — یعنی روانِ شمع ہے اشکِ روان شمع

داغ جدائی دُر دندان و روے و زلف — ہے اشک شمع و شعلۂ شمع و دخان شمع

سب گرمیِ نفس کی ہیں اعضا گدازیاں — دیکھو نہ زندگی ہے سراپا زیان شمع

اُس کو بھی کوئی پردہ نشیں ہی جلائے ہے — فانوس سے سُنا ہے یہ راز نہان شمع

اک اور پڑھ وہ مومن شعلہ زبان غزل
جل جائیں جسکے رشک سے حاسد لسان شمع

جب نسیم چلتی ہے تو زبانِ شمع کو جنبش ہوتی ہے۔ اس کو زبان شمع کا بہکنا قرار دیا ہے مطلب یہ ہے کہ اس بہکتی ہوئی زبان پر بھی شمع کا بیان اس قدر واضح ہے کہ تمام اہل بزم پر روشن ہو جاتا ہے کہ یہ نسیم کی دراز دستی کی شکوہ گذار ہے۔ کشتگانِ شمع = پروانے جو شمع کی محبت میں ہلاک ہوئے ہیں شمع سے قطرات کے ٹپکنے کو رونے سے تعبیر کیا ہے۔ اہل سوز کو تار گریہ ہی سانس کا تار ہے یعنی جب تک وہ روتے ہیں اُسی وقت تک زندہ ہیں۔ ادھر رونا موقوف ہوا اُدھر رشتۂ حیات ٹوٹا۔ دیکھ لو شمع کے آنسوؤں ہی میں اُس کی زندگی مضمر ہے۔ جہاں اُس کا رونا (جلنا) بند ہوا وہیں ہستی بھی ختم ہو گئی۔ پہلے رواں کے معنی روح اور دوسرے کے معنی جاری ہیں۔ تیرے گوہر دنداں کے ہجر کا داغ شمع کے اشکوں کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔ اسی طرح رُخ کی جدائی کا نتیجہ شعلۂ شمع اور زلف کی فرقت کا اثر دخانِ شمع کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ ماحصل یہ ہے کہ تیری عدم موجودگی شمع کی سوزش کا باعث ہے۔ شعر میں لف و نشر مرتب ہے۔ دُر دنداں کی مشابہت اشک سے روے یار کی شعلے سے اور زلف کی دخان سے ظاہر ہے۔ اعضا کے پگھلنے کا باعث سانس کی گرمی ہے۔ دیکھ لو جب تک شمع زندہ رہتی ہے زیان (نقصان) میں رہتی ہے اور جب مر جاتی ہے سوز و گداز سے محفوظ رہتی ہے۔ ماحصل یہ ہے کہ در اصل راز بقا موت میں مضمر ہے۔ فانوس سے شمع کا یہ راز نہاں معلوم ہوا کہ اس کو بھی کوئی پردہ نشین جلاتا ہے۔ چونکہ فانوس ایک قسم کا پردہ ہے اسلیئے شاعر کا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ اس کا جلانے والا کوئی پردہ نشین ہے جس نے جلانے میں بھی پردے کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔

۹۴

محفل[1] فروز تھی تپ و تاب نہان شمع — پروانہ جل گیا کہ نہیں رازدان شمع

تھا شب چراغ خانۂ دشمن وہ شعلہ رو — کیا کیا جلا ہے صبح تلک جی بسان شمع

اے سوز گریہ آگے تری آب و تاب کے — پانی[2] بھرے ہے جلوۂ آتش فشان شمع

صحبت[3] میں ایک رات کی کیا محو ہوگئی — اُس بزم میں سحر کو نہ پایا نشان شمع

پہونچے تری نزاکت وگرمی کو کیا مجال — ہرچند موم جسم ہے اور شعلہ جان شمع

ہوں[4] داغِ بدگمانیِ دل بسکہ یار پر — پروانہ کو ہے سادہ دلی سے گمان شمع

حیرت فزا ہے حُسن بہت کیا عجب اگر — تھم جائے تیری بزم میں اشکِ روان شمع

گر دیکھ لے رُخِ[5] عرق آلودہ کو ترے — گُھل جائے سوز رشک سے تا استخوان شمع

ابتک[6] یہ سوز دل ہے کہ میرے مزار پر — مائل ہوا زمین کی جانب دخان شمع

لائیں[7] نہ تاب حرف بتان کافرانِ عشق — پروانہ کو جحیم ہے مومن زبان شمع

---

[1] شمع کے سوز نہاں نے محفل کو روشن کردیا۔ چونکہ پروانہ شمع کا رازداں نہ تھا اسلئے جل گیا ورنہ وہ بھی اُسکی روشنی سے متمع ہوتا شمع کے راز سے وہ سوز مراد ہے جو اُس (شمع) کے دل میں مخفی ہے۔ [2] پانی بھرنا = اظہار عجز کرنا۔ [3] رات بزم یار کی آب و تاب دیکھ کر شمع ایسی گم ہوگئی (فرط شوق میں اپنی ہستی بھول گئی) کہ صبح کو پتہ بھی نہ ملا۔ [4] ازبسکہ پروانہ کو سادہ لوحی سے معشوق پر شمع ہونے کا گمان ہے اور اسی دھوکے میں اُس پر آ آکر گرتا ہے اس لئے میں دل کی بدگمانی کی وجہ سے داغ داغ ہوا جاتا ہوں اور صدمۂ رقابت برداشت نہیں کرسکتا۔

[5] شمع قطروں کے ٹپکنے کی وجہ سے محبوب کے رُخ عرق آلودہ سے گونہ مشابہت رکھتی ہے۔ [6] مرنے کے بعد بھی میرے دل میں اس قدر جلن ہے کہ شمعِ مزار کا دھواں اوپر کرۂ نار کی جانب جانے کے عوض نیچے میری قبر کا رُخ کرتا ہے کیونکہ الجنس یمیل الی الجنس۔ [7] جس طرح پروانہ کو شمع کی زبان جحیم (دوزخ) ہے یعنی جلا کر خاک کردیتی ہے اسی طرح کافرانِ عشق کو بھی بتوں کی بات کی تاب نہیں۔ مراد یہ ہے کہ عشاق بھی بتوں کی گفتگو سنکر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ لائیں مضارع ہے بمعنی حال۔

ردیف الغین

۹۵

مت کہہ شبِ وصال کہ ٹھنڈا نہ کر چراغ | ظالم جلا ہے میری طرح عمر بھر چراغ

پروانے کیوں نہ صدقے ہوں اس آگ کے کہ ہے[1] | ہر رشتۂ فتیلۂ زخم جگر چراغ

وہ سوختہ جگر ہوں کہ پیمانہ و سبو[2] | بنتے نہیں ہیں خاک سے میری مگر چراغ

زلفیں اٹھاؤ رخ سے کہ دل کی جلن مٹے[3] | بجھ جائے ہے جہان میں وقت سحر چراغ

اس مہروش کے جلوے کے قربان کیوں نہ ہوں[4] | پروانہ کو بھی رات نہ آیا نظر چراغ

کیا بے تکلف آئے صدا ہائے شمع رو[5] | گر میرے آب اشک سے ہو نوحہ گر چراغ

ہم پیشہ کے ہے سامنے عرضِ ہنر ضرور[6] | جلتا ہے میرے گھر میں بطرز دگر چراغ

کیا خوب روشنی ہے کہ چہرے کی آب سے[7] | ہے داغ بوالہوس تری محفل میں ہر چراغ

غم خانہ تنگ و تار ہے اور ہم سیاہ روز[8] | جلتے ہیں یعنی چاہیے آٹھوں پہر چراغ

---

[1] سوزشِ دروں کی وجہ سے میرے زخم جگر کی بتی کا ہر ڈورا چراغ کا حکم رکھتا ہے۔ پھر پروانے اس پر کیوں نہ صدقے ہوں فتیلہ = بتی۔ یہاں وہ بتی جو زخم میں رکھی جائے مراد ہے۔ [2] میری خاک سے پیمانہ و سبو نہیں بنتے چراغ بنتے ہیں۔ [3] صبح ہوتے چراغ بجھ جاتے ہیں۔ اسی طرح تمھاری زلفیں اٹھانے سے صبح رخسار نمودار ہوگی اور میرے دل کی جلن دور ہوگی۔ رخ کو سحر اور دل کی جلن کو چراغ قرار دیا ہے۔ [4] لفظ مہروش میں یہ رعایت ہے کہ مہر کی تجلی کے سامنے چراغ بے نور ہو جاتا ہے۔ [5] قاعدہ ہے کہ اگر چراغ کے تیل میں پانی پڑ جاتا ہے تو چراغ چرچرانے لگتا ہے۔ اسی کو چراغ کا نوحہ گر ہونا مانا ہے۔ یعنی اگر میرا آب اشک چراغ میں پڑ جائے تو اس سے بیساختہ "ہائے شمع رو" کی صدا آنے لگے۔ [6] مومن نے اپنے کو چراغ کا ہم پیشہ کہا ہے کیونکہ جلنے میں دونوں شریک ہیں۔ یعنی چراغ میرے گھر میں خاص شان سے جلتا ہے اس واسطے کہ ہم پیشہ کے سامنے اظہار کمال ضروری ہے۔ [7] تیرے چہرے کی روشنی کیا خوب ہے جسکے اثر سے محفل میں ہر چراغ اس طرح ماند ہے جیسے رقیب کے دل کا داغ۔ تشبیہہ نہایت پرلطف ہے۔ [8] ہمارا غم کدہ تنگ و تاریک ہے اور ہم بدبخت آٹھوں پہر چراغ کی جگہ جلتے رہتے ہیں۔ اپنے جلنے کو چراغ کے جلنے سے تشبیہ دی ہے۔ اور ہم سیاہ روز مصرع ثانی سے متعلق ہے۔

ہے شام انتظار تماشائے سوختن
اس شعلہ رو نے تا کہ پسِ مرگ بھی جلوں

جلتے ہیں تا بصبح ادھر ہم اُدھر چراغ
جلوائے دشمنوں سے مری گور پر چراغ

مومن یہ شاعروں کا مرے آگے رنگ ہے
جوں پیشِ آفتاب ہو بے نور تر چراغ

۹۶

گلشن میں لالہ میں ہوں کہ ہے لے میں جائے داغ
اپنے تو دلنشیں نہیں کچھ بھی سوائے داغ

کیا دکھ نہ دیکھے عشق میں کیا کیا نہ پائے داغ
زخموں پہ زخم جھیلے ہیں داغوں پہ کھائے داغ

پہنا ہے[۱] کس کا جامۂ گلدوز غیر نے
کیوں تنگ ہوگئی مرے تن پر قبائے داغ

کیا کہیے گرمیانِ دلِ بیتاب کی کہ ہے
سینے میں ایک شعلۂ جوالہ[۲] جائے داغ

کرتا ہے[۳] سخت ناخنِ غم روخراشیاں
دل کو کِس کے چہرے کے چیچک کے بھائے داغ

اس رشکِ مہروَمہ[۴] کی نشانی ہے دیکھنا
اے چشمِ اشکبار کہیں بہ نہ جائے داغ

چھوڑا[۵] نہ لالہ زار میں ساتھ اس نے غیر کا
سو بار سینہ چیر کے میں نے دکھائے داغ

دیکھو تو سرد مہری چرخ اس سے گرم ہو
واں تو بغل رقیب کی یاں دل جلائے داغ

دوزخ میں کچھ عذاب نہ پایا زبسکہ میں
خوکردہ تھا بہ تاب و تپِ شعلہ ہائے داغ

رہ تو بغل میں غیر کے سینے سے لگ کے یاں
پہلو برائے زخم ہے سینہ برائے داغ

---

۱ رقیب نے معشوق کا جامہ گلدوز پہنا ہے جسکے رشک سے میرے تن پر قبائے داغ تنگ ہوگئی یعنی میں داغہائے عشق سے بیزار ہوگیا۔ گلدوز = پھولوں کا کڑھا ہوا۔ ۲ شعلۂ جوالہ = چکر کھانے والا شعلہ۔ ۳ ناخنِ غم نے میرے چہرے کو کھرچ کر جا بجا داغ ڈالدئے ہیں۔ ۴ مہروَمہ کے الفاظ کے استعمال میں یہ خوبی ہے کہ دونوں میں داغ ہوتے ہیں۔ ۵ وہ لالہ زار میں غیر کے ہمراہ مصروف گلگشت رہا۔ ہرچند میں نے سینہ چیر کر داغہائے رشک دکھلائے۔ داغ اور لالہ زار کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ شعر میں نکتہ یہ ہے کہ میرے داغ لالہ زار سے کچھ کم نہیں۔

تاروں[6] کے بدلے گن کے شب تار کاٹ دی — ایام ہجر میں مرے کیا کام آسے داغ

جلتا[8] ہوں اہل نار کی تبدیل جلد سے
مومن غضب ہے آتش لذت فزائے داغ

ردیف الفاء

۹۷

مجلس[10] میں تا نہ دیکھ سکوں یار کی طرف — دیکھے ہے مجھکو دیکھ کے اغیار کی طرف

کتنا[11] شعاع مہر نے حیراں کیا ہمیں — تکتے ہیں کب سے روزن دیوار کی طرف

وہم[12] فغان غیر نے سینہ جلا دیا — آتش لگی تھی کوچۂ دلدار کی طرف

شام[13] فراق خواب عدم کا ہے انتظار — آنکھیں لگی ہیں دولت بیدار کی طرف

اس[14] نے دکھا دکھا کے مجھے چھیڑ دیکھنا — گل پھینکے عندلیب گرفتار کی طرف

ہے[15] کیا قبول سجدہ شہیدان عشق کا — ہوں غوث سر جھکاتے ہی تلوار کی طرف

[7] شب تار ہجر میں تارے تو کہاں تھے۔ داغ ہی گن گن کر رات بسر کی۔ [8] قران شریف میں فرمایا گیا ہے کہ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُوداً غَيْرَهَا یعنی ہم ہر بار کافروں کو عذاب دوزخ کا مزہ چکھانے کے لئے نئی کھال بدلکر دینگے۔ مومن کہتا ہے کہ داغ کی سوزش میں اسقدر لذت ہے کہ مجھے اہل دوزخ کی تبدیل جلد پر رشک آتا ہے۔ کاش مجھے بھی ہزار جسم ملتے اور ہر ایک جسم داغوں سے معمور ہوتا۔
[10] معشوق پہلے اغیار کی طرف دیکھ کر مجھکو دیکھتا ہے اسکا مقصد اسکے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ میں رشک کی وجہ سے اس (معشوق) کی طرف دیکھنا چھوڑ دوں۔ [11] روزن دیوار سے جو شعاع آفتاب نمودار ہوئی تو معاً ہم کو یہ گمان گذرا کہ جلوۂ یار ہے اس لئے حیران ہو کر تکنے لگے۔ [12] کوچۂ دلدار کی طرف آگ لگتے دیکھ کر ہم کو یہ شبہ ہوا کہ فغان رقیب کا اثر ہے۔ [13] خواب عدم کو دولت بیدار کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شام فراق اگر موت کی نیند آجائے تو نصیب جاگ جائیں۔ [14] عندلیب گرفتار کی طرف گل (جو معشوق عندلیب ہے) پھینکنے میں یہ چھیڑ تھی کہ اسکو اسکے معشوق سے ہمکنار دکھا کر مجھ محروم وصال کو جلایا جائے۔ [15] غوث = فریادرس۔ اولیاء اللہ کا ایک طبقہ جسکے متعلق مشہور ہے کہ عبادت کے وقت اسکے اعضا و جوارح جدا ہو جاتے ہیں مراد یہ ہے کہ میں سر جھکاتے ہی مرتبۂ غوثیت پر فائز ہو جاتا ہوں۔

دیکھا اشک لالہ گوں رقیب اُس نے ہنس دیا
دیکھا نہ میرے دیدۂ خونبار کی طرف

گلبانگ[7] نالہ ہے یہ نیا گُل کھلا مگر
گذری نسیم آہ چمن زار کی طرف

اب رشک[8] زخم یار پہ منصف کریں کسے
کی آکے موت نے بھی تو اغیار کی طرف

دل[9] بعد قتل بھی نہیں پھرتا گرو میں
مُنہ پھر گیا ہے کوئے ستمگار کی طرف

کافر[10] گلے لگا ہے تو مومن کے مت مکر
دیکھ اپنے نقش رشتۂ زنار کی طرف

ردیف القاف

۹۸

وہ جو زندگی میں نصیب تھا وہی بعد مرگ رہا قلق
یہ قلق ہے کیسا کہ ہے ستم گئی جان پر نہ گیا قلق

کسی کے خرام کی یاد میں تہِ خاک بھی یہ رہا قلق
کہ زمیں کو زلزلے آئے ہیں جو لٹا ہے مجھکو ذرا قلق

پئے ہم[11] ہے حالت جانکنی غرض اتنی جان پہ آ بنی
یہ عذاب مرگ ہے یا تپش یہ خدا کا قہر ہے یا قلق

یہ کہاں کی جی کو بلا لگی مری ہائے کیونکہ ہو زندگی
کوئی کیا جئے جو ہوا ایک سا شب و روز صبح و مسا قلق

[7] میری آہ کی ہوا شائد چمن کی طرف ہو کر گذری کہ نالہ میں گلبانگ کا اثر پیدا ہو گیا۔ یعنی نالہ نے آگ لگانے کی بجائے الٹی تاثیر دکھائی گلبانگ = آواز شادی۔ [8] معشوق نے رقیب کے زخم لگائے۔ اس پر مجھے رشک آیا۔ اب اس رشک کا انصاف کون کرے۔ موت سے امید تھی کہ وہ میرے رشک کی داد دیگی اور میرا کام تمام کر دیگی مگر اس نے بھی رقیب کی طرفداری کی اور اسکو ختم کر دیا گویا جو زخم کا ما حصل تھا اس کو حاصل ہو گیا۔ [9] پہلے مصرع میں پھرنا منحرف ہونے کے معنی میں ہے دوسرے میں متوجہ ہونے کے معنی میں۔ [10] کافر اپنے رشتۂ زنار کے نقش کی طرف دیکھ جو مومن کے بدن پر ہے اور جو اس امر کی شہادت ہے کہ تو ضرور مومن کے گلے لگا ہے۔ یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ نقش رشتۂ زنار جو تیرے جسم پر ہے اس کو دیکھ اور گلے لگنے سے نہ مکر۔ مگر پہلا مفہوم زیادہ قرین قیاس ہے۔

[11] پئے ہم = پیہم۔ متواتر۔

شبِ ہجر روز وصال کی تری شوخیاں جو نظر میں تھیں
کہوں کیا تغیرِ حالِ دل کبھی تھا سکوں کبھی تھا قلق

نہیں چاہ میری اگر اسے نہیں رادہ دل میں تو کس لئے
مجھے روتے دیکھ وہ رو دیا مرا حال سنکے ہوا قلق

غمِ ہجرِ یار کے ہاتھ سے شب روز ہوں میں عذاب میں
ہے ہمیشہ ایک نئی تپش ہے مدام ایک نیا قلق

شبِ وعدہ جذبۂ شوق سے ہوئی کشمکش یہ ستم ہوا
کہ وہ آتے آتے جو تھم گئے تو کسی طرح نہ تھما قلق

کہا جاں بلب ہوں جو آئے تو مری زندگی ہو تو بولی کہا
ترے جینے کی مجھے کیا خوشی ترے مرنے کا مجھے کیا قلق

ق

یہ شرارتوں کی شکایتیں یہ جلانا غیر کا دیکھیو
کہے مجھسے وہ ترے ہاتھ سے نہیں چین مجھکو سوا قلق

نظرِ ابر پہ جو کبھی پڑے تو خیال رونے کا آبندھے
جو تپش کو برق کی دیکھوں تو مجھے یاد آئے ترا قلق

ابھی دین اگر ہے تو چھوڑ دو طرف اس صنم کے نہ رخ کرو
جسے مومن آپکے واسطے ہے مثال قبلہ نما قلق

۹۹
۷

قہر ہے موت ہے قضا ہے عشق
سچ تو یہ ہے بری بلا ہے عشق

اثرِ غم ذرا بتا دینا
وہ بہت پوچھتے ہیں کیا ہے عشق

آفتِ جاں ہے کوئی پردہ نشیں
کہ مرے دل میں آ چھپا ہے عشق

ہجر میں تیری شوخیاں جو نظر میں تھیں اسلئے دل کو قلق ہوتا تھا اور چونکہ وصال کی یاد دل میں تھی اسوجہ سے سکون ہوجاتا تھا۔ یہ اور شعر مابعد قطعہ بند ہیں۔ معشوق کی شرارت آمیز شکایت دیکھو کہ غیر کے جلانے کو مجھ سے کہتا ہے کہ مجھے تیرے ہاتھ سے کبھی چین نہیں چنانچہ جب ابر کو دیکھتا ہوں تو تیرے رونے کا خیال آ بندھتا ہے اور برق کی تڑپ پر نظر کرتا ہوں تو تیرا اضطراب یاد آ جاتا ہے۔ مومن جس (معشوق) کو تمھاری محبت میں قبلہ نما کی طرح بیقراری ہے اس کو چھوڑ دینا اور اس کی طرف رخ نہ کرنا اگر دین اسلام کا مقتضا ہے تو خیر اس (معشوق) کو چھوڑ دو۔ اس میں طنز کا پہلو ہے یعنی دین ایسی بیوفائی کی تعلیم نہیں دیتا۔

میرے دل میں عشق چھپا ہے۔ یہ اس امر کی شہادت ہے کہ کسی پردہ نشین کی بدولت میری جان پر آفت آئی ہے۔

بوالہوس اور لاف جانبازی
کھیل ہی کیا سمجھ لیا ہے عشق

وصل[1] میں احتمال شادی مرگ
چارہ گر درد بے دوا ہے عشق

سوجھے[2] کیونکر فریب دلداری
دشمنِ آشنا نما ہے عشق

کس[3] ملاحت سرشت کو چاہا
تلخ کامی پہ با مزا ہے عشق

ہم[5] کو ترجیح تم پہ ہے یعنی
دلربا حُسن و جاں رُبا ہے عشق

دیکھ[6] حالت مری کہیں کافر
نام دوزخ کا کیوں دھرا ہے عشق

دیکھئے کس جگہ ڈبو دے گا
مری کشتی کا ناخدا ہے عشق

اب تو دل عشق کا مزا چکھا
ہم نہ کہتے تھے کیوں بُرا ہے عشق

آپ[7] مجھ سے نباہیں گے سچ ہے
با وفا حُسن بیوفا ہے عشق

میں[8] وہ مجنون وحشت آرا ہوں
نام سے میرے بھاگتا ہے عشق

قیس و فرہاد و وامق[9] و مومن
مر گئے سب ہی کیا وبا ہے عشق

---

۱ عشق میں اگر ہجر سے سابقہ پڑا تو موت یقینی ہے ہی وصل میں بھی فرطِ شادی سے مرجانے کا احتمال رہتا ہے۔ غرض معلوم ہوا کہ عشق ہر حال میں ایسا مرض ہے جس کا علاج نہیں۔

۲ عشق ایسا دشمن ہے جو بظاہر دوست ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں عشق میں فریب دلداری کا احساس نہیں ہو سکتا۔ یعنی اُس کے فریب پر عنایت کا گمان ہوتا ہے حالانکہ دراصل وہ عنایت نہیں

۳ کس معشوق ملیح کے چاہنے کا یہ اثر ہے کہ تلخیوں کے باوجود عشق میں مزا ہے۔ ملاحت تلخ کامی اور مزہ میں رعایت ہے۔ ۵ وجہ ترجیح یہ ہے کہ دل سے جان زیادہ گرانمایہ ہے۔ مگر فرق اتنا ہے کہ حُسن دوسرے کا دل لیتا ہے اور عشق خود عاشق کی جان لے کر رہتا ہے۔ ۶ او کافر کہیں میری حالت تو دیکھ جس کی بدولت میری جان مصیبت میں ہے اِسکا نام عشق نہ رکھ۔ یہ تو دراصل عذاب دوزخ ہے۔

۷ اس شعر میں سرتاسر طنز ہے۔ ۸ یعنی جنون اس حد تک پہونچ گیا ہے کہ آداب عشق بھی بالائے طاق رکھ دیے

۹ وامق عذرا کا عاشق تھا۔

ردیف الکاف

۱۰

امتحاں کے لئے جفا کب تک
التفات ستم نما کب تک

غیر سے ہے وفا یہ تم تو کہو
ہے ارادہ نباہ کا کب تک

جرم معلوم ہے زلیخا کا
طعنۂ دست نارسا کب تک

عدو عاشق نہیں ہے پر ظالم
صبر آخر کرے وفا کب تک

دیکھئے خاک میں ملاتی ہے
نگہ چشم سرمہ سا کب تک

ہیں آنکھیں دکھا چکو چھپالو
جانب غیر دیکھنا کب تک

نہ بلائیں گے وہ نہ آئیں گے
جوش لبیک و مرحبا کب تک

ہوش میں آ تو مجھ میں جان نہیں
غفلت جرأت آزما کب تک

لے شب وصل غیر بھی کاٹی
تو مجھے آزمائے گا کب تک

تم کو خو ہو گئی برائی کی
درگذر کیجئے بھلا کب تک

مر چلے اب تو اُس صنم سے ملیں
مومن اندیشۂ خدا کب تک

۱؎ جفا تو امتحان کی غرض سے کی جائے در اصل ایک قسم کا التفات ہے جو بظاہر ستم کہا جا سکتا ہے۔

۲؎ تمہارا عدو سے نباہ کا ارادہ کب تک ہے۔ یعنی تم غیر سے وفا کیجئے ہو۔ یہ تو بتاؤ کہ تم سے وفا ہو یا نہیں۔

۳؎ زلیخا نے ... حضرت یوسف کے دامن پر ہاتھ بڑھایا مگر ناکامی میسر ہوئی۔ شاعر کہتا ہے کہ تم جو زلیخا کا جرم دھرا رکھے ہو ہمیں سب معلوم ہے (یعنی کوئی جرم نہ تھا۔ اصل میں بات یہ تھی کہ اُس کا ہاتھ (کامیابی کے ساتھ) دامن یوسف تک رسا نہ ہو سکا تو دریدہ تمہیں ہماری ناکامی پر طنز کرنا مقصود ہے۔ ہم یہ جو رہے ہیں اسکا مطلب ہم سمجھتے ہیں ۴؎ صبر عدو عاشق تو ہے نہیں جو بیٹھ رہے وفا کرتا رہے۔ آخر ایک دن دامن صبر ہاتھ سے چھوٹ جائے گا ۵؎ سرمہ۔ اور خاک کی مناسبت ظاہر ہے

۶؎ مجھے پر نظر غصہ سے کرنا ہے تو کر چکو اس کے لئے غیر سے بار بار جانے کی کیا حاجت۔

۷؎ جب یہ حال ہے تو میں نے کب تک لبیک اور مرحبا کہتا رہوں۔ لبیک = تیری خدمت کو حاضر ہوں۔ مرحبا = تمہارے لئے کشادہ جگہ ہے۔ پہلا لفظ بلانے کے جواب میں اور دوسرا کسی کے آنے کے موقع پر استعمال کرتے ہیں۔ ۸؎ تم اس لئے غفلت کر رہے ہو کہ میری جرأت کا امتحان کرو۔ مگر یہاں جان ہی باقی نہیں۔

۱۰۱

ہم ہیں[1] اور نزع شبِ ہجر میں جاں ہونے تک ‏ — ‏ صبر آتا ہے کوئی تاب و تواں ہونے تک

آسماں[2] فتنہ کچھ ایسا نہیں لے اہلِ جہاں ‏ — ‏ کوئی باقی نہیں رہنے کا اماں ہونے تک

شمع ساں[3] اپنی تپش ہے تو سُنے یا نہ سُنے ‏ — ‏ طے نہ ہووے گا یہ افسانہ زباں ہونے تک

اس[4] چمن زار کا حسرت سے نظارہ کر لے ‏ — ‏ اے نگہ دیدۂ ہر سو نگراں ہونے تک

کون[5] جیتا ہے نگاہوں میں سُبک ہونے کو ‏ — ‏ سخت جانی ہے ترے دل پہ گراں ہونے تک

گر یہی نالۂ جانکاہ کے ہیں شور و شغب ‏ — ‏ دم رہا کا ہے کو تاثیرِ فغاں ہونے تک

ہاتھ[6] شاید کہ وہ سرمایۂ حُسن آجاوے ‏ — ‏ کچھ نہ کچھ فائدہ ہے جی کے زیاں ہونے تک

غم[7] و غصہ سے ہے خلقت مری جوں طفلِ سرشک ‏ — ‏ نہیں کرنے کی وفا عمر جواں ہونے تک

ضد[8] ہوئی محتسب و پیرِ مغاں ہیں مومن ‏ — ‏ عید ہر روز ہے اب کی رمضاں ہونے تک

[1] جب تک جان ہے شب ہجر میں نزع کی سی حالت رہیگی۔ اس لئے کہ جب تک طاقت باقی ہے بیقراری کا دور ہونا معلوم۔ [2] آسمان کوئی معمولی فتنہ نہیں۔ جب تک امان کا اعلان عام ہوگا تمام اہل جہان ہلاک ہو جائینگے۔ [3] شمع کی زبان جب تک باقی ہے تپش جاری رہیگی۔ یہی میرا حال ہے۔ [4] یعنی جبتک آنکھ میں ہر طرف دیکھنے کی قوت باقی ہے یا اس سے قبل کہ آنکھ ہر جانب یاس سے دیکھے دنیا کی بہار دیکھ لے۔ حسرت میں یہ مفہوم ہے کہ بہار باغ دنیا چند روزہ ہے۔ [5] ہماری سخت جانی اُسی وقت تک ہے جب تک ہم تیرے دل پر گراں نہیں۔ جب بار خاطر ہونگے خود جان دیدینگے۔ سُبک اور گراں میں بظاہر تضاد ہے گو معناً یک گونہ اتحاد ہے۔ [6] جان کا نقصان کرنے میں کچھ نہ کچھ فائدہ تو ہے۔ شاید وہ سرمایۂ حُسن (معشوق) کبھی ازراہ قدردانی ادھر آنکلے۔ سرمایہ، فائدہ۔ زیاں میں رعایت ہے۔ [7] آنسو کو مچلنے کے اعتبار سے طفل کہا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ طفل اشک کی طرح میری خلقت غم و غصہ سے ہوئی ہے اسلئے جوان ہونے سے قبل ہی غم مجھے فنا کر دے گا۔ ظاہر ہے کہ "طفل اشک" کبھی بھی جوانی کو نہیں پہونچتا۔ [8] محتسب و پیر مغاں کی ضد میں میخواروں کی بن آئی۔ اسلئے رمضان بھر ہر روز عید رہیگی۔ اس غزل میں بعض جگہ "تک" ابتدائیہ ہے بعض جگہ انتہائیہ جیسا کہ ظاہر کر دیا ہے۔

۱۰۲

پھر نچھوڑوں گو وہ کردے چاک جیب جاں تلک
ہاتھ پہونچا چاہیے اُس شوخ کے داماں تلک

خاک[1] دے آنکھوں کو میری گرد وا نکی مجھے تو
سب مکدّر ہیں ہوائے کوچہ جاناں تلک

اوّلِ اُلفت ہے یارب وصل ہی میں ہو وصال
ہم کو تو جیتا نہ رکھیو آمدِ ہجراں تلک

سینے سے گھبرا کے آخر جان لب پر آگئی
حال پہونچا یاں تلک او تم نہ آئے یاں تلک

کل کا جلسہ بھولتا ہرگز نہیں اے اضطراب
آج پھر لے چل کسی ڈھب سے مجھے تو واں تلک

گر مثل[2] سچ ہے کوئیں کے پاس پیاسا آ رہے
کیوں نہ آ پہونچی زلیخا مصر سے کنعاں تلک

طالعِ برگشتہ[3] اے شوقِ شہادت دیکھنا
مرگ و قاتل پھر گئے سب خنجرِ برّاں تلک

نیند میں یارب دوپٹہ کس کے مُنہ سے ہٹ گیا
ہے زمیں سے روشنی افلاک نور افشاں تلک

شوق[4] بزمِ احمد و ذوقِ شہادت ہے مجھے
جلد مومن لے پہونچ اُس مہدیِ دوراں تلک

ردیف الکاف الفارسی

۱۰۳

لگائی آہ نے غیروں کے گھر آگ
ہوئے کیا کیا وہ اتنی بات پر آگ

وفورِ اشک و طغیانِ فغاں ہے
کدھر جاؤں ادھر پانی اُدھر آگ

[1] مجھ سے تو سب مکدّر رہیں حتیٰ کہ ہوائے کوچۂ جاناں بھی۔ پھر وہ میری آنکھوں تک اُس کوچے کی گرد کیوں لانے لگی۔ [2] چوں کہ حضرت یوسفؑ کنوئیں میں ڈالے گئے تھے اسلئے مثل میں لطافت پیدا ہوگئی۔ [3] برگشتگی قسمت، کہ شوقِ شہادت پورا نہ ہوا اور موت و قاتل سے لیکر خنجر تک سب ہم سے منحرف ہوگئے۔ [4] احمد سے مراد سید احمد صاحب رائے بریلوی ہیں جن سے مومن نے بیعت کی تھی۔ انھیں کو مہدی دوراں کہا ہے۔

سمندر کر دیا آتش رخوں نے
کہ گر پڑتا ہوں آتے ہی نظر آگ

جلایا آتشِ ہجراں نے دل کو
ترے گھر میں لگی اے بیخبر آگ

نچوڑیں گے ہم اپنا دامنِ تر
جہنم میں ہے اے واعظ اگر آگ

وہاں تابِ رخ و یاں آتشِ دل
جدھر دیکھو اُدھر ہے جلوہ گر آگ

جلے کیا کیا شجر تربت پہ میری
دبی تھی لاش کے بدلے مگر آگ

زبس غیروں سے ہے وہ گرمِ صحبت
مرا جاتا ہے جی کیا دیکھکر آگ

دھواں اُٹھتا ہے دل سے وقتِ گریہ
بجھا دی تو نے کیا اے چشمِ تر آگ

حصولِ سوزِ دل جز داغ کیا ہو
کہ نخلِ شعلہ لاتا ہے ثمر آگ

نکالا رنگ عالم سوز کس نے
یہ کیوں بکھری پڑی ہے دربدر آگ

پڑھے مومن نے کیا کیا گرم اشعار
بھری تھی دل میں یا رب کس قدر آگ

ردیف اللام

ابتے ۱۰۴

مجھ پر بھی تجھکو رحم نہیں یہ کرخت دل
کم ہوئے گا جہان میں تجھ سا بھی سخت دل

داغِ جنوں و سنگِ درِ یار ہو نصیب
کرتا ہے رات دن ہوسِ تاج و تختِ دل

۱ آتش رخ حسینوں کے غمِ عشق نے سمندر کی طرح مجھے آگ کا خوگر کر دیا ہے کہ جہاں آگ نظر آتی ہے میں اُس میں گر پڑتا ہوں۔ سمندر موش کے برابر ایک جانور ہے جو آتشکدوں میں پیدا ہوتا ہے اور آگ سے نکلتے ہی مر جاتا ہے۔ ۲ دل میں (جو تیرا گھر ہے) آگ لگی ہے اور تجھے خبر نہیں۔ اس شعر میں مکر شاعرانہ ہے۔
۳ اگر دوزخ میں آگ ہے تو ہم اپنا دامن تر نچوڑ کر اُس کو سرد کر دینگے دامنِ تر = وہ دامن جو آلودہ گناہ ہے۔ شاعرانہ رعایت ہے اور رندانہ شوخی۔ ۴ مصرع اول میں واو عطف کا استعمال غیر فارسی و عربی الفاظ میں ہے جواب متروک ہے۔ ۵ آگ کو دیکھکر معشوق کی غیروں سے گرمجوشی یاد آجاتی ہے
۶ یہ جو دربدر آگ بکھری پڑی ہے کسکی عالم سوز (جہان کو جلانے والی) ادا کا اثر ہے۔
۷ داغ جنوں کو تاج اور سنگ در کو تخت سے تشبیہ دی ہے۔

گر جانتے کہ ہے شبِ ہجراں یہ کچھ بلا — دیتے کسی کو کاہے کو ہم تیرہ بخت دل

الماس ریزہ تھے مرے آنسو کہ ضبط سے — ہے پاش پاش سب جگر اور لختِ لختِ دل

کیا شبہہ **مومن** آہن و قمری کے کفر میں

کرتے ہیں نذرِ جلوۂ سنگ و درخت دل

۱۰۵

مردِ عشق ستیزہ کار ہے دل — ملک الموت سے دو چار ہے دل

بسکہ مشتاقِ نازِ یار ہے دل — ستم آموزِ روزگار ہے دل

زلفِ مشکیں میں کاہے کو رکھتے — کیا خبر تھی انھیں فگار ہے دل

وصلِ جاناں کہاں سوائے خیال — ہم ہیں مایوس امیدوار ہے دل

دیکھ افراطِ زخم و کثرتِ داغ — سینہ گلزار و لالہ زار ہے دل

بس کہ تھے ہم زباں گلے میں ترے — دل سے مَیں مجھ سے شرمسار ہے دل

---

۵۲ قاعدہ ہے کہ ریزۂ الماس کھانے سے جگر اور دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔
۵۳ آہن سنگ مقناطیس سے کھنچ آتا ہے اور قمری درخت سرو پر عاشق ہوتی ہے۔ اسلئے دونوں کو کافر ٹھیرایا — کیونکہ پتھر اور درخت سے عقیدت رکھنا مومن کے نزدیک کفر ہے۔
۱ میرا دل عشق فتنہ گر کا مرد (حریف) ہے گویا دراصل ملک الموت سے ہم نبرد ہے۔ عشق کو ملک الموت قرار دیا ہے۔ ۲ میرا دل چاہتا ہے کہ محبوب ناز کرے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اُس کی ادائیں دیکھکر زمانہ کبھی ظلم سیکھ جائے گا اور اس ستم آموزی کا باعث دل ٹھیرے گا۔
۳ وصل یار کہاں میسر ہے۔ البتہ دل نے فرضی تخیلات کی دنیا پیدا کرلی ہے یہی وجہ ہے کہ دل وصل یار کا اُمیدوار ہے۔ اگرچہ میں مایوس ہوں۔ ۴ زخم کو گلزار سے اور داغ کو لالہ زار سے جو مناسبت ہے ظاہر ہے۔ ۵ چونکہ میرا دل تیری شکایت میں میرا شریک تھا اسلئے مَیں دل سے اور دل مجھ سے شرمندہ ہے۔

بے دوا درد و بیوفا ہے وہ شوخ
بے اثر آہ و بے قرار ہے دل

تیرہ[٦] بختوں کے پیچ و تاب نہ پوچھ
غیرت زلف تابدار ہے دل

بس[٧] کہ اُس نے جلا کے خاک کیا
سر عشاق کا غبار ہے دل

کیا[٨] کہوں میں ہجوم یاس و اُمید
رشک ہنگام انتظار ہے دل

شب[٩] ہجراں کو سمجھا روز جزا
مومن ایسا سیاہ کار ہے دل

۱۰۶

کیا کروں کیونکر کوئی ناصح رُکا جاتا ہے دل
پیش کیا چلتی ہے اُس سے جس پہ آجاتا ہے دل

سوزش[١٠] پروانہ دکھلاتے ہو کیا میں کیا کہوں
دیکھ جلتے شمع محفل کو جلا جاتا ہے دل

یا الٰہی مجھکو کس پردہ نشیں کا غم لگا
سینے میں اندر ہی اندر کچھ گھلا جاتا ہے دل

حیرت[١١] دیدار بس آئینہ رکھدے ہاتھ سے
اپنی حالت دیکھ کر ظالم کٹا جاتا ہے دل

[٦] تیرہ بختوں کے رنج و غم کا کیا پوچھنا اُنکا دل پیچ و تاب میں زلف پُر پیچ سے بھی بڑھا ہوا ہے۔
[٧] معشوق نے دل جلا کر خاک کر دیا اس سے دل کو یہ سرفرازی ملی کہ اب وہ غبار بنکر سر عشاق تک پہونچا ہے۔ [٨] ہنگام انتظار کبھی یاس و اُمید کا ہجوم ہوتا ہے۔ اس لئے اپنے دل کو رشک ہنگام انتظار قرار دیا ہے۔

[٩] میرا دل ایسا گناہ گار ہے کہ شب ہجراں جیسی مصیبت عظمیٰ کو اپنی مکافات عمل کا دن سمجھا۔ یعنی جس کا روز جزا اس قدر تاریک ہو اُس کی سیاہ کاری کا کیا ٹھکانا۔

[١٠] تم مجھے پروانہ کا جلنا دکھا کر یہ جتاتے ہو کہ عاشق یوں جلا کرتے ہیں۔ مگر میری حالت یہ ہے کہ شمع کو جلتے دیکھکر اس خیال سے میرا دل جلا جاتا ہے کہ اس کو اپنے عاشقوں سے دلسوزی ہے مگر تم کو مطلق نہیں ہے

[١١] عاشق نے جو جمال یار سے حیرت زدہ ہے اتفاق سے آئینہ اُٹھا لیا ہے۔ مگر آئینہ میں یہ دیکھکر کہ حیرت دیدار نے کیا صورت بنا دی ہے۔ رنج یا شرم سے کٹا جاتا ہے۔

کوئی سنتا ہی نہیں بکتا ہے کیوں دیوانہ وار | میرے دل کے ساتھ ناصح کا بھی کیا جاتا ہے دل

مست بگڑ تو ہرزہ گردی سے مری انصاف کر | کچھ بھی بن آتی ہے جب اے بیوفا جاتا ہے دل

وہ ستمگر دلبر عالم ادھر آتا ہے اب | کیا بنے گی دیکھئے رہتا ہے یا جاتا ہے دل

ہاتھ[3] اٹھائے کس کے دل سے کس کے سینے پر دھرے | ہاتھ سے اغیار کا بھی تو چلا جاتا ہے دل

آمدِ گریہ[4] دم اندوہ بے موجب نہیں | سینے میں رکتا ہے جب آنکھوں میں آ جاتا ہے دل

چاہتا ہوں میں تو مسجد میں رہوں مومن ولے
کیا کروں بت خانہ کیجانب کھنچا جاتا ہے دل

ردیف المیم

١٧

شام[1] سے تا صبح مضطر صبح سے تا شام ہم | ایک عالم میں ہیں کیوں اے گردشِ ایام ہم

شب رہے تجھ بن زلبس بیچین بے آرام ہم | صبح تک رو یا کئے لے لے کے تیرا نام ہم

یار و دشمن[2] نے ستایا جبکہ ہم عاشق ہوئے | بے گنہ اپنا ہی پھر دیویں کسے الزام ہم

کیا مزہ[3] پایا عدو سے بے مزہ ہو آپ نے | تلخ کامِ عشق ہیں تھے لائق دشنام ہم

[3] اغیار کا دل بھی تو اکثر ہاتھ سے جاتا رہتا ہے - پھر اِتنوں میں محبوب کس کس کی دلداری کرے۔

[4] غم کے وقت رونے کی علت یہ بیان کی ہے کہ دل جب سینے میں رکتے (گھبراتے) لگتا ہے تو آنکھوں کی راہ (آنسو بنکر) نکلنے کی کوشش کرتا ہے

[1] یعنی گردشِ ایام کا تقاضا تو یہ تھا کہ شام کو کچھ اور حالت ہوتی صبح کو کچھ اور مگر یہاں ہر وقت یکساں بیتابی ہے

[2] نہ ہم عاشق ہوتے نہ معشوق و رقیب ہم پر ظلم کرتے۔ [3] عدو سے بے مزہ (برہم) ہوکر آپنے کیا مزہ پایا آخر یہی نتیجہ ہوا کہ وہ آپ سے بگڑ بیٹھا - از بسکہ ہم تلخ کام عشق ہیں اسلئے اس بدسلوکی کے ہمیں مستحق و قدر دان تھے نہ کہ عدو۔

بسکہ اک پردہ نشیں کے عشق میں ہے گفتگو
بات بھی کرتے نہیں جز صنعتِ ایہام[۴] ہم

آن بیٹھا کون کوٹھے پر جو یوں حیران سے
خاک پر چپکے پڑے تکتے ہیں سوئے بام ہم

تو[۵] خبر لا کیا کہا قاصد سے چھپتے پھرتے ہیں
ہمدم اُس پردہ نشیں کو بھیج کر پیغام ہم

اس سیہ بختی پہ رکھیں تجھ سے اُمیدِ وفا
ایسے سودائی نہیں اے شوخ لیلیٰ فام ہم

آئنہ کا بوسہ لے تو عکس لب کو دیکھ کر
اور بس رہ جائیں یوں ناکام اے خودکام ہم

پہونچتے واں تک تو اُس پردہ نشیں کو دیکھتے
کاش ہوتے چشم نرگس دیدۂ بادام ہم

گر ترے[۶] کوچے کو دی کعبہ سے نسبت کیا گناہ
مومن آخر تھے کبھی اے دشمنِ اسلام ہم

۱۰۸

سر[۱]مہ ہیں اُس چشم جادو فن میں ہم
خاک ڈالیں دیدۂ دشمن میں ہم

ناتواں[۲] تھے پر نہ چھوڑا مثل خار
خود اُلجھ کر رہ گئے دامن میں ہم

غیر کو جھانکا تو ڈھیلے آنکھ کے
دیکھنا رکھ دیویں گے روزن میں ہم

پھولے جامہ میں سماتے ہی نہیں
وصل شوخِ چُست پیراہن میں ہم

اور شبنم[۳] دن کو ٹھہرے کیا مجال
روئے ہیں اے مہروش گلشن میں ہم

۴ ایہام ایک صنعت ہے جس میں دو معنی کا لفظ استعمال کیا جائے اور معنی قریب چھوڑ کر معنی بعید مراد لئے جائیں چونکہ ایہام میں در پردہ گفتگو ہوتی ہے اسلئے پردہ نشین کی رعایت ظاہر ہے۔ ۵ عاشق نے معشوق پردہ نشین کو قاصد کی معرفت پیغام بھیجا ہے۔ اب شرمندگی اور اندیشہ ہے کہ معشوق اس حرکت کو منافی عصمت سمجھکر ناراض ہوا ہو اسلئے ہمدم سے جواب دریافت کراتا ہے چھپتے پھرتے ہیں کا تعلق مصرع ثانی سے ہے۔ ۶ آخر پہلے تو ہم مومن تھے اور کعبے کا احترام کرتے تھے۔ اب اگر سابق احترام پر نظر کرتے ہوئے تیرے کوچے کو کعبہ سے نسبت دیدی تو کیا گناہ کیا۔

۱ ہم محبوب کی چشم سحر ساز میں سرمہ ہیں۔ یعنی اُسکی آنکھوں میں ہماری جگہ ہے۔ اب مناسب ہے کہ ہم رقیب کی آنکھ میں خاک جھونکیں اور اُس کو ذلیل کریں۔ ۲ ہم ناتوانی کی وجہ سے دامن یار میں اُلجھ کر رہ گئے۔ اگر توانائی ہوتی تو دامن ہی کو کھینچ لیتے۔ ۳ گلشن میں ہمارے آنسو بکھرے ہوئے ہیں۔ شبنم نہیں ہے۔ اسلئے کہ شبنم دن میں آفتاب کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی۔ شبنم۔ دن۔ مہروش۔ اور گلشن کی رعایت ظاہر ہے۔

کر[1] دیا اُس جلوہ نے مجنوں، چلو
خاک اُڑائیں وادیِ ایمن میں ہم

۸۷

دل[2] میں ناصح آئے کیا اپنا خیال
جا سکے کب یار کے مسکن میں ہم

جوشِ وحشت نے اُٹھایا لاش کو
اپنے پانوں سے گئے مدفن میں ہم

توڑ نا مومن نہ پیمانِ[3] اَلَسْت
ہیں مسلّم عاشقی کے فن میں ہم

۱۰۹

پاتے تھے چین کب غمِ دوری کے گھر میں ہم
راحتِ وطن کی یاد کریں کیا سفر میں ہم

اس طرح خاک چھانتے پھرتے نہ دشت دشت
ہوتے جو پائمال کسی رہگذر میں ہم

لکھتے ہیں اک پری کو کچھ آوارگی کا حال
باندھیں گے نامہ طائرِ[4] مجنوں کے پر میں ہم

تھیں دشت سے زیادہ تر اس کو میں سختیاں
کیا پھوڑیں سر تصورِ دیوار و در میں ہم

ہے[5] یادِ رطب و یابس تقریرِ ناصحاں
کیا بولیں شکوۂ سفرِ بحر و بر میں ہم

یکساں[6] ہے شامِ غربت و صبحِ وطن، اثر
پائیں فغانِ شب میں نہ آہِ سحر میں ہم

---

[1] شاعر نے چلو کا خطاب خود اپنی ذات سے کیا ہے جلوہ کی رعایت سے وادیِ ایمن کی اور مجنون ہونے کی بنا پر خاک اُڑانے کی ضرورت ہے۔ [2] یار کے مسکن میں میری رسائی محال ہے اور میرا دل ٹھہرا یار کا مسکن۔ یہی وجہ ہے کہ اُس میں میرا خیال بھی نہیں آ سکتا۔ اپنی خود فراموشی کی نئی توجیہ کی ہے۔ [3] پیمانِ الست = عہدِ ازل۔ جبکہ خدا نے ارواح سے خطاب فرمایا تھا الست بربکم کیا میں تمھارا پروردگار نہیں ہوں۔ سب نے جواب دیا بلیٰ بیشک تو ہمارا پروردگار ہے۔

[4] طائرِ مجنوں = وہ پرندہ جس نے مجنوں کے سر میں آشیانہ بنا لیا تھا۔ پری سے آوارگی۔ طائرِ مجنوں کی رعایت ملحوظ رہے۔ یہ غزل حالتِ سفر میں لکھی تھی۔

[5] ہم سفرِ بحر و بر کی شکایت کیا کریں اسلئے کہ (وطن میں) ناصحوں کی تقریروں کا ہر رطب و یابس یاد ہے جو مصائبِ سفر سے زیادہ ناگوار تھا۔ رطب و یابس (تر و خشک) اور بحر و بر میں تقابل ہے۔

[6] ہمارے لئے شامِ غربت اور صبحِ وطن دونوں برابر ہیں۔ اسلئے کہ اب نہ رات کی فغاں میں اثر باقی ہے نہ سحر کی آہ میں۔ لفظ اثر مصرعِ ثانی سے متعلق ہے۔

اُس گل کے غم میں پھولتے پھلتے تو رشک سے[۴] — کیوں جلتے سایۂ شجر بارور میں ہم

دلّی سے رامپور میں لایا جنوں کا جوش — ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

جائیں[۵] اثر جب اے رقمِ جذبِ اشتیاق — دیکھیں زمام ناقہ کفِ نامہ بر میں ہم

وصلِ[۶] بتاں کے دن تو نہیں یہ کہ مُوبال
مومن نماز قصر کریں کیوں سفر میں ہم

۱۱۰

غمِ ابرو میں بھرتے ہیں دمِ شمشیر اکثر ہم — کیا کرتے ہیں اپنے قتل کی تدبیر اکثر ہم

کماں[۱] کھینچے ہے وہ اور ہم خجالت سخت جانی سے — وہ دل توڑے ہے اپنا اور اسکے تیر اکثر ہم

کسی کی زلفِ پیچیدہ کے کیا سودے میں بکتے ہیں — کیا کرتے ہیں کیا کیا پیچ کی تقریر اکثر ہم

چمن[۲] کو جھانکتے ہیں روزنِ دیوار سے گویا — کہ دیکھا کرتے ہیں داغوں کو سینہ چیر اکثر ہم

ہوئے تم کیوں خفا تاثیر سے آہِ رسا کی اب — کیا کرتے تھے یہ تو پہلے بھی تقصیر اکثر ہم

لگے[۳] آگ آتشِ غم کو زبانِ خامہ شعلہ ہے — جلا دیتے ہیں سو سو خط دمِ تحریر اکثر ہم

---

[۴] اگر ہم اُس گلُ کے عشق میں پھولتے پھلتے تو راہ میں شجر بارور کے سایہ میں بیٹھ کر رشک کی آگ میں کیوں جلتے - یعنی اُس صورت میں ہم بھی درخت ثمر دار سے کم نہ ہوتے - [۵] شاعر نے دوست کو اپنے جذبہ اشتیاق کا ذکر لکھا ہے - اب اُس تحریر کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ تیرا اثر ہم اُس وقت جانیں جبکہ نامہ بر کے ہاتھ میں محبوب کے ناقے کی مہار دیکھیں یعنی جو قاصد خط لیکر گیا ہے وہی محبوب کو ساتھ لیکر واپس آئے - [۶] شرع میں سفر کے موقع پر نماز قصر کرنے کا حکم ہے مومن کہتا ہے کہ سفر میں مجھے ایسا کونسا شغل ہے کہ نماز قصر کرنے کی ضرورت ہو - ہاں اگر بتوں کے وصل کے دن ہوتے تو نماز ضرور وبال جان معلوم ہوتی - اور قصر کرنا پڑتی -

[۱] وہ ہمارے قتل کے لئے کمان کھینچکر ہمارا دل توڑتا ہے اور ہم اپنی سخت جانی کیوجہ سے اُسکے تیر توڑتے ہیں - اپنا = ہمارا
[۲] داغوں کو چمن اور شگافتہ سینہ کو روزن دیوار سے تشبیہ دی ہے - [۳] آتش غم عشق میں یہ تاثیر ہے کہ اُسکی وجہ سے قلم میں شعلے کی خاصیت پیدا ہوگئی ہے اور خط لکھتے لکھتے جل جاتا ہے -

جبیں یاں تک تو سنگِ آستاں پر تیرے گھستے ہیں
مٹا دیتے ہیں لفظِ دفترِ تقدیر اکثر ہم

وہاں[۱] چھوٹا گلے لگنا کہ شوقِ ہمکناری میں
لگاتے تھے گلے سے غیر کی تصویر اکثر ہم

عجب[۲] حالت ہے سودے میں تری زلفِ مسلسل کے
کہ سر سے باندھتے ہیں پانوں کی زنجیر اکثر ہم

نہیں[۳] پاتے اثر اپنا یہ غیرت کا اثر دیکھا
کہا کرتے تھے بیتابی کو بے تاثیر اکثر ہم

یہ اب[۴] کیوں پڑ گئے جوں نے گلو سے تا بدل روزن
الٰہی روکتے تھے نالۂ شبگیر اکثر ہم

نہ تھی مسجد میں برکت ورنہ وہ بت رام ہو جاتا
گئے **مومن** فسوں پڑھنے پہ تسخیر اکثر ہم

۱۶۱

کب چھوڑتے ہیں اس ستم ایجاد کے قدم
سر ہے ہمارا اور ہیں جلّاد کے قدم

کیا[۵] ٹھہرے فوج غم کے مقابل فغان و آہ
جمتے نہیں ہیں لشکرِ برباد کے قدم

اب تک گیا نہ باغ میں تو بہرِ انتظار
سُن ہو گئے کھڑے کھڑے شمشاد کے قدم

پابوس یار کرتے ہوئے کھینچ دیوے تو
تصویر میری چوم لے بہزاد کے قدم

اے ہمرہانِ باغ رہا ہوں یہ کیا کروں
اُٹھتا نہیں ہے کوچہ سے صیاد کے قدم

تلوار[۶] لے کے گھر سے جو نکلا وہ جنگ جو
تاثیر نے لئے مری فریاد کے قدم

---

[۱] ہم معشوق کے شوقِ ہمکناری میں اکثر غیر کی تصویر گلے سے لگاتے تھے۔ اس خیال سے کہ یہ وہ شخص ہے جو اس سے ہم بغل ہوتا ہے۔ مگر معشوق نے اسی ضد سے غیر سے ہم بغل ہونا ترک کر دیا۔ [۲] یعنی جنون میں زنجیر کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ شعر کی رعایات ملحوظ رہیں۔ [۳] ہم اپنی بے تابی کو بے اثر کہا کرتے تھے۔ آخر بے تابی کو غیرت آگئی اور اُس نے یہ اثر دکھایا کہ ہمارا ہی اثر (نشان) باقی نہ رہا۔ یعنی بے تابی نے تاثیر تو دکھائی مگر وہ ہمارے خلاف پڑی۔ [۴] ہم پہلے نالوں کو ضبط کرتے تھے مگر اب یہ حال ہے کہ نالے نہیں رکتے اور گلے سے دل تک بانسری کی طرح سوراخ ڈال دیتے ہیں۔ گلے سے دل تک اسلئے کہا کہ ضبط کی کوشش میں نالے واپس جاتے ہوئے جسم کو چھید ڈالتے ہیں۔

[۵] فغان و آہ کو لشکرِ برباد اس رعایت سے کہا ہے کہ دونوں کی بنیاد ہوا (بادم پرے) اور منتشر ہیں۔ [۶] وہ جنگجو (معشوق) میری فریاد پر میرے قتل کی غرض سے نکلا۔ گویا تاثیر نے آکر میری فریاد کی قدمبوسی کی۔

سر پہ یہ کوہِ غم گرا اٹھاتا تو بوجھ سے	دھنس جاتے بےستون[۳] میں فرہاد کے قدم
خواب[۴] عدم حرام ہے یاں انتظار میں	کیا سو گئے اجل تری بیداد کے قدم
کیا[۵] ہووے دل پہ ہاتھ دھرے سے اگر رکھے	سینے پہ وہ ہی عاشقِ ناشاد کے قدم

پامال[۶] جہل حضرت مومن بغیر ہوں
دکھلائے پھر خدا مجھے اُستاد کے قدم

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم	۱	پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم		منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بےکسی سے ہم
ہم سے نہ بولو تم اسے کیا کہتے ہیں بھلا		انصاف کیجے پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم
بیزار[۱] جاں سے جو نہ ہوتے تو مانگتے	۲	شاہد شکایتوں پہ تری مدعی سے ہم
اُس کو میں جا مریں گے مدد اے ہجومِ شوق		آج اور زور کرتے ہیں بےطاقتی سے ہم
صاحب[۲] نے اُس غلام کو آزاد کر دیا	3	لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

۳ بےستون = ایران کا ایک پہاڑ جس کو کاٹ کر فرہاد نے جوئے شیر نکالی تھی۔
۴ جب پاؤں سو جاتے ہیں تو آدمی سے چلا نہیں جاتا۔ مطلب یہ ہے کہ اجل کی بیداد کے پاؤں سو گئے جو مجھ تک نہیں آتی۔ ورنہ عدم کی نیند مجھ کو حرام نہ ہوتی۔
۵ میں اپنے دل پہ ہاتھ رکھتا ہوں لیکن تسکین نہیں ہوتی۔ ہاں اگر معشوق ہی عاشق سینے پر قدم رکھے تو تسکین ممکن ہے۔ ۶ یہ شعر گویا دوسرے کی زبان سے ادا کیا ہے۔ اُستاد سے خود مومن مراد ہیں۔

۱ مدعی (رقیب) نے معشوق سے کہا کہ عاشق (مومن) تمھاری شکایتیں کرتا پھرتا ہے۔ اس پر معشوق آمادۂ قتل ہو گیا۔ عاشق کہتا ہے کہ مدعی کا الزام جھوٹا ہے اور اگر میں خود جان سے بیزار نہ ہوتا تو اس ناکردہ جرم کے مواخذہ سے بچنے کے لئے اُس سے ضرور گواہ (شاہد) طلب کرتا لیکن میں تو خود مشتاقِ قتل ہوں۔ ۲ صاحب (یا آقا) یعنی معشوق اور غلام سے خود اپنی ذات مراد ہے۔ واضح رہے کہ صاحب مومن کی منظورِ نظر کا تخلص ہے۔

بے روئے مثل ابر نہ نکلا غبار دل — کہتے تھے ان کو برق تبسم ہنسی سے ہم

اِن ناتوانیوں پہ بھی تھے خار راہ غیر — کیونکر نکالے جاتے نہ اُس کی گلی سے ہم

کیا گُل کھلے گا دیکھئے ہے فصل گُل تو دُور — اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

مونھہ دیکھنے سے پہلے بھی کس دن وہ صاف تھے — بے وجہ کیوں غبار رکھیں آرسی سے ہم

ہے چھیڑ اختلاط بھی غیروں کے سامنے — ہنسنے کے بدلے روئیں نہ کیوں گدگدی سے ہم

وحشت ہے عشق پردہ نشیں میں دم بکا — مُنہ ڈھانکتے ہیں پردۂ چشم پری سے ہم

کیا دل کو لیگیا کوئی بیگانہ آشنا — کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں — مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم — دین

ہم معشوق کو ہنسی میں برق تبسم کہتے تھے - نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بُرا مان گیا اور مکدر ہو گیا اور جب تک ہم ابر کی طرح نہ روئے اُس کے دل کا غبار نہ نکلا - الفاظِ شعر کی خوبی واضح رہے -

ہم مرض عشق میں ضعف سے سوکھ کر کانٹا ہو گئے - اس پر بھی چونکہ کوچۂ معشوق میں غیر کی آمد و رفت تھی ہم غیر کے مقاصد کی راہ میں خار کی طرح حائل تھے - آخر معشوق نے اُس کی خاطر سے ہم کو اپنے کوچے سے نکال دیا - قاعدہ ہے کہ کانٹا راہ سے ہٹا دیتے ہیں -

ہم معشوق بلا وجہ آرسی سے کیوں کدورت رکھیں کہ اُس کی وجہ سے معشوق میں خود نمائی آگئی - وہ تو اُس آئینہ مُنہ دیکھنے سے پیشتر بھی ہم سے غبار رکھتا تھا - مُنہ دیکھنا - صاف - غبار - آرسی میں رعایت ہے -

محبوب اختلاط دکھلانے کے خیال سے رقیبوں کے سامنے عاشق کو گدگداتا ہے مگر غیور عاشق اس کو بھی ظلم سمجھتا ہے اور ہنسنے کے بدلے روتا ہے - عشق پردہ نشیں ہے - اسلئے دم گریہ مُنہ ڈھانکنے کی ضرورت ہوئی اور چونکہ وحشت ہے - اس وجہ سے پری کی آنکھ کا پردہ تلاش کیا - بیگانہ آشنا - وہ شخص جو غیروں کا دوست ہو کسی بیگانہ آشنا کے عشق کا یہ اثر ہے کہ ہمیں اپنے وجود ہی سے بیگانگی ہو گئی - بدعتی = وہ جو (دین میں) نئی بات نکالے - دل کو بدعتی اس لئے کہا کہ آرزو مومن کے نزدیک نئی بات ہے -

۱۱۳

جو[1] پہلے دن ہی سے دل کا کہا نہ کرتے ہم
تو اب یہ لوگوں کی باتیں سنا نہ کرتے ہم

اگر نہ ہاتھ میں اس دلربا کے دل دیتے
تو دل پہ ہاتھ سدا دھر لیا نہ کرتے ہم

اگر نہ دام میں زلفِ سیہ کے آجاتے
تو یوں خرابِ پریشاں رہا نہ کرتے ہم

اگر نہ لگتی چپ اُس بدگماں کی شوخی سے
تو بات بات میں مضطر ہوا نہ کرتے ہم

اگر جلاتے نہ اُس شعلہ رو کے عشق میں جی
تو سوزِ آتشِ غم سے جلا نہ کرتے ہم

نہ جاتے اُس بُتِ ہرجائی کی گلی میں اگر
تو دوڑے دوڑے قلق سے پھرا نہ کرتے ہم

اُس آفتِ دل و جاں پر اگر نہ مرجاتے
تو اپنے مرنے کی ہر دم دعا نہ کرتے ہم

نہ بھرتے دم جو کسی شعلہ رو کی خواہش کا
تو ٹھنڈی سانس ہمیشہ بھرا نہ کرتے ہم

اگر نہ آنکھ تغافل شعار سے لگتی
تو بیٹھے بیٹھے یہ یوں چونک اٹھا نہ کرتے ہم

نہ ہوش کھوتے اگر اُس پری کی باتوں پر
تو آپ ہی آپ یہ باتیں کیا نہ کرتے ہم

نہ کرتے اُس کی برنگِ حنا جو پابوسی
تو شکل برگ حنا یوں پسا نہ کرتے ہم

اگر نہ ہنسنا ہنسانا کسی کا بھا جاتا
تو بات بات پہ یوں رو دیا نہ کرتے ہم

نہ لگتی آنکھ تو دن رات سوتے ہی رہتے
کسی کی چاہ نہ کرتے تو کیا نہ کرتے ہم

اگر نہ دیکھتے وہ پیاری پیاری صورت آہ
تو ایک ایک کے مُنہ کو تکا نہ کرتے ہم

جو غم بتوں کا نہ ہوتا تری طرح مومن
تو دیکھ چرخ کو ہے ہے خدا نہ کرتے ہم

۱۱۴

اُلجھے[2] نہ زلف سے جو پریشانیوں میں ہم
کرتے ہیں اس پہ ناز اداؤں میں ہم

سرگرم[3] رقص تازہ ہیں قربانیوں میں ہم
شوخی سے کس کی آئے ہیں جولانیوں میں ہم

---

[1] پوری غزل قطعہ بند ہے۔
[2] عاشق اپنی اس ادا شناسی پر نازاں ہے کہ اسنے اپنی پریشانی کی حالت میں معشوق کی زلف کو چھیڑ کر برہم نہیں کیا۔ [3] معشوق کے ہاتھ سے ذبح ہو کر ہم تڑپ رہے ہیں جو ایک طرح کا رقص ہے۔ اسی رقصِ بسمل کو شاعر مصرع ثانی میں اپنی جولانی سے تعبیر کرتا ہے کہ دراصل شوخیِ یار کا کرشمہ ہے۔

ثابت[۱] ہے جرمِ شکوہ نہ ظاہر گناہ رشک	حیراں ہیں آپ اپنی پشیمانیوں میں ہم
مارے[۲] خوشی کے مر گئے صبحِ شبِ فراق	کتنے سُبک ہوئے ہیں گرانجانیوں میں ہم
آتا ہے خواب میں بھی تری زلف کا خیال	بے طور گھر گئے ہیں پریشانیوں میں ہم
دیکھا[۳] ادھر کو تو نے کہ بس دم نکل گیا	اُترے نظر سے اپنی نگہبانیوں میں ہم
اب[۴] قید سے اُمید رہائی نہیں رہی	ہمدرد پاسباں ہیں زندانیوں میں ہم
وردِ[۵] زباں ہیں اُس نگہِ سُرمگیں کے وصف	تلوار کر رہے ہیں صفاہانیوں میں ہم
آہوں[۶] نے اپنی بوالہوسوں کو رُلا دیا	ہیں رشکِ چشمِ یار فسوں خوانیوں میں ہم
وہ[۷] صید ناتواں ہیں کہ اس اضطراب پر	اُچھلے نہ آبِ تیغ کی طغیانیوں میں ہم
معمور[۸] اس قدر ہیں ترے وحشیوں سے دشت	گنتے ہیں شہریوں کو بیابانیوں میں ہم

۱؎ ہم ناکردہ پشیمان ہیں کیونکہ نہ ہم نے محبوب کا شکوہ کیا ہے نہ رقیب پر رشک کیا ہے اور یہی دو سبب عاشقی میں پشیمانی کے ہو سکتے تھے۔ ۲؎ شبِ فراق کے اختتام پر ہم کو اس قدر خوشی ہوئی کہ شادی مرگ ہو گئے۔ اس وجہ سے گرانجانیوں کے باوجود ہمیں نہایت سُبک (خفیف یا ذلیل) ہونا پڑا۔ سُبک ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہم گرانجانی سے شبِ فراق کی مصیبت تو جھیل گئے مگر صبح ہونے کی خوشی برداشت نہ کر سکے۔ ۳؎ ہم تیری نگاہ کی زد سے بچنے کے لئے اپنی حفاظتِ جان کے خیال سے آنکھیں چراتے تھے مگر تو نے ادھر ہماری طرف دیکھا اُدھر ہمارا دم نکل گیا۔ جس کے باعث اب ہم اپنی نظروں میں خفیف ہو گئے کیونکہ ہماری تمام نگہبانیاں بے سود ثابت ہوئیں۔

۴؎ ہماری قید کی کوئی میعاد نہیں۔ اسلئے قیدیوں میں ہم کو محافظِ محبس سے ہمدردی ہے کہ اُس غریب کو ہماری وجہ سے مدت العمر پاسبانی کی مصیبت جھیلنی پڑے گی۔

۵؎ محبوب کی نگاہ سرمگیں کی تعریف کو اہلِ اصفہان میں تلوار چلانے سے تشبیہ دی ہے۔ زبان، نگاہ، سرمہ، تلوار، صفاہانی میں رعایت ہے۔ اصفہان کی تلوار اور سرمہ مشہور ہیں۔ ۶؎ چشمِ یار کو تاثیر کے اعتبار سے فسوں خوانی (جادوگری) سے منسوب کیا جاتا ہے مگر ہم اُس سے بھی بڑھ گئے کیونکہ ہماری آہوں نے رقیبان بوالہوس کو بھی رلا دیا برخلاف چشمِ یار کے۔ جس کا جادو رقیبوں پر کبھی نہیں چلا۔ ۷؎ ہماری کمزوری کا یہ اثر ہے کہ اس بے تابی کے باوجود کبھی ہم آبِ تیغ کے طوفان میں نہ اُچھلے۔ تیغ کی آب (دھار) کی رعایت سے طغیان (طوفان) کا لفظ استعمال کیا ہے۔
۸؎ یعنی اب شہر کی آبادی ویرانی سے مبدل ہو گئی اور شہر پر بیابان کا دھوکا ہوتا ہے۔

پیشِ نظر ہے کس کا رُخ آئینہ گداز[۱۱]
کھا کھا کے زخم سوئے نمک زار پر دریغ[۱۲]

روتے ہیں اپنے حال پہ حیرانیوں میں ہم
کھو بیٹھے اپنی جان تن آسانیوں میں ہم

مومن حسد سے کرتے ہیں سامان جہاد کا[۱۳]
ترسا صنم کو دیکھ کے نصرانیوں میں ہم

۱۱۵

دل آگ ہے اور لگائیں گے ہم[۱]
کیا جانے کسے جلائیں گے ہم

وادی میں جو اپنی آئیں گے ہم
کیا قیس کی خاک اُڑائیں گے ہم

اب گریہ میں ڈوب جائیں گے ہم
یوں آتشِ دل بجھائیں گے ہم

خنجر تو نہ توڑ سخت جانی
پھر کس کو گلے لگائیں گے ہم

گر غیر سے ہے یہ رنگ صحبت
تو اور ہی رنگ لائیں گے ہم

تو بخت عدو اجل فلک دل
کِس کِس کے ستم اٹھائیں گے ہم

اے پردہ نشیں نہ چھپ کہ تجھ سے
پھر دل بھی یوں ہی چھپائیں گے ہم

بھیجیں گے عدو کے ہاتھ پیغام
حال دل اُسے جتائیں گے ہم

مت لال کر آنکھ اشک خوں پہ
دیکھ اپنا لہو بہائیں گے ہم

دشمن کے کہے سے روٹھتا ہے[۲]
وہ ہی کہے تو منائیں گے ہم

[۱۱] رخ کو آئینہ گداز اسلئے کہا ہے کہ اُسکی تابش سے آئینہ پگھل جاتا ہے۔ [۱۲] نمک زار = نمک کی سرزمین تن آسانی = آرام طلبی۔ سونے کو تن آسانی کہا ہے اور چونکہ زخم کھا کر نمک زار پر سو گئے تھے اسلئے شدّت اذیت کے باعث جان کھو بیٹھے۔ [۱۳] جہاد سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ معشوق مسیح پرست (ترسا) کو مسیحیوں کے قابو سے نکال لائیں۔ [۱] اس غزل میں بیشتر اور غزل مابعد میں تمامتر واسوخت کا رنگ ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا دل آگ ہے اور جب ہم دل لگائیں گے تو گویا آگ لگائیں گے۔ دیکھئے کون کون اس آگ کی لپیٹ میں آئے۔
[۲] عاشق کے جذبۂ رشک کو شکایت ہے کہ معشوق ہم سے ناراض بھی ہوتا ہے تو رقیب کے اغوا سے اور کہتا ہے کہ اگر یہی بات ہے تو اب ہم بھی اس وقت منائیں گے جب کہ رقیب ہم سے منانے کے لئے کہے گا اور ظاہر ہے کہ رقیب کیوں کہنے لگا۔ مراد یہ ہے کہ ہم بھی کبھی نہ منائیں گے۔

کترا[۳] ہے جو گوشۂ سرِ خط — مطلب ہے کہ سر اڑائیں گے ہم
ٹھہرو کوئی دم کہ جان ٹھہرے — مت جاؤ کہ جی سے جائیں گے ہم
دَم[۴] دیتے تو ہو پہ یہ سمجھ لو — دشمن کی قسم دلائیں گے ہم
کیوں غش ہوئے دیکھ آئنہ کو — کہتے تھے کہ تاب لائیں گے ہم
دزدیدہ[۵] نظر ہے کیوں دمِ قتل — کیا مرنے سے جی چرائیں گے ہم
گر[۶] ہے دلِ غیر نقش تسخیر — تو تیرے لئے جلائیں گے ہم
آئینۂ[۷] رنگ غم نے توڑا — کیونکر اُسے مُنہ دکھائیں گے ہم
کیا پوچھے ہے رکھ تو دیکھ دشمنہ — اپنی — آپ ہی گردن جھکائیں گے ہم

کہہ اور غزل بطرز واسوخت
مومن یہ اُسے سُنائیں گے ہم

۱۱۶

اب اور سے لو لگائیں گے ہم — جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم
برباد نہ جائے گی کدورت — کیا کیا تری خاک اُڑائیں گے ہم

۳؎ قاعدہ ہے کہ جب خط میں کوئی خبرِ بد ہوتی ہے تو اُسکا کنارہ کتر دیتے ہیں۔ ۴؎ اگر ہم نے تمھیں دشمن کی قسم دلائی تو اُس صورت میں تمھیں سچ سچ بتانا پڑے گا۔ ۵؎ تم مجھے قتل کرتے وقت اسلئے دزدیدہ نظر سے دیکھ رہے ہو کہ یہ (عاشق) قتل سے جھجکتا تو نہیں۔ مگر یہ خیال بے اصل ہے۔ ۶؎ نقش تسخیر = وہ نقش جس کے ذریعہ سے کسی کو مطیع کرتے ہیں۔ قاعدہ ہے کہ نقش کو اکثر کسی مراد کے لئے جلایا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر غیر کا دل بالفرض نقش تسخیر بھی ہے تو بھی تیرے حصول کی غرض سے ہم اُس کو جلائیں گے۔ جلانے کے لفظ میں ایہام ہے۔ دلِ غیر کو نقش تسخیر اس بنا پر کہا ہے کہ معشوق اُسکا مطیع ہے۔ ۷؎ غمِ عشق یا غمِ ہجر نے ہمارے رنگ رخ کے آئینہ کو توڑ دیا۔ اس صورت میں ہم معشوق کو کیونکر مُنہ دکھلائیں گے کیونکہ وہ اُلٹا ناراض ہوگا۔ رنگ رُخ دیکھا جاتا ہے اسلئے اُسے آئینہ سے تشبیہ دی ہے۔ توڑنے سے مُراد یہاں یہ ہے کہ غم نے ہمارا رنگ رخ متغیر کر دیا۔ مُنہ دکھانے کے لفظ میں ایہام ہے

سر دوش عدو پہ رکھ کے بیٹھے / جانا نہ کہ سر اٹھائیں گے ہم

بگڑے تو کریں گے اور سے صلح / تجھپر بھی بُری بنائیں گے ہم

دل دے کے اک اور لالہ رو کو / ہر داغ پہ داغ کھائیں گے ہم

لب[1] کا ترے دعویٔ مسیحی / مر اور پہ آزمائیں گے ہم

گر[2] خواب میں بھی اُدھر کو دیکھا / آنکھیں مژہ کو دکھائیں گے ہم

گر تیری طرف کو بیقراری / کھینچے گی تو لوٹ جائیں گے ہم

گر[3] دیکھ کے ہنس دیا ہمیں تو / مُنہ پھیر کے مُسکرائیں گے ہم

کیا ذکر ہے ہونٹ چاٹنے کا / کچھ اور مزہ چکھائیں گے ہم

پھر تیری ہوا کا دم بھرا تو / جی ہی کو ہوا بتائیں گے ہم

گر خواب میں آن کر جگا یا / سوتے مُردے جگائیں گے ہم

آتا[4] ہے گلے سے دھیان تیرے / خاطر میں ستم نہ لائیں گے ہم

بتخانۂ[5] چیں ہو گر ترا گھر
مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

[1] ہم کسی دوسرے حسین پر مر کر تیرے لب کا دعوائے مسیحائی آزمائیں گے یعنی دیکھیں گے کہ تُو اُس وقت ہمیں جِلاتا ہے یا نہیں اور اپنے دعوے میں صادق ہے یا کاذب۔ یہ مُراد بھی ہو سکتی ہے کہ تجھے دعویٰ ہے کہ عاشق کی زندگی محض میرے لب جاں بخش کی بدولت ہے۔ اب ہم اس دعوے کی تکذیب کی غرض سے دوسرے پر مرینگے (عاشق ہونگے)۔ [2] اگر ہمارے مژہ (پلک) نے خواب میں بھی تیری طرف دیکھا تو ہم اُس کو آنکھیں دکھائینگے یعنی اظہار ناراضی کرینگے۔ [3] یہاں معشوق کے ہنسنے سے اظہار اختلاط اور اپنے مُنہ پھیر کے مسکرانے سے اظہار حقارت مراد ہے۔ [4] تیرے گذشتہ مظالم کی شکایت کرنے سے تیرا تصور دل میں آجاتا ہے۔ لہذا تیرے تصور کو دل سے بھلانے کی غرض سے ہم تیرے مظالم کا خیال ہی کرنا چھوڑ دینگے۔ [5] بتخانہ چین کی تخصیص اسلئے کی ہے کہ چین کی صنعت نقاشی بہت جمیل ہوتی ہے۔

ردیف النون

۱۱۷

صفحۂ جیحوں پر جو کبھی ہم سوزشِ دل لکھواتے ہیں[1]
سارے حباب لبِ دریا تبخالے سے بنجاتے ہیں

آ چکے کل تم جھوٹ ہے ایسی باتوں میں ہم کب آتے ہیں
اُس سے کہو جو تم کو نہ جانے آپ کسے فرماتے ہیں

پھرتے ہیں سو وسوسے جی میں دل میں سودے آتے ہیں
کوٹھے پر وہ دھوپ میں اپنے بال کھڑے سکھلاتے ہیں

سوزشِ دل جب کہتے ہیں تب آنسو وہ بھر لاتے ہیں
موم کے مانند آتشِ غم سے پتھر کو پگھلاتے ہیں

آب و ہوائے ملکِ محبت اس نہیں ہے ہم کو تو
ہوتے ہیں لاغر اور زیادہ جتنا ہم غم کھاتے ہیں

کس کی خبر اب آنے کی ہے کس لئے ہے یہ بیتابی
کس لئے ہم ہیں ہر دم پھرتے آتے ہیں اور جاتے ہیں

شکوہ کیا بیدادگری کا کیجے اس سے دیکھو تو
دیکھے ہے ظالم خنجر جب ہم زخمِ جگر دکھلاتے ہیں

اُف ری کثرتِ اشک و تبسم لب پہ ہجومِ یاس و امید
جی ہے دھڑکتا بات کی اُسکے فال تو ہم کھلواتے ہیں

خطِ غلامی لکھدے نے غیرت تو بھی گلہ کیا لکھیے اب[2]
چھیڑ تو دیکھو میرا خط وہ غیروں سے پڑھواتے ہیں

ہوش گئے یاں دل سے پہلے ہووے سمجھ تو سمجھیں بات
یہ تو سمجھئے حضرتِ ناصح آپ کسے سمجھاتے ہیں

ق

کیا کہیں تم سے لے ہمدرد و پوچھو مستِ شانِ چمن
کیونکر یاں ایامِ خزاں اور ہجر کے دن کٹ جاتے ہیں

کنجِ قفس میں بیٹھ کے گاہے روتے ہیں تنہائی پر
یاد سیرِ موسمِ گل سے گاہے جی بہلاتے ہیں

---

[1] ہمارے دل کی جلن اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ جب ہم اُس کا حال دریائے جیحوں کے صفحے پر لکھواتے ہیں تو سوزش کے اثر سے حبابوں میں تبخالوں کی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دریا کو شکل کے لحاظ سے صفحے سے تشبیہ دی ہے۔ تبخالہ = چھالا جو تپ کی گرمی سے ہونٹ پر پڑ جاتا ہے۔

[2] اگر غیرت ہمیں خطِ غلامی بھی لکھ دے (یعنی اگر ہمارا جذبۂ رشک کارفرما نہ ہو) تو بھی معشوق کو شکایت لکھنا بیکار۔ کیونکہ وہ ہمارا خط رقیبوں سے پڑھواتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ہمارے راز سے آگاہ ہو جائیں گے شکایت سے مراد اس امر کی شکایت ہے کہ ہمارا خط دوسروں سے کیوں پڑھوایا اور ظاہر ہے کہ یہ شکایت بھی وہ رقیبوں ہی سے پڑھوائے گا۔

	ق	
شام سے اپنے سو رہے وہ تو اور ہم اُنکے کوچے میں	ق	ولولہ ہائے شوق سے کیا کیا پھرتے ہیں گھبراتے ہیں
کرتے ہیں آواز زفیری[۵۰] دیتے ہیں دستک سو سو بار		گھر میں پتھر پھینکتے ہیں زنجیر در کھٹکاتے ہیں

کیا کسی بُت کے دل میں جگہ کی کوئی ٹھکانا اور ملا
حضرت مومن اب تمھیں کچھ ہم مسجد میں کم پاتے ہیں

	۱۱۸	
عشق نے یہ کیا خراب ہمیں	۱۱۸	کہ ہے اپنے سے اجتناب ہمیں
بسکہ پردہ نشیں پہ مرتے ہیں		موت سے آئے ہے حجاب ہمیں
کیسی[۵۱] حیرت سے اے شباک روحی		دیکھے ہے دیدۂ حباب ہمیں
شب فرقت میں خاک جھپکے آنکھ		یاد ہے چشم نیمخواب ہمیں
وہ[۵۲] جفاکش ہیں اے فلک کہ کیا		اُس ستمگر نے انتخاب ہمیں
دم رُکے ہے بہشت میں تو کوئی		اُسکے گھر سے چلو شتاب ہمیں
غیر سے ہے وہ گرم صحبت مے		کیوں نہ غیرت کرے کباب ہمیں
کس[۵۳] کی زلفوں کی بو نسیم میں تھی		ہے بلا آج پیچ و تاب ہمیں
غیر[۵۴] کے واسطے نہ ہو بیتاب		طعنہ دیتا ہے اضطراب ہمیں
اب کوئی کیا کرے علاج افسوس		موت نے بھی دیا جواب ہمیں

اے تپ ہجر دیکھ مومن ہیں
ہے حرام آگ کا عذاب ہمیں

۵۰ زفیری اصلاً زفیر ہے جسکے معنی ہیں اول دم اندر کو کھینچنا پھر بلند کرنا جیسے سیٹی کی آواز۔

۵۱ شباک روحی = بے تعلقی و تجرد۔ ہماری بے تعلقی اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ حباب جو خود ہستی سے بے تعلقی رکھتا ہے ہمیں حیرت سے دیکھتا ہے۔ حباب کو شکل کے لحاظ سے دیدہ سے تشبیہ دیجاتی ہے۔

۵۲ یعنی جب ہم اُس (معشوق) کے ستم اُٹھاتے ہیں تو پھر تیرے ستم کی کیا حقیقت ہے۔

۵۳ یعنی نسیم سے فرحت کے بجائے اُلٹا پیچ و تاب ہوتا ہے۔ ۵۴ ہمارا اضطراب ہمیں بے اثری کے طعنے دیتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ معشوق غیر کی یاد میں بیتاب ہو جسکے باعث ہماری یہ کیفیت ہو گئی ہے۔ اگر "نہ ہو" کو صیغۂ نہی مانیں اور معشوق کو مخاطب ٹھہرائیں تو بھی معنے درست ہو سکتے ہیں۔

۱۱۹

لاش[1] پر آنے کی شہرت شبِ غم دیتے ہیں
اے پری ہم ملک الموت کو دم دیتے ہیں

دھیان آتا ہے تری مُنہ میں زباں لینے کا
جی ہم اے شوخ پہ سیرِ عدم[2] دیتے ہیں

کر دیا خانۂ[3] اغیار ہوسناک خراب
داد رونے کی مرے دیدۂ نم دیتے ہیں

مر گئے[4] رشک سے ہم تو کہ وہ دشمن کو خطاب
خط ترسائی پہ اعجاز رقم دیتے ہیں

سبزۂ[5] پشتِ لب یار دلاتے ہیں یاد
گھول کر شہد میں دشمن مجھے سم دیتے ہیں

دم[6] نہ لے اے اثرِ آہ کہ معلوم ہوا
جن پہ دم دیتے ہیں ہم وہ ہمیں دم دیتے ہیں

کیا دوا سے ہو تری رنجشِ ہر دم کا علاج
چارہ گر کیوں مجھے رنج پہ ہم دیتے ہیں

کیا پڑی[7] رہتی ہے اے پردہ نشیں جوں بیمار
بد دعائیں تری چلون کو جو ہم دیتے ہیں

لذتِ[8] جور کشی نے مجھے شرمندہ کیا
طعنے کیا کیا اُسے اربابِ ستم دیتے ہیں

مدعا یہ ہے کہ غیرت سے میں سم کھا جاؤں
اس لئے غیر کو وہ اپنی قسم دیتے ہیں

---

[1] ہم نے شبِ ہجر کی اذیت سے تنگ آکر غلط طور پر مشہور کر رکھا ہے کہ ہمارے مرنے کے بعد محبوب ہماری لاش پر آئے گا۔ اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم ملک الموت کو دھوکا دیں تاکہ وہ یہ سمجھ کر کہ مرنے پر شاعر کے محبوب کی آمد موقوف ہے۔ ہم پر ترس کھائیں اور جلد ہماری روح قبض کر کے ہجر کی سختی سے نجات دیں۔ دم کے لفظ میں ایہام ہے۔ [2] منہ کی رعایت سے عدم کا لفظ لطف دے رہا ہے۔ [3] شاعر اپنی چشم گریاں کے طوفان کا شکر گزار ہے کہ اُس کی وجہ سے رقیبوں کے گھر بیٹھ گئے۔ یعنی اُنکے دعاوی محبت باطل ہو گئے۔

[4] خط ترسا = عیسائیوں کی تحریر جو بہت پُر پیچ ہوتی ہے۔ لاطینی رسم الخط۔ اعجاز رقم کا خطاب خوشنویسوں کو دیا جاتا ہے۔ [5] سبزۂ لب یار یاد دلانے کو شہد میں زہر ملانے سے تشبیہ دی۔ سبزہ کی مشابہت زہر سے اور لب کی شہد سے ظاہر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رقیبوں کا ظاہری التفات بھی میرے لئے باطن میں سم قاتل ہے۔ [6] شعر میں پہلا دم سانس یا وقفہ کے معنی میں آیا ہے۔ دوسرا جان کے اور تیسرا فریب کے۔ مراد یہ ہے کہ اے اثر آہ کمی نہ کر۔ [7] پڑی رہتی ہے کے الفاظ سے شاعر نے خاص فائدہ لیا ہے۔ [8] میں اپنی لذت ستم کشی کے باعث خجل ہوں کیونکہ اُسکی وجہ سے تمام اہل ستم (دوسرے حسین معشوق) کو طعنے دیتے ہیں کہ تم کو ظلم کرنا بھی نہیں آتا ورنہ عاشق ظلم سے اس قدر لطف اندوز کیوں ہوتا۔

۱۲۰

اہل[۹] بازار محبت کا بھی کیا سودا ہے — عشرتِ عمرِ ابد قیمتِ غم دیتے ہیں
خوں[۱۰] بہا قاتلِ بیدرد سے مانگا کس نے — کہ فرشتے مجھے یاں داغ درم دیتے ہیں

کعبہ[۱۱] کا دھیان نہ ہو حضرتِ مومن کو کہ جان
حسرتوں سے پسِ دیوارِ صنم دیتے ہیں

۱۲۱

ناصحِ ناداں یہ دانائی نہیں — دل کو سمجھاؤں میں سودائی نہیں
کس توقع پر اُمیدِ وصل اب — طاقتِ صبر و شکیبائی نہیں
دعوئے[۱۲] حُسنِ جہاں سوز اس قدر — پھر کہو گے تم میں ہرجائی نہیں
دیکھ[۱۳] مضطر کیوں نہ پھیرے دشنہ پھر — یار ہے وہ کچھ تماشائی نہیں
گر[۱۴] نہیں ملتے ملوں گا اور سے — کیوں مجھے کیا پاسِ رسوائی نہیں
ہے دعا بھی بے اثر گویا کہیں — عرضِ عاشق کی پذیرائی نہیں
دردِ دل تو سن لے ظالم ایک بار — گو دماغِ چارہ فرمائی نہیں

۹ اہلِ محبت کی تجارت بھی خوب ہے کہ عمرِ جاوداں کا عیش دیکر غمِ عشق خریدتے ہیں۔ ۱۰ مرنے کے بعد فرشتے میرے جسم کو درم گرم کرکے داغتے ہیں نہ معلوم میرے وارثوں میں سے کس نے قاتل سے میرا خون بہا طلب کیا جس کی وجہ سے مجھے یہ سزا دی جا رہی ہے۔ مراد یہ ہے کہ مجھے قتل کرنا قاتل کا کرم ہے نہ کہ ستم۔ جس پر خوں بہا طلب کیا جائے۔

۱۱ مومن حسرت سے دیوارِ صنم کے پیچھے جان دے رہے ہیں۔ کہیں کعبہ کی یاد میں تو یہ اُفتاد نہ پڑی ہو۔

۱۲ معشوق نے دعویٰ کیا کہ میرے حُسن نے ایک جہان میں آگ لگا دی ہے۔ عاشق جواب دیتا ہے کہ اس سے تمہارا ہرجائی ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ ہرجائی نہ ہوتے تو ہر جگہ آگ نہ لگی ہوتی۔

۱۳ معشوق مجھے بیتاب دیکھ کر کیوں قتل نہ کرے۔ آخر یار ہے کچھ تماشائی تو نہیں جو بیتابی کا تماشا دیکھتا رہے اس شعر میں بے پناہ طنز ہے۔

۱۴ تم اگر پاسِ رسوائی سے مجھ سے نہیں ملتے تو میں کسی اور سے ملوں گا۔ کیا مجھے اپنی رسوائی کا خیال نہیں۔ درصورت دیگر لوگ طعنے دینگے کہ کسی (معشوق) نے مومن کو ملنے کے قابل نہ سمجھا۔

چاہتا قاتل کو ہوں روزِ جزا ۔ ۱۲۰ ۔ چاہ کی اب تک سزا پائی نہیں

ترک؎ مذہب کیوں کروں مومن میں کیا
اُس صنم کو لاف یکتائی نہیں

۱۲۱

کہے ہے چھیڑنے کو میرے گر سب ہوں مرے بس میں ۔ نہ دوں ملنے کسی معشوق اور عاشق کو آپس میں

اگر مشہور۱؎ ہوا افسانہ اپنی بُت پرستی کا ۔ برہمن کیا عجب ایمان لے آئیں بنارس میں

نہیں دم لینے کی طاقت فلاک ورنہ بتا دیتے ۔ کہ یہ تاثیر ہوتی ہے فغانِ آسماں رس میں

تنِ کاہیدہ سے اپنے میں خوش ہوں اس توقع پر ۔ کہ اک دن آئے تیرے صرف عشرت خانۂ خس میں

رقیبِ بوالہوس نے رونمایں تیرے کب جاں دی ۔ وہ نو وارد ہے کیا جانے دیارِ عشق کی رسمیں

نہ میں اپنا نہ دل اپنا نہ تم میرے نہ جاں میری ۔ اثر کس کس کو ہو ہووے بھی گر فریادِ بیکس میں

کہوں گر غیر سے مت مل تو کہوے طعن سے ترک کر ۔ یہ کیوں کس واسطے ہم ایسے تیرے ہوگئے بس میں

ذرا سمجھو۲؎ تو جانِ من وصالِ غیر پر ہر دم ۔ مری جاں کون ہے یہ کس کی جھوٹی کھا رہے قسمیں

درِ بتخانۂ عشقِ بتاں اور آپ اے مومن
یہ حضرت آگئی آلبار کیا طبعِ مقدس میں

؎ ظاہر ہے کہ جس میں شانِ یکتائی ہوگی وہ ضرور بے نیازی کریگا۔ مومن کہتا ہے کہ میں خدا کی بے نیازی سے تنگ آکر ترک اسلام کیوں کروں۔ اُس بُت کو بھی تو دعوائے یکتائی ہے۔ اُس نے بھی بے رُخی برتی تو پھر نہ دنیا ملے گی نہ دیں۔

۱؎ کیا عجب کہ میری بت پرستی کا افسانہ سُنکر بنارس کے برہمن بھی معتقد ہو جائیں۔ یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ بت پرستی میں میں نے جو مصائب اُٹھائے ہیں اُن کو سُنکر شاید برہمن بھی بت پرستی ترک کردیں اور اسلام قبول کرلیں۔

۲؎ تم مجھ سے کہتے ہو کہ تمھاری جان کی قسم۔ وصال غیر کی خبر غلط ہے" اور یہ خیال نہیں کرتے کہ عاشق کی جان تمھارے سوا کون ہے۔ پھر اُس کی جھوٹی قسمیں کھانا کس قدر بدفالی ہے۔

۱۲۲

چین آتا ہی نہیں سوتے ہیں جس پہلو ہمیں
اضطراب دل غرض بیٹھنے نہ دیگا تو ہمیں

لطف سے ہوتی ہے کیا کیا بیقراری بن جفا [۱]
تیری بدخوئی نے ظالم کردیا بدخو ہمیں

دیکھتے ہی گُل نظر میں تیرا ہنسنا پھر گیا
آتشِ گُل نے لگائی آگ لے گلرو ہمیں

کیا اثر تھا اشک دشمن میں جو کوئے یار سے [۲]
مارے غیرت کے بہا کرلے چلے آنسو ہمیں

دودِ شمعِ بزم نے دل پھونک کر اُف کردیا [۳]
کیا دلائی یاد وہ زلفِ خمیدہ مو ہمیں

گیسو و خال و خط اپنا دین و ایماں لے گئے
مل کے اک دو کافروں نے کردیا ہندو ہمیں

ہوش کیوں جاتے رہے اور دم ہوا کیوں ہو چلا
تجھ سے اے بادِ صبا آئی یہ کس کی بو ہمیں

کیا بلا اُس زلف خوش خم کا تصور بندھ گیا
سانپ سے دن رات آتے ہیں نظر ہر سو ہمیں

وہم آتا ہے فغانِ ہجر کوئے یار کا [۴]
صور اسرافیل ہے قمری تری کوکو ہمیں

باعثِ بیتابی عالم نگاہِ یاس ہے [۵]
چشم جادو گر نے یہ سکھلا دیا جادو ہمیں

قیس شوخ اک نکہ دعویٰ ملک وحشت کا کرے [۶]
مہر محضر ہوگیا نقش سُمِ آہو ہمیں

گر یہی شوقِ شہادت ہے تو مومن جی چکے [۷]
مار ڈالے کاش کوئی کافرِ دلجو ہمیں

---

۱ تو نے ہم پر اس قدر ظلم کئے کہ اب ظلم سہنے کی خو ہوگئی اور لطف ناگوار ہونے لگا۔ تو بدخو (ستمگر) تھا ہی۔ ہمیں بھی تو نے بدخو (خوگرِ ستم) کردیا۔ ۲ دشمن معشوق کے سامنے اظہار محبت کے خیال سے رویا ہمیں اس پر غیرت سے رونا آیا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے آنسو ہمیں کوئے یار سے بہا کر لے چلے۔ یہ سب گریۂ دشمن کا اثر تھا۔ ۳ شمع بزم کا دھواں دیکھا تو ہمیں محبوب کی زلف پر خم یاد آئی اور دل جلکر خاک ہوگیا۔ ۴ قمری کوکو کرتی ہے اور مجھے وہم آتا ہے کہ کوئے یار کی جدائی میں فریاد نہ کر رہی ہو۔ اس بنا پر قمری کی آواز میرے حق میں صور اسرافیل کا اثر رکھتی ہے جس کو قیامت میں سُنکر دنیا فنا ہوجائے گی۔ ۵ محبوب کی چشم سحر فن نے ہمیں بھی یہ سحر سکھا دیا کہ ہماری نگاہ یاس دیکھکر ایک جہان بیچین ہے۔ ۶ قیس اب ہمارے مقابلے میں ملک وحشت کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ کیونکہ دشت میں جہاں جہاں سُم آہو کا نقش ہے وہ دراصل ہماری حکومت کی تصدیق کے لئے مہر محضر کا حکم رکھتا ہے۔ یعنی اصلاً ہم ملک جنون کے بادشاہ ہیں۔ قیس نہیں ہوسکتا سُم کے نقش کو مُہر سے تشبیہ دی ہے۔ ۷ کاش کوئی کافر ہمیں مار ڈالے کہ درجۂ شہادت حاصل ہو ورنہ ڈر یہ ہے کہ یہ شوق شہادت خود ایک روز ہمیں مار رکھے گا۔

۱۲۳

ہوگئی گھر میں خبر ہے منع واں جانا ہمیں — وہ بھی رسوا ہو خدا جس نے کیا رسوا ہمیں

دمبدم رونا ہمیں چاروں طرف تکنا ہمیں — یا کہیں عاشق ہوئے یا ہوگیا سودا ہمیں

ستم[۱] صیاد کا کیا التفات آمیز تھا — بند کرنے کو قفس میں دام سے چھوڑا ہمیں

یار تھے[۲] یا دشمنِ جان تھے الٰہی چارہ گر — لیچلے مرتے ہی زنداں سے سوئے صحرا ہمیں

طالعِ[۳] برگشتہ بختِ خفتہ مت پوچھو کہ ہم — غش پڑے تھے پھر گیا وہ جان کر سوتا ہمیں

تو نہ جانے عشق بازی اور ہم ناداں ہوں — بے سمجھ کہتا ہے ناصح تو نے کیا سمجھا ہمیں

یہ ستم کیا[۴] غیر پر کرتا وہ سچ پوچھو تو ہے — یار کے نازِ بجا سے شکوۂ بیجا ہمیں

کیا کہیں کیوں رہ گئے حیران تجھکو دیکھکر — آگیا دل یاد اے آئینہ رو اپنا ہمیں

دست[۵] بوسی پر کرو ہاں قتل اپنے ہاتھ سے — سچ تو کہتے ہیں قبول انصاف غیروں کا ہمیں

---

[۱] صیاد نے ہمیں جال سے رہا کیا مگر محض اس لئے کہ پھر پنجرے میں بند کر دے گو یا اُس نے ستم تو کیا لیکن اُس میں التفات کی آمیزش تھی - اس میں ندرت یہ ہے کہ صیاد سے جُدائی کی بنا پر رہائی کو ستم اور اُس کے برعکس قید قفس کو التفات قرار دیا ہے -
[۲] لوگ مرتے ہی ہمیں زنداں سے دفن کے لئے صحرا کو لیچلے - نہ معلوم چارہ گروں کو جنھوں نے ہمیں اسیر زنداں کیا تھا دوست کہا جائے (کہ اُنکی بدولت مرکر تو صحرائے جنوں نصیب ہوا) یا دشمن (اسلئے کہ انکی قید ستم نے آخر جان لے لی)
[۳] پھر جانے کی رعایت سے طالع برگشتہ اور سونے کی مناسبت سے بخت خفتہ استعمال کیا ہے
[۴] ہم یار کے ناز بجا کی ناحق شکایت کرتے ہیں اس واسطے کہ یہ ستم (یا ناز) ہم پر نہ کرتا - تو کیا بوالہوس پر کرتا جو دراصل ناز اُٹھانے کا اہل نہیں - ناز یار کو بجا اسلئے کہا کہ اُس کا مورد عاشق ہی ہے جو دراصل ناز (یا ستم) کا محل صحیح ہے -
[۵] عاشق نے معشوق کے ہاتھ چومے جس پر رقیبوں نے معشوق کو رائے دی کہ اس بے ادب کو انھیں ہاتھوں سے قتل کرنا چاہئے - عاشق کہتا ہے کہ مجھے رقیبوں کا یہ فیصلہ قبول ہے - اصلاً اُنھوں نے یہ رائے دُشمنی سے دی مگر عاشق کے مفید مطلب پڑی -

اہلِ ماتم[۱] اپنے روئیں کس طرح منہ ڈھانک کر
مرتے مرتے پاس اس پردہ نشیں کا تھا ہمیں

ہم سے[۲] نازک طبع سے کب اٹھ سکے بیدادِ چرخ
مرگئے مضمون جورِ یار جوں سوجھا ہمیں

مومن ان کا تو نہ تھا ملنے میں آخر اختیار
یہ شکایت بھی خدا سے ہے بتوں سے کیا ہمیں

۱۲۶

غیر سے[۳] بے مروت ہے آنکھ وہ دکھا دیکھیں
زہرِ چشم دکھلائیں پھر ذرا مزا دیکھیں

کب تلک جلیں یارب ہجر[۴] غیرت مر میں
صبح اٹھ کے منہ کب تک آفتاب کا دیکھیں

ناصح ان کو گر میری شکل سے تنفر ہے
تو بھی کم نگاہی کیوں جانبِ وفا دیکھیں

کچھ نہیں نظر آتا آنکھ لگتے ہی ناصح
گر نہیں یقیں حضرت آپ بھی لگا دیکھیں

غیر کو دکھاتا ہوں چاکِ دل تماشا ہو
گر وہ روزنِ در سے آن کر ذرا دیکھیں

چشمِ وا نے نابینا کر دیا جدائی میں
کوئی آنکھ لگتی ہے خوابِ وصل کیا دیکھیں

دیکھئے خدا کب تک پھر وہ دن دکھائیگا
یار کو ان آنکھوں سے غیر پر خفا دیکھیں

ٹکٹکی لگائی ہے اب تو اس توقع پر
تا وہ گر ادھر دیکھیں مجھکو دیکھتا دیکھیں

[۱] میت پر منہ ڈھانک کر رونے کا رواج ہے اور ظاہر ہے کہ رونے میں پردہ نشیں کا راز افشا ہو جائے گا۔ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ نوحہ گروں کے منہ ڈھانکنے سے تاڑنے والے تاڑ جائیں گے کہ عاشق کسی پردہ نشین کے غم میں مرا ہے۔ [۲] نزاکتِ طبع کی حد ہوگئی کہ جب شعر میں باندھنے کے لئے ہمیں جورِ یار کا مضمون سوجھا تو محض اس تصور کے صدمہ سے ہلاک ہوگئے۔ جب ہماری نازکی کا یہ عالم ہے تو بیدادِ چرخ کیونکر اٹھتی۔
[۳] آنکھ دکھانا = ناراض ہونا۔ زہرِ چشم = نگاہِ غضب۔ [۴] ہجر میں انتظار کی بدولت عاشق کی آنکھیں کھلے کھلے بصارت سے معذور ہوگئیں۔ اس کی نبی توجیہ یوں کرتا ہے کہ انتظار میں آنکھ تو لگتی نہیں۔ اور جب آنکھ نہیں لگتی تو خوابِ وصل کیونکر نظر آئے۔ اور جس کو کوئی چیز نظر نہ آئے (وہ خواب ہی کیوں نہ ہو) وہ لازماً نابینا ہی کہلائے گا۔ اس میں ندرت یہ ہے کہ چشمِ بند کی بجائے چشمِ وا کی طرف نابینائی کو منسوب کیا گیا۔

کس نے اور کو دیکھا کس کی آنکھ جھپکی ہے ۔۔۔ دیکھنا ادھر آؤ پھر نظر ملا دیکھیں

وہم؎۱ عاشقی سے تو یہ ستم نہ کرتا ہو ۔۔۔ کیوں نگاہ حسرت سے چرخ کو سدا دیکھیں

نکلے آرزو اپنی مومن آہ جب تجھکو
صحن بتکدہ میں ہم خاک پڑا دیکھیں

۱۲۸

بزم میں اُسکی بیانِ دردِ غم کیونکر کریں ۔۔۔ وہ خفا جس بات سے ہوویں وہ ہم کیونکر کریں

مجھ پہ بعدِ امتحاں بھی جورِ کم کیونکر کریں ۔۔۔ وہ ستائیں غیر کو ایسا ستم کیونکر کریں

لکھتے؎۲ لکھتے ہی سیاہی حرف سے اُڑ جائے ہے ۔۔۔ ہائے احوالِ دلِ مضطر رقم کیونکر کریں

گر نگاہ؎۳ ناز کو مشقِ ستم منظور ہے ۔۔۔ دشمن اپنی نرگسِ تربت قلم کیونکر کریں

دیکھ لیوے؎۴ عکس رُخ تو کیا بنے پھر دیکھیو تو ۔۔۔ گریہ اُسکے سامنے اے چشم نم کیونکر کریں

؎۱ قاعدہ ہے کہ مایوسی میں آسمان کی طرف دیکھتے ہیں شاعر کی مُراد یہ ہے کہ ہم آسمان کی طرف نگاہ حسرت سے کیوں دیکھیں۔ کہیں آسمان یہ سمجھکر ہمپر ظلم نہ کرتا ہو کہ یہ مجھپر عاشق ہے جو یوں باربار دیکھتا ہے۔

؎۲ دل کی بے تابی کا یہ اثر ہے کہ احوال لکھنے میں سیاہی حرفوں سے اُڑی جاتی ہے۔

؎۳ قاعدہ تھا کہ تیراندازی کی مشق کے لئے تودے پر نرگس کا پھول نصب کرکے نشانہ لگاتے تھے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر معشوق کی نگاہ ناز کو مشقِ ستم منظور ہے تو رقیب میری قبر کی نرگس کو اس غرض سے کیوں قلم کرنے لگے۔ اس لئے کہ اُنکو میری جانب معشوق کا اس قدر التفات بھی گوارا نہیں۔

؎۴ اے چشم نم ہم معشوق کے روبرو کیونکر روئیں۔ خوف یہ ہے کہ اگر وہ ہمارے آب اشک میں اپنے چہرہ کا عکس دیکھ لے تو نجانے ہمپر کیا بنے۔ یعنی اُس کو غرور حُسن کے ساتھ شوقِ جفا اور زیادہ ہوجائے۔

جبؔ دلِ اغیار خوں ہو کر مژہ تک آگیا ... پھر لحاظِ غمزۂ شمشیر دم کیونکر کریں

اضطرابِ شوق شاید غیر اسکے پاس ہو ... جانبِ چلون نظارہ دمبدم کیونکر کریں

ہے شبِ فرقت میں مرگ افسانہ خواں بیفائدہؔ ... نام آرام آگیا خوابِ عدم کیونکر کریں

دیکھ پیچ و تابِ سنبل ہو گیا دل بے قرار ... اب نہاں سودائے زلفِ خم بہ خم کیونکر کریں

سب کو ہوتا ہے جہان میں پاس اپنے نام کا
ہم بھی تو مومن ہیں دل نذرِ صنم کیونکر کریں

۱۲۶

نہ تن ہی کے ترے بسمل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں ... ہے پاش پاش جگر دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

جنونِ عشق پری رو سے دل شکن ہے بلا ... کہ روز طوق سلاسل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

اُٹھا کے سوتے میں وے پکارات شاید ... کہ زیر سر کے مرے سل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

درازدستی یہ کس بے ادب نے کی ہم قتل ... تمام دامنِ قاتل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

یہاں ہے چاک گریباں تو واں بھی چستی سے ... قبائے شوخ شمائل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

یہ کس کی چشم فسوں گر نے کی فسوں سازی ... طلسم جادوئے بابل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

یہ بے حجابی بُری گو مجھی کو چھانکو تم ... کہ روز پردۂ حائل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

ؔ غمزۂ شمشیر دم = غمزہ جس کا کاٹ تلوار کی طرح ہے یعنی محبوب کے غمزۂ شمشیر دم کی بدولت اغیار کا دل خون ہو کر پلکوں تک آگیا۔ (غمزہ سے اُن کا جی تنگ آگیا) پھر اُن سے کیا توقع ہے کہ غمزۂ یار کا لحاظ کرینگے اور محبت سے کنارہ کش نہ ہوں گے۔ ؔ شبِ ہجر میں موت افسانہ خواں کی طرح ناحق مجھے (آخری نیند) سُلانا چاہتی ہے۔ کیونکہ خواب عدم میں بھی یک گونہ آرام کی صورت پائی جاتی ہے اور عاشق کو آرام سے پرہیز کرنا چاہئے۔ اپنے نہ مرنے کی خوب توجیہ کی ہے۔ واضح رہے کہ جب کسی کو نیند نہیں آتی تو افسانہ سُناتے ہیں کہ سو جائے۔

کہے نہ ملنے کی اُس سنگدل کے گر قاصد | تو سنگ و سر ابھی یاں مل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں
نہ کیونکہ[1] رشک سے خوں ہو کسی کا اُس در پر | ہمیشہ اک نئے بسمل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

غزل سرائی کی مومن نے کیا کہ رشک سے آج
چمن میں سینے عنادل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

۱۲۷

ہے[2] جلوہ ریز نور نظر گرد راہ میں | آنکھیں ہیں کس کی فرش تری جلوہ گاہ میں
کیا رحم کھا کے غیر نے دی تھی دعائے وصل | ظالم کہاں وگرنہ اثر میری آہ میں
مست کیجو دیر[3] آنے میں کیا جانے کیا بنے | کھینچا ہے جذب شوق نے یوسف کو چاہ میں
اتنی بھی[4] تاب دوریِ خورشید طلعتاں | نقصان کیا کمال سے آیا ہے ماہ میں
جانے دے[5] چارہ گر شب ہجراں میں مت بلا | وہ کیوں شریک ہو مرے حالِ تباہ میں

[1] اُس در پر مصرع ثانی سے متعلق ہے۔
[2] نہ معلوم کس نے تیری جلوہ گاہ میں آنکھیں بچھائی ہیں کہ راہ کی گرد کا ہر ذرہ چشم تماشا بنکر محو دیدار ہے۔
[3] زلیخا کے شوق کی کشش نے حضرت یوسفؑ کو کنعان سے اپنی طرف اس طریقہ سے کھینچا کہ وہ بے اختیار کنویں میں گر پڑے۔ تم نے اگر آنے میں دیر کی تو کیا عجب کہ میری کشش شوق کے ہاتھوں اسی طرح تم کو بھی تکلیف پہونچ جائے۔
[4] چاند کمال کی حالت میں خورشید سے دور تر ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ خورشید طلعتوں (حسینوں) کی جدائی کی تھوڑی سی برداشت بھی بہت مشکل ہے۔ دیکھو چاند کا کمال ہی اُس کے لئے کس قدر نقصان کا مترادف ہے۔ یعنی یہ کیا کم نقصان ہے کہ کامل ہونے کی حالت میں وہ خورشید سے دور رہتا ہے۔
[5] چارہ گر محبوب کو شبِ ہجر میں بلا کر کیوں میرے حال تباہ میں شریک کرتا ہے۔ شعر کی لطافت یہ ہے کہ عاشق ہجر کے صدمے میں اسقدر بیحواس ہے یا محبوب کی ہمدردی کے جذبہ سے اتنا بے تاب ہے کہ شب ہجر میں اُس کی تکلیف کا روادار نہیں۔ حالانکہ جب محبوب آجائے گا تو ہجر کی مصیبت ہی کہاں رہے گی۔

ظالم[۱] وہ بیوفا ہے عدو جس کے رشک سے — اتنا کچھ آگیا خلل اپنے نباہ میں

اِس مُنہ پہ اُس سے دعویٔ حُسن آفتاب[۲] — اے مہر روشنی مرے روزِ سیاہ میں

شیریں پہ طعن تلخیٔ فرہاد کس لئے — مجھکو بھی کچھ مزا نہ ملا تیری چاہ میں

ہے دوستی[۳] تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا — جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں

ق

ظالم[۴] کہیں روا نہیں عاشق سے احتراز — کہہ دے اگر ہو شک سخنِ دادخواہ میں

اب تک نہیں گواہیٔ اطفال معتبر — محسوب ہے جو عصمتِ یوسف گناہ میں

مومن کو سچ ہے دولتِ دنیا و دیں نصیب
شب بتکدہ میں گذرے ہے دن خانقاہ میں

[۱] عدو کے رشک کی وجہ سے مجھ جیسے وفادار کے نباہ میں بھی اس قدر فرق آگیا۔ اسی سے عدو کی بیوفائی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ عاشق نے اپنی ترک وفا کا ذمہ دار بھی رقیب ہی کو ٹھیرایا ہے یہ نکتہ شاعرانہ قابل داد ہے۔ [۲] اے آفتاب تو اس مُنہ پر معشوق سے دعویٰ ہمسری کرتا ہے۔ اگر تجھ میں کچھ بھی روئے یار کی درخشانی ہوتی تو میرے روزِ سیاہ (طالع بد) میں بھی ضرور روشنی ہوتی۔ یعنی اگر معشوق آجائے تو میرا روزِ سیاہ روشن ہوجائے۔ تو روز آتا ہے پھر بھی میری تیرہ بختی بدستور ہے۔ اسلئے تیرا دعویٰ حُسن باطل ہے۔

[۳] اگر تم کو دشمن (رقیب) سے دوستی ہے تو اُس کی طرف نظر نہ کرنا۔ کیونکہ تمھاری نظروں میں جادو بھرا ہوا ہے جس سے وہ غریب مسحور ہوکر دیوانہ ہو جائے گا۔ اس شعر میں بھی شاعرانہ نکتہ ہے۔ [۴] یہ شعر اور شعر مابعد قطعہ بند ہیں۔ یعنی عاشق سے کہیں پرہیز کرنا جائز نہیں اگر تجھے میرے قول میں شبہ ہو تو بتا دے۔ دیکھ چونکہ حضرت یوسفؑ کی عصمت گناہ میں داخل ہے (کیونکہ زلیخا سے پرہیز کرنا زلیخا پر معاذ اللہ ظلم تھا) اسلئے نتیجہ یہ ہوا کہ محض اس جرم پر کہ ایک لڑکے نے حضرت یوسفؑ کی پاکی کی گواہی دی تھی، آجتک لڑکوں کی گواہی معتبر نہیں۔ واضح رہے کہ اطفال کی شہادت شرعاً غیر معتبر ہے۔ اس شعر میں یہ اشارہ ہے کہ جب حضرت یوسفؑ نے زلیخا سے دامن چھڑا لیا اور زلیخا نے آپ پر اتہام لگایا تھا اُس وقت ایک طفل شیرخوار نے آپ کی پاکدامنی کی شہادت دی تھی۔

۱۲۸

تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خوابِ ناز میں
ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شبِ دراز میں

اور ہی[1] رنگ آج ہے عارضِ گلعذار کا
خونِ دل اپنا تھا مگر گونۂ رخ طراز میں

کیونکہ نہ آدھی رات تک جاگے وہ جسکا دھیان ہو (آدھی آنکھ)
آہوئے[2] نیمخواب میں نرگسِ نیم باز میں

خسرو[3] و عیش وصلِ یار جانکنی اور کوہکن
اپنا جگر تو خوں ہوا عشق کے امتیاز میں

بن[4] ترے بزمِ سور میں ہے یہ قیامت کہ ہے
نفخۂ صور کا اثر نغمۂ نے نواز میں

آن[5] سے اب التفات کی غیر کو ہیں شکایتیں
شکر کیا مرا مبالغہ منتِ احتراز میں

کیا سبھی سینے جل چکے کیا سبھی دل اگل چکے
بوئے کباب اب نہیں آہِ جگر گداز میں

---

[1] گونۂ رخ طراز = گلگونہ جس سے چہرہ کی آرایش کی جاسکے۔ آج محبوب گلرخسار کے عارض کا رنگ ہی کچھ اور ہے۔ گلگونہ میں تو یہ رنگ کہاں۔ شاید میرا خونِ دل اس میں شامل ہوگیا ہوگا

[2] آہوئے نیم خواب = آنکھ جو کچھ کھلی ہو کچھ بند ہو۔ نرگس نیم باز سے بھی نیم وا آنکھ مراد ہے۔ [3] عشق نے خسرو و کوہکن میں جو امتیاز رکھا اُس سے میرا جگر خون ہے کہ ایک کو عیش وصل میسّر ہوا۔ دوسرے کو جانکنی۔

[4] بزمِ سور بمعنی محفلِ عیش۔ نفخۂ صور = دمِ صور۔ نے نواز = مطرب۔ تیرے بغیر بزمِ عیش میں قیامت برپا ہوجاتی ہے اس لئے کہ ایسی حالت میں نغمۂ مطرب نفخۂ صور کی تاثیر رکھتا ہے۔ سور اور صور میں تجنیسِ مضارع اور قیامت اور صور میں ایہام تناسب ہے۔

[5] محبوب مجھ سے پرہیز کرتا ہے اور میں بصد مبالغہ اُس کے اِس احسان کا اعتراف کرتا ہوں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب رقیب یہ سمجھکر کہ اسی (پرہیز) میں کچھ بہتری ہوگی محبوب کے التفات سے بیزار اور اُلٹا اُس کا شکوہ گزار ہے۔ احتراز (پرہیز) کو احسان اسلئے کہا کہ شاعر کے نزدیک کرمِ یار ستم سے زیادہ جانستاں ہے۔

پردہ[۱] نشیں کے عشق میں پردہ دری نہو کہیں	ہوتی ہیں بیتابیاں جانِ نہفتہ راز میں
رخنہ[۲] در سے غیر پاس دیکھا کسے کہ آج ہے	رخنہ گری کچھ اور ہی نالۂ رخنہ ساز میں

یاد بتاں میں لاکھ بار فرطِ قلق سے ہم بھی تو
بیٹھے اُٹھے ہیں مومن آپ گریۂ شب نماز میں

۱۲۶

جیب[۱] درست لائق لطف و کرم نہیں	ناصح کی دوستی بھی عداوت سے کم نہیں
منظور[۲] ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں	اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں
سجدہ[۳] کر دیا ہو مرے ذوقِ قتل نے	قاتل کے آگے گردنِ اغیار خم نہیں
غیرت[۴] کی جا ہے رام نزاکت ہوا وہ شوخ	وحشت کا جوش کیونکہ ہو مجھ سے رم نہیں
کیا[۵] خوش ہوں کوئے غیر میں گر نقش پا نہو	وہ شوخ جانتا ہوں کہ ثابت قدم نہیں

[۱] جانِ نہفتہ راز = جان جسکا راز مخفی ہے میری جان پردۂ راز سے نکلنے کو بیتاب ہو رہی ہے اور میں مر رہا ہوں۔ اس حالت میں اگر کوئی اندیشہ ہے تو یہ کہ مر کر کسی پردہ نشین کا رازِ عشق افشا نہ ہو جائے۔

[۲] میں نے رخنہ در سے معشوق کو رقیب کے پاس بیٹھے دیکھ لیا جسکا یہ اثر ہے کہ آج میرے نالۂ فتنہ انگیز میں پہلے سے زیادہ فتنہ گری آگئی ہے۔

[۱] ناصح مجھے نصیحت کرتا ہے کہ چاک گریبان کو سینا چاہیے۔ مگر اسکی یہ دوستی در اصل دشمنی کا حکم رکھتی ہے کیونکہ میں اگر شکستہ حال ہونگا تو محبوب کو رحم آئیگا۔ گریبان درست ہونے کی حالت میں کون توجہ کرنے لگا۔

[۲] قاعدہ ہے کہ عادت کے خلاف ہر بات ناگوار گذرتی ہے۔ لہذا اگر تم مجھ پر ستم و جفا کرنی چاہتے ہو تو وصل سے بڑھکر اور جفا کیا ہوگی۔ کیونکہ میں ہجر کا عادی تھا۔ خوگر ہو گیا ہوں کہ وصال اسکی عادت کے خلاف ہونے کی بنا پر مجھے ناگوار ہوگا۔ [۳] میرے اشتیاقِ قتل کو دیکھکر اغیار کے حوصلے پست ہو گئے اور اب وہ قتل کے خوف سے قاتل کے سامنے گردن جھکانے کی جرأت نہیں کرتے۔ گردن خم کرنا علامت اطاعت ہے اور مطلب یہ ہے کہ جب سے اغیار نے سمجھ لیا ہے کہ قتل ہونا بھی لازمۂ اطاعت ہے وہ سرے سے اطاعت ہی سے کنارہ کش ہو گئے۔ [۴] وہ شوخ نزاکت کی وجہ سے اب مجھ سے رم (گریز) نہیں کرتا اور مجھے اس سے آلنی وحشت ہوتی ہے۔ کیونکہ رشک یہ سمجھتا ہے کہ جب اُسے مجھ سے گریز نہیں تو رقیبوں سے بھی کیوں گریز کرنے لگا۔ رام ہونا مطیع۔ [۵] میں جانتا ہوں کہ معشوق ثابت قدم نہیں۔ اسلئے کوئے رقیب میں اُسکا نقشِ قدم نہ دیکھکر مجھے بڑی خوشی ہو۔ کیا عجب ہے کہ وہ کسی اور کے کاشانۂ عیش کی زینت ہو یا پھر رقیب سے صلح کرلے۔

فریاد نالہ ہائے عزا بار[۶] پر انہیں
آیا ہے رحم کب کہ ذرا مجھ میں دم نہیں

کس[۷] بوالہوس کے حال پہ رویا وہ گلعذار
خارِ مژہ میں اب خلشِ دم بدم نہیں

جانا[۸] حرام ہجرِ بتاں میں تو کیا گناہ
پیرِ مغاں شراب ہے شیشے میں سم نہیں

بے التفاتیاں[۹] جو عدو سے سنی نہ تھیں
ہم جانتے تھے وصل میں رنج و الم نہیں

معلوم[۱۰] ہو تو تیرے ہی عالم کا حال ہو
میرا دل دو نیم ہے یہ جامِ جم نہیں

بے جرم[۱۱] پائمال عدو کو کیا کیا
مجھکو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں

ہوں[۱۲] آب آب اُن رے نگہ ہائے گرم گرم
اس مہروش کے سامنے آنکھوں میں نم نہیں

نام[۱۳] وصال لینے سے ہوتا ہے مضطرب
کیونکر کہوں اُسے مرے مرنے کا غم نہیں

---

۶ عزا بار = غم آفریں۔ ۷ معشوق گلرو رقیب کے حال پر رویا جسکا اثر یہ ہوا کہ اب اُسکے خار جیسی پلکوں سے میرے دل میں گھڑی گھڑی کھٹک نہیں ہوتی۔ یعنی جذبہ رشک کے باعث مجھے اُس (معشوق) سے اگلا سا تعلق خاطر نہیں رہا۔ قاعدہ ہے کہ خار جب تر ہوتا ہے تو اُس میں خلش کم ہوتی ہے۔ ۸ چونکہ شراب منجملہ لوازم عیش ہے۔ اسلئے ہجر بتاں میں مَیں نے اُس کو حرام جانا تو کیا گناہ کیا۔ ہاں اگر زہر ہوتا تو حرام نہ سمجھتا۔ ۹ یعنی ہمارے ساتھ وصل میں بھی بے التفاتی ہے۔ ۱۰ جام جم میں تمام عالم کا حال معلوم ہوتا تھا مگر میرا دل جام جم نہیں۔ اِس (دل) میں اگر معلوم ہوگا تو تیرے ہی عالم (حُسن) کا حال معلوم ہوگا۔ تمام دنیا سے مجھے کیا سروکار۔ ۱۱ اگر تم نے عدو کو بے قصور پائمال کیا تو کیا پروا۔ مجھکو تو اس کا مطلق خیال نہیں۔ یعنی اُس کی پائمالی دیکھکر میں اپنے انجام سے ڈرنے والا اور محبت سے کنارہ کرنیوالا نہیں ۱۲ معشوق مہروش نگاہ گرم (نگاہ غضب) کا یہ اثر ہے کہ خوف سے میری آنکھوں میں آنسو خشک ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ شرم سے آب آب ہوں۔ کہ اظہار عشق کی کوئی صورت (اشکباری) نہیں رہی۔ اس میں لطف یہ ہے کہ مہر (آفتاب) کی تابش سے شبنم اُڑ جاتی ہے۔

۱۳ وصال کے لفظ میں رعایت ہے یعنی معشوق اُس سے وصل کے معنی لیتا ہے اور عاشق موت کے۔ اس صنعت کو قول بالموجب کہتے ہیں۔

ناصح[۱۴] کہاں تلک تری باتیں اٹھا سکوں
سچ ہے کہ مجھ میں طاقت جور و ستم نہیں

عاشق[۱۵] کشی ہے شیوہ اگر بوالہوس سہی
آخر کچھ اپنی جان کے دشمن تو ہم نہیں

مومن[۱۶] سوے حرم ہے نگاپوے فکر کیوں
کیا اس زمیں میں قافیہ بیت الصنم نہیں

۱۳۰

غنچہ ساں خاموش بیٹھے ہیں سخن کی فکر میں
قافیہ کیا تنگ ہے وصفِ دہن کی فکر میں

دامنِ[۱] قاتل کو وقتِ قتل کیونکر چھوڑتے
بیکسی سے جان تھی اپنی کفن کی فکر میں

شوق[۲] مردن کو بھی سامانِ سفر درکار تھا
سو ہے از خود رفتگی ترکِ وطن کی فکر میں

تلخیِ[۳] خسرو ہو شیریں کام شادیِ مرگ کیا
جانکنی ہے انتقامِ کوہکن کی فکر میں

۱۴ه ناصح نے کہا تھا کہ تم میں طاقت جور و ستم نہیں۔ اسلئے عاشقی سے کنارہ کرو۔ عاشق جواب دیتا ہے کہ بیشک یہی وجہ ہے کہ مجھ سے تیری نصیحت کی برداشت نہیں ہو سکتی کیونکہ میرے لئے دراصل یہ (نصیحت) ہی جور و ستم کا حکم رکھتی ہے۔

۱۵ه اس شعر میں عاشقی اور بوالہوسی کے فرق پر زور دیا ہے۔ یعنی اگر تمھیں عشق سے ضد ہے تو میں ہوس پیشگی اختیار کرونگا۔ کیونکہ تم بوالہوسوں کو قتل نہیں کیا کرتے۔

۱۶ه غزل میں حرم کا قافیہ رہ گیا تھا اب اُسکی فکر بیسود ہے۔ آخر بیت الصنم کا قافیہ بھی تو موجود ہے اس کو کیوں ترک کیا جاے۔ بیت الصنم = بُت خانہ۔

۱ه یعنی یہ خیال تھا کہ بیکسوں کو کفن کون دینے لگا۔ دامن قاتل ہی سے کفن کا کام لیا جاے۔

۲ه جس طرح ہر سفر کے لئے سامان سفر کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح سفر عدم کے لئے بھی سامان چاہئے۔ وہ سامان کیا ہے؟ ترک وطن (دنیا) کے خیال میں میری بیخودی۔ یعنی اس راہ میں بیخودی ہی ذریعۂ سہولت ہو سکتی ہے۔

۳ه خسرو کو وجودِ رقیب (کوہکن) کی بدولت جو تلخی نصیب تھی وہ رقیب کے مرنے سے فنا نہیں ہو سکتی۔ اس واسطے کہ جانکنی خسرو سے کوہکن کے مرنے کا انتقام لینے کی فکر میں ہے اور ایک روز لیکر رہے گی۔ پھر خسرو کی تلخی کا کیا تعجب شیریں کام = لذت یاب۔ شادی مرگ میں یہ مفہوم ہے کہ موتِ رقیب سُنکر خود تلخیٔ خسرو خوشی سے فنا ہو جاے الفاظ شعر کی رعایت ظاہر ہے۔

وہم[۴] عشقِ لالہ رو سے داغ دل کیا کیا کھلے
جان کر گلچین کو تاراجِ چمن کی فکر میں

سر[۵] سے شعلے اٹھتے ہیں کس طرح روکوں کیا کروں
جل گیا جی ضبط آہ شعلہ زن کی فکر میں

ہے گریباں گیر واں نازِ تغافل اب تلک
جی جلایاں باعثِ دیر آمدن کی فکر میں

درد[۶] ہے درماں ہرا منت کشِ مرہم نہیں
داغ تو ہے چارۂ داغِ کہن کی فکر میں

گر یقینی واں دعا ہوتی ہے اے مومن قبول
جائیں گے کعبہ بھی طفلِ برہمن کی فکر میں

۱۳۱

دن[۱] بھی درازات بھی کیوں ہے فراقِ یار میں
کاہے سے فرق آگیا گردشِ روزگار میں

بس[۲] کہ بن آئے مر گئے ہم شبِ انتظار میں
دن جو رہے تھے عمر کے چیتے رہے مزار میں

خاک[۳] میں وہ تپش نہیں خار میں وہ خلش نہیں
کیوں نہ ہمیں زیادہ ہو جوشِ جنوں بہار میں

ہو[۴] گئی کیا بلا سے جاں بوسۂ زلف کی ہوس
پھیرتے ہیں زباں کو ہم کامِ دہانِ مار میں

[۴] گلچیں کو تاراج چمن کی فکر میں جان کر میرے داغ ہائے دل تازہ ہوگئے کیونکہ مجھے وہم ہوا کہ یہ گلچیں کہیں اس لالہ رو کے عشق میں مبتلا نہ ہوا اور گلوں کو رخِ یار سے مشابہ سمجھ کر نہ توڑ رہا ہو۔
[۵] آہ شعلہ فشاں سے نکلنا چاہا مگر میں نے اس کو روکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ضبطِ آہ کی کوشش میں جی جل گیا اور سر سے شعلے اٹھنے لگے۔ اب آہ کے روکنے کی کیا تدبیر ہو۔
[۶] داغ نو ہی داغِ کہن کے علاج کی فکر میں مصروف ہے۔ یعنی نئے مصائب پرانے مصائب کو خود بھلا دیتے ہیں۔
[۱] گردشِ روزگار کا اثر یہ ہونا چاہیئے تھا کہ اگر دن بڑا ہوتا تو رات چھوٹی ہوتی یا رات دراز ہوتی تو دن مختصر ہوتا مگر فراق میں دن بھی طویل ہے اور رات بھی۔ [۲] چونکہ ہم بن موت آئے قبل از وقت شبِ انتظار میں مر گئے اسلئے عمر کے باقی دن جو رہ گئے تھے قبر میں کاٹنے پڑے۔ [۳] شاعر بہار میں اپنے جنون کی زیادتی کی توجیہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آجکل (موسم بہار میں) خاک میں اگلی سی تپش یا خار میں پہلی سی خلش نہیں اور عاشق جو بالطبع وحشت پسند ہے ان چیزوں کا خوگر ہے اسلئے بہار میں ان کو نہ پا کر اس کا جوشِ جنون زیادہ ہو جاتا ہے۔ [۴] بوسۂ زلف کی تمنا میں ناکامی ہوئی۔ اس وجہ سے ہم اپنی زبان سانپ کے منہ میں دیتے ہیں کیا کرنا چاہیئے زلف سے گو تمنا بہت رکھتا ہے۔

مرگ[۴۸] ہے انتہائے عشق یاں ہے ابتدائے شوق
زندگی اپنی ہوگئی رنجشِ یار بار میں

پوچھا ہے اُس نے کیا مری بیخودی و قلق کا حال
ہوش نہیں حواس میں تاب نہیں قرار میں

کیوں نہ گلے کا ہار ہو شوق اجل پڑے ہیں
پھول عدو کی خاک کے اُس نے گلے کے ہار میں

خاک اُڑائی گُل نے یہ کس کے جنونِ عشق میں
آئے ہے کچھ اڑی ہوئی بادِ صبا غبار میں

لاکھ[۴۹] شکستگی سے بھی دل کی گرہ نہ کھل سکی
عقدہ موے ہر شکن طُرّہ تابدار میں

تھا[۵۰] قلق برہی دشمنِ جاں شبِ فراق
کاٹ کے اپنے سر کو ہم بھیجتے ہیں کنار میں

دھیان میں مومن آگئی بحث جبر و اختیار
قابوئے یار میں ہیں ہم وہ نہیں اختیار میں

۱۴۶

کون کہتا ہے دمِ عشق عدو بھرتے ہیں
کہ ہوا باندھنے کو آہ کبھو بھرتے ہیں

شمع[۵۱] پر کچھ نہیں موقوف کہ سارے ظالم
پانی آگے ترے اے عربدہ جو بھرتے ہیں

حوضِ میخانہ پیے سے بھی مراجی نہ بھرا
کیا تنک ظرف ہیں جو خم سے سبو بھرتے ہیں

حسرتِ[۵۲] بوسۂ کاکل کا کیا ہم نے علاج
زخمِ دل مشک سے اے غالیہ مو بھرتے ہیں

[۴۸] عموماً عاشقی کی انتہا موت ہوتی ہے۔ مگر یہاں اسکے برعکس اسکی نوبت ہی نہ آنے پائی اور ہمیشہ ابتدائے شوق کی کیفیت رہی۔ اسلئے کہ جب کبھی ہم نے اظہار شوق کیا۔ محبوب کو ہم سے رنجش ہوگئی جس کے باعث تکمیل عشق نہ ہوسکی اور جذبۂ شوق افسردہ ہوگیا۔ اگر تکمیل عشق ہوجاتی تو ہمارا مرجانا یقینی تھا۔ غرض یہی سبب تھا جسکی بدولت ہماری زندگی قائم رہ گئی۔ [۴۹] میرا دل معشوق کی زلف پیچ میں بندھا ہوا ہے۔ مگر یہ تعجب ہے کہ لاکھوں شکنوں کے باوجود بھی زلف کی گیرائی کا یہ حال ہے کہ دل کی گرہ کھل نہیں سکتی گویا اسکی ہر شکن بال کی گرہ ہے جسکا وا ہونا دشوار ہوتا ہے۔ حالانکہ زلف کی شکستگی (شکن) کا تقاضا یہ ہونا چاہئے تھا کہ کھلنے میں آسانی ہوتی۔ [۵۰] قلق برہی = پہلو کے خالی ہونے کا غم۔
[۵۱] پانی بھرنا = اظہار اطاعت کرنا۔ عربدہ جو = جنگجو۔ [۵۲] زخم میں مشک بھرنے سے اذیت زیادہ ہوتی ہے۔ مشک کی مشابہت کاکل سے ظاہر ہے۔ غالیہ مو = جسکے بال غالیہ (عطر) کی طرح خوشبودار ہوں۔

کر چکے[۵۳] سلک دُرِ اشک کا مذکور کہ ہم
آج غمّازوں کے مُنہ دیکھیو تو بھرتے ہیں

اُس[۵۴] ستمگر سے مگر آنکھ لڑی ہے کہ حباب
کیسے کچّے گھڑے پانی لبِ جو بھرتے ہیں

کس کے ہاتھوں سے ہے دم نَے کی طرح ناک میں جو
نالے کرتے ہیں کبھو آہ کبھو بھرتے ہیں

حالتِ نزع ہے جیتے ہیں ترے ہجر میں خاک
دن جو کچھ عمر کے ہیں آئنہ رو بھرتے ہیں

اشک[۵۵] دیتے ہیں مرے نالۂ موزوں کا صلہ
موتیوں سے دہنِ زخم گلو بھرتے ہیں

غیر کرتے ہیں سبوئے مے گلگوں خالی
ساغرِ چشم میں ہم دل کا لہو بھرتے ہیں

پی ہے مے حضرت **مومن** نے جبھی مضمضہ[۵۶] کو
آفتابے کئی ہنگام وضو بھرتے ہیں

۱۳۴

مانے نہ مانے منع تپشہائے دل کروں
مَیں غیر تو نہیں کہ تماشائے دل کروں

ہو جاں بھی جا کے کچھ تو مداوائے دل کروں
کب تاب مَیں دل پہ ہاتھ دھر ہائے دل کروں

سو طرح کے زیاں ہیں رہنے میں اس کے گر
دشمن بھی مُفت لے تو مَیں سودائے دل کروں

مرتا[۵۷] ہوں کس عذاب سے ہے وقت جی میں ہے
اس دم دعا برائے تمنّائے دل کروں

[۵۳] ہم محبوب کے حضور میں اپنے اشکوں کے موتیوں کی لڑی کا ذکر کر چکے۔ اب دیکھنا اُن غمّازوں کا مُنہ کیونکر بند نہ ہوگا جو اُسکے سامنے ہمارے دعوائے عشق کی تردید کیا کرتے تھے۔

[۵۴] کچّے گھڑے پانی بھرنا = اظہارِ عجز کرنا۔ شاید حبابوں کی آنکھ اُس ستمگر سے لڑی ہے جو وہ لبِ جو اُسکے سامنے عاجزی کا اعتراف کرتے ہیں۔ حبابوں کی ناپائداری (کہ علامت عجز ہے) کی مناسبت سے کچّے گھڑے کے الفاظ لُطف دے رہے ہیں۔ شعرا حباب کو عموماً آنکھ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ [۵۵] مَیں نے نالۂ موزوں کیا جس سے گلے میں زخم پڑ گیا۔ اب جو رویا تو آنسو گلے میں پھنس گئے۔ گویا اشکوں نے نالے کا یہ انعام دیا کہ دہنِ زخم کو موتیوں سے بھر دیا۔

[۵۶] مضمضہ = کُلّی۔ غرارہ۔

[۵۷] مَیں بڑے عذاب سے جان دے رہا ہوں اور شہادت کی گھڑی اجابتِ دعا کا وقت ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اسوقت تمنّائے دل کے لئے خدا سے دعا کروں۔ کیا عجب کہ قبول ہو۔

جاں[۲] دیدوں ہے اُس آفتِ جاں سے معاملہ — بس کب تک انتظار تقاضائے دل کروں

کیونکر پھرے دل اُس سے کہیں قرضِ عاریت — ناصح دیا نہ تھا کہ میں دعوائے دل کروں

میں[۳] اور وہ کوچہ لے گیا کس جائے ظلم ہے — اس پر بھی گر شکایتِ بیجائے دل کروں

چھٹتا ہے جیتے جی کوئی زنجیرِ زلف سے — دیوانہ ہوں کہ چارۂ سودائے دل کروں

بیرحم ہرزہ گردیوں سے پاؤں گھس گئے — کیا ذکر جوشِ حوصلہ فرسائے دل کروں

دھبا[۴] لگا ہے شوقِ سیہ کار زلف کو — اللہ کیا علاج سُویدائے دل کروں

کہئے جو دردِ دل تو وہ کہتا ہے مجھکو کیا — میں کیا طبیب ہوں کہ مداوائے دل کروں

اُس[۵] بُت کو ترک دیں سے نہیں مومن اعتماد
کیونکر نہ میں شکایتِ اغوائے دل کروں

(۱۲)

۱۳۴

بے[۱] مزہ ہو کر نمک کو بیوفا کہنے کو ہیں — کھل گئے زخموں کے منہ کس کو برا کہنے کو ہیں

سب جفا جو اُس ستمگر کے سوا[۲] کہنے کو ہیں — جن کو چرخ و مرگ کہتے ہیں سُنا کہنے کو ہیں

[۲] معشوق آفتِ جان ہے۔ دل لیکر جان کو مصیبت میں ڈال دیگا۔ لہٰذا اتنا کون انتظار کرے کہ وہ دل کا تقاضا کرے۔ بہتر ہے کہ بے مانگے پہلے ہی جان اُسکے حوالے کر دوں کہ مصیبت میں پڑنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ [۳] ناانصافی ہوگی اگر میں دل کی شکایت کروں کیونکہ اسی کی بدولت کوچۂ یار نصیب ہوا ورنہ میں اُس کوچہ کے قابل کب تھا۔ [۴] سویدا = وہ نقطۂ سیاہ جو دل پر ہوتا ہے۔ یعنی سویدائے دل کی وجہ سے میرے شوق کو بدنامی کا داغ ملا ہے کیونکہ لوگ یہ گمان کرنے لگے ہیں کہ دل کا نقطۂ سیاہ زلف کی الفت کا اثر ہے۔ اب کیا تدبیر کروں جو یہ داغ بدنامی مٹے۔ زلف کی رعایت سے اپنے شوق کو سیہ کار کہا ہے سویدا کی مناسبت دیکھنے سے ظاہر ہے۔ [۵] میں نے دل کے بہکانے سے مذہب چھوڑا مگر اُس بُت کو اب بھی اعتبار نہیں آتا۔

[۱] لب ہائے زخم کے کھل جانے کی توجیہہ شاعر نے یہ کی ہے کہ ان (زخموں) کو نمک میں لذت نہ ملی۔ اس لئے نمک کی شکایت کرنا چاہتے ہیں۔ نمک کو بیوفا اس لئے کہا ہے کہ اُس نے زخموں کا حق ادا نہیں کیا۔ [۲] کہنے کو ہیں یعنی برائے نام ہیں۔

نالہ ہی نکلے ہے گو ہم مدعا کہنے کو ہیں
لب نہیں کہنے میں اب کیا جانے کیا کہنے کو ہیں

تیری[۵۳] تیغ و دشنہ کے کیوں لب پہ چھالے پڑ گئے
گرم خونی کا مری کیا ماجرا کہنے کو ہیں

دوست کرتے ہیں ملامت غیر کرتے ہیں گلہ
کیا قیامت ہے مجھی کو سب بُرا کہنے کو ہیں

ترجمانِ[۵۴] التماسِ شوق ہے تغییرِ رنگ
جوں زبانِ شمع عاشق بے صدا کہنے کو ہیں

جل[۵۵] گیا دل تو بھی اُٹھتا ہے دھواں سر سے کہ اب
مرثیہ ہم اس چراغِ کشتہ کا کہنے کو ہیں

دیکھنا[۵۶] کس حال سے کس حال کو پہونچا دیا
بخت تیرے عاشقوں کے نارسا کہنے کو ہیں

ایک دن کو تو زبانِ شعلہ دوزخ قرض دے
قصۂ شبہائے غمِ روزِ جزا کہنے کو ہیں

شکوہ حرفِ تلخ کا یا شورہ بختی کا گلہ
ہم جو کچھ کہنے کو ہیں سو بے مزا کہنے کو ہیں

میں[۵۷] گلہ کرتا ہوں اپنا تو نہ سُن غیروں کی بات
ہیں یہی کہنے کو وہ بھی اور کیا کہنے کو ہیں

وہ نہیں آتے نہ آویں مرگِ ظالم تو تو آ
یاں لبِ شوق و تمنا مرحبا کہنے کو ہیں

غیر سے سرگوشیاں کر لیجئے پھر ہم بھی کچھ
آرزو ہائے دلِ رشک آشنا کہنے کو ہیں

---

۵۳ شاید تیغ و خنجر نے میرے خون گرم کے ذکر کرنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ اُسکے اثر سے اُنکے لب پر چھالے پڑ گئے۔ غلو ہے۔ ۵۴ جس طرح زبان شمع صدا نہ ہونے کے باوجود اپنا حال کہتی ہے اسی طرح عاشقوں کا رنگ متغیر بھی زبان حال سے روداد شوق کی ترجمانی کرتا ہے۔

۵۵ مدت ہوئی کہ دل جل چکا اور یہ نوبت آئی کہ ہم اس چراغ کشتہ (دل) کا مرثیہ کہنے کو تیار ہیں۔ پھر بھی اب تک سر سے دھواں اُٹھتا ہے۔

۵۶ نارسا کے لفظ میں قدرے ایہام ہے جس سے شاعر نے خاص فائدہ لیا ہے۔ اس لفظ کو ردیف الثار میں دیکھیے۔ ۵۷ تو غیروں کی بات پر اس لئے کان دھرتا ہے کہ وہ میرا گلہ کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو میری عرض سُن۔ کیونکہ میں بھی تجھ سے اپنا گلہ کرنے والا ہوں۔

تیغ[8] غمزہ کو لگا لے جلد سنگِ سرمہ پر — حرف مطلب آرزو مند جفا کہنے کو ہیں

ہو گئے نام بتاں سنتے ہی مومن بیقرار
ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں

۱۲۵

وہ علی[1] الرغم عدو مجھ پہ کرم کرتے ہیں — ہے ستم لطف کے پردے میں ستم کرتے ہیں

طلبِ وصل کس انداز سے ہم کرتے ہیں — شوق نامہ اسے وصلی پہ رقم کرتے ہیں

جب[2] ترے کوچہ کا بیتابیِ دل سے پھرنا — یاد آتا ہے زمیں بوس قدم کرتے ہیں

نیم[3] بسمل ہیں نہ چھیڑ اے تپش دل کہ ابھی — روئے قاتل کا نظارہ کوئی دم کرتے ہیں

اے اجل کاش اُلٹ جائیں شب ہجراں میں — وہ دعائیں کہ تری جان کو ہم کرتے ہیں

دم میں مت آئیو اے غیر کہ مانند صبا — جس سے لگ چلتے ہیں وہ اس سے ہی رم کرتے ہیں

محضر[4] قتل ہے مکتوب گنہگاروں کا — سرِ قاصد کو وہ فتوے سے قلم کرتے ہیں

[8] تیری جفاؤں کے آرزو مند (عاشق) حرف مطلب کہنے والے ہیں۔ تجھے چاہئے کہ اُنکے جواب کے لئے آمادہ ہو جا اور غمزہ کی تلوار کو سنگ سرمہ پر تیز کر لے۔ یعنی آرائش جمال کر کے غمزہ کو مہیائے بیداد کر۔ کیونکہ یہی (آرزوئے بیداد) ہمارا مطلب ہے۔ سنگ سرمہ وہ پتھر ہے جس سے سُرمہ حاصل ہوتا ہے۔ یہاں خود سرمہ مراد ہے۔

جس طرح تیغ پتھر پر لگانے سے زیادہ تیز ہو جاتی ہے اسی طرح غمزہ (اشارہ چشم) سُرمہ کی مدد سے سفاک تر ہو جاتا ہے۔

[1] علی الرغم عدو = رقیب کی ضد پر۔ یعنی رقیب کے ستانے کے لئے دوست کا مجھ پر کرم کرنا بھی میرے حق میں ستم ہے۔ گو بظاہر کرم معلوم ہوتا ہے۔ [2] تیرے کوچہ سے جدا ہو کر جب کبھی اُس (کوچہ) کی یاد آتی ہے تو ہم اپنے قدموں کی زمین بوسی کرتے ہیں کہ انھیں کی بدولت ایک زمانہ میں تیری گلی میں جانا میسر ہوا تھا۔ زمین بوسی میں غم سے زمین پر گر پڑنے کا پہلو بھی نکلتا ہے۔

[3] ذبح کے وقت تڑپنے سے نظارۂ قاتل کی یکسوئی میں فرق آئیگا۔

[4] ہم نے قاصد کے ہاتھ خط بھیجا۔ معشوق نے اس جرم میں غریب قاصد کو قتل کر دیا۔ گویا ہم گنہگاروں کا مکتوب قاصد کے قتل کا محضر تھا جس سے اُس کو قتل کا فتویٰ یا سند جواز حاصل ہو گئی۔

دیکھنا؎ اُس دہن تنگ کے بوسہ کا مزا — کہ ہوسناک تمنائے عدم کرتے ہیں

ہائے قسمت کہ ہوئی مجھ پہ جفا اور فزوں — ان دنوں غیر پہ گر لطف و کرم کرتے ہیں

کشتہ؎ یار ہوں اس رشک سے مرتا ہے جہاں — وہ بھی کیا ہیں جو مری موت کا غم کرتے ہیں

کیا ہی بیزار ہے اس زیست سے جی ہا ستم — قتل کرتے نہیں وہ اور ستم کرتے ہیں

اپنے؎ سودے کی نہ پوچھو کہ خریدار کے ساتھ — جنس میں تو ہے دل اور بیع سلم کرتے ہیں

آبرو رہ گئی مرنے کی کہ روتے تو ہیں وہ — اشک؎ شادی ہی سے گو چشم کو نم کرتے ہیں

جاکے کعبہ میں بھی مومن نہ گئی دیر کی یاد

جائے لبّیک صدا ہائے صنم کرتے ہیں

۱۳۶

صورت دکھائیے جو کبھو جاکے خواب میں — بے؎ دید آنکھ کھول دے جھنجلا کے خواب میں

شب؎ وہ جو سو رہے مرے پاس آکے خواب میں — جاگے تھے بخت خفتہ تمنا کے خواب میں

؎ رقیبوں کو معشوق کے دہان تنگ کے بوسہ کا یہ مزا ملا کہ اب وہ زندگی سے عاجز ہوکر مرنے کی آرزو کرتے ہیں۔ ہوسناک = رقیب۔ دہن تنگ کی تشبیہ عدم سے مشہور ہے۔

؎ میں کشتۂ یار ہوں۔ اس لئے دراصل میری موت تمام دنیا کے لئے موجب رشک بنی ہوئی ہے۔ ایسی حالت میں جو لوگ میرے مرنے کا غم کرتے ہیں کس قدر نادان ہیں —

؎ بیع سَلَم - بدلی یعنی وہ بیع جس میں خریدار شئے مبیعہ پر فوراً قابض نہ ہو سکے - مراد یہ ہے کہ ہمارا معاملہ بھی عجیب ہے کہ ان کی جنس موجود ہے - پھر بھی ہم خریدار (معشوق) کے ساتھ بیع سَلَم کرتے ہیں - یعنی اگرچہ اُس سے دل کا سودا کرتے ہیں لیکن دراصل دل ہمارے ہی پاس رہتا ہے -

؎ اشک شادی = آنسو جو فرط مسرّت میں نکل آتے ہیں۔

؎ بے دید = بے مروّت -

؎ میری تمنا کے سوئے ہوئے نصیب جاگے ضرور مگر خواب میں جاگے - اور ظاہر ہے کہ " ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں "

آنکھوں[۳] کو بند کرکے وہیں کھولدے گر آئے
یوسف کسی کے محوِ تماشا کے خواب میں

کابوس[۴] ہیں بتاتے مجھے واں تو رشک ہے
کاش اور کوئی آئے اطبا کے خواب میں

وہ ہے بغل میں تو بھی تو یاں نیند اڑ گئی
یہ سوچ ہے گیا نہ ہو اعدا کے خواب میں

سوتے[۵] رہتے پائے ناقہ زمان وداع گر
طالع نہ ہوتے قیس کے لیلا کے خواب میں

ان نالہ ہائے شب کا اثر صبح دیکھیو
آیا خلل گر اس ستم آرا کے خواب میں

نیرنگ[۶] عشق سے نہ ہو غافل ہے ایک رنگ
اس دل کے جاگنے میں زلیخا کے خواب میں

رہتا[۷] ہے دھیان دیکھتے ہو جب مجھے نہیں
کیوں چونک چونک پڑتے ہو گھبرا کے خواب میں

اس[۸] کی گلی ہے نالۂ زنجیر غل نہ کر
یاں[۹] پاؤں جاگتے ہیں کوئی جا کے خواب میں

---

۳ یعنی اُسکے محو تماشا کو دیدار یوسفؑ کی خواہش نہیں۔
۴ کابوس ایک مرض ہے جس میں کثرت رطوبت دماغ کی وجہ سے آدمی خواب میں حرکات کرتا ہے اور ڈر جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب میرے خواب میں آتا ہے تو مجھ پر عجیب کیفیت گذرتی ہے۔ اس کیفیت کو اطبا کابوس تجویز کرتے ہیں۔ (یعنی میرے تاثرِ عشق کو مرض دماغ قرار دیتے ہیں) کاش یہ لوگ بھی کسی حسین پر عاشق ہوں اور کوئی ان کے خواب میں آئے تو ان کو میری حالت کا صحیح اندازہ ہو۔ اپنے محبوب کے معاملے میں تو رشک (مانع) ہے ہاں اور کوئی حسین ہو تو اچھا۔ اسکے سوا ان (اطبا) کا مزاج درست ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ عشق ان کی بلا جانے عاشق ہو تو پہچانے۔ الخ۔
۵ اگر قیس اور لیلیٰ کے نصیب خواب میں ہوتے تو رخصت کے وقت ناقۂ لیلیٰ کے پاؤں سو جاتے یعنی چلنے سے قاصر رہتے۔ ۶ شاعر معشوق سے مخاطب ہوکر کہتا ہے کہ عشق کی شعبدہ کاری سے غافل نہ رہ اور یہ یاد رکھ جو زلیخا کے خواب میں کشش تھی وہی میری بیداری میں ہے۔ منقول ہے کہ زلیخا حضرت یوسفؑ کو خواب میں دیکھ کر عاشق ہوئی تھی آخر اُسکے جذبِ عشق نے اُن کو گھر سے کھینچ بلایا۔ ۷ تم جب کبھی (بیداری میں) مجھے دیکھتے ہو تو سوتے میں بھی تمھیں میرا ہی دھیان رہتا ہے۔ نہیں (ورنہ) خواب میں (مجھے دیکھ کے) گھبرا کر کیوں چونک چونک پڑتے ہو۔ مراد یہ ہے کہ تمھاری نفرت مجھ سے اس حد تک پہونچ گئی ہے۔ ۸ اُس کوچہ کی کشش کا یہ حال ہے کہ پاؤں بھی وہاں سو کر جاگتے نہیں اسلئے نالۂ زنجیر کا سوتوں کو جگانے کی سعی کرنا بے سود۔

سو جاؤں روتے روتے تو کیا ہنس کے طعن سے — کہتا ہے[۹] سوتے ہو مرے بن آ کے خواب میں

کیا کفر ہے کہ چھوڑ دے سونا ہی گر کبھی[۱۰]
مومن نظر پڑے بتِ ترسا کے خواب میں

۱۳۷

سوزِ دل[۱۱] کے ہاتھ سے ڈھونڈھوں جو دامن آب میں — ہووے ہر ہر قطرہ داغ افزائے گلخن آب میں

گر ہو وہ[۱۲] دستِ حنائی عکس افگن آب میں — ہووے مرجاں جوں چنار آتش زنِ تن آب میں

بیکسی دیکھو وفورِ اشک عبرت سے ہوا — بعد مردن جوں غریق اپنا بھی مدفن آب میں

دی دلِ[۱۳] سوزاں کو تشبیہ سمندر میں نے اب — چھوڑ کر آتشکدہ ڈھونڈے ہے مسکن آب میں

بیحجابانہ یہ رویا کون مجلس میں کہ ہے — غرق[۱۴] جوں آئینہ وہ شوخِ حیا فن آب میں

دوستو مرتا ہوں اُس روئے عرق آلودہ پر — لاش بھی میری بہانا بعد مُردن آب میں

یادِ[۱۵] چشمِ یار میں دریا پہ رویا بن گئیں — مردمِ آبی کی پلکیں شمع روشن آب میں

۹ محبوب خواب میں آکے کہتا ہے کہ تم میرے بن سوتے ہو۔ مصرعِ ثانی کی نثر سے مطلب واضح ہو جاتا ہے۔

۱۰ اُس بتِ ترسا کے کفر کا یہ حال ہے کہ اگر کبھی مومن خواب میں نظر پڑے تو اُس کی ضد سے سونا ہی ترک کر دے۔

۱۱ اگر میں سوزِ دل سے بچنے کے لئے پانی میں پناہ لوں تو میرے سوز کے اثر سے پانی کا ہر قطرہ گلخن کو بھی رشک سے داغ دے۔ ۱۲ اگر محبوب کا دستِ حنائی پانی میں عکس ڈالے تو اُسکی تاثیر سے مونگے (مرجان) میں بھی درختِ چنار کی طرح آگ لگانے کی خاصیت آجاوے۔ چنار کو پنجۂ انسان سے تشبیہ دیتے ہیں اور اس میں سے آگ نکلتی ہے۔ مرجاں کی تشبیہ بھی پنجہ سے مشہور ہے۔ ۱۳ سمندر ایک جانور جو آگ میں رہتا ہے۔ میرے دلِ سوزاں کی مناسبت سے اب سمندر کو آتشکدہ میں رہنا دشوار ہو گیا ہے اور وہ گرمی کے مارے پانی کی جستجو کرنے لگا۔ ۱۴ معشوق غیر کے رونے پر شرم کے باعث آبِ عرق میں غرق ہو گیا جیسے آئینہ آب (چمک) میں غرق ہوتا ہے۔ حیا فن بہ معنی حیادار۔ خاص ترکیب ہے۔

۱۵ مردمِ آبی = ایک دریائی جانور جو انسان کی شکل ہوتا ہے۔ یادِ چشمِ یار میں دریا پر رونے کی خاصیت یہ ہوئی کہ مردمِ آبی کی پلکیں شمع کی طرح منوّر ہو گئیں۔

کون ڈوبا تشنگ آ کر غرق دریائے الم — کیوں سدا شورِ تموج سے ہے شیون آب میں

تشنہ کامِ آبِ تیغِ یار ہوں گرمی تو دیکھ — بہرِ تسکیں تیرتا ہوں تا بہ گردن آب میں

اشکِ چشم و گریۂ زخمِ دل اب میں کیا کروں — ہوگئی سب آستیں تر خوں میں دامن آب میں

[1] کشتۂ غیرت ترے پانی چوانے سے ہے غیر — مرتے دم پاتا ہوں ذوقِ خونِ دشمن آب میں

ڈوب مریے کیوں نہ غیرت سے جب اے مومن نہائے
غیر کے ہمراہ وہ طفلِ برہمن آب میں

۱۳۸

[2] دکھاتے آئنہ ہو اور مجھ میں جان نہیں — کہو گے پھر بھی کہ میں تجھ سا بدگمان نہیں

جو یار صلح پہ ہے اب تو آسمان نہیں — وہ مہربان ہوا تو یہ مہربان نہیں

ترے فراق میں آرام ایک آن نہیں — یہ ہم سمجھ چکے گر تو نہیں تو جان نہیں

نہ پوچھو کچھ مرا احوال میری جاں مجھ سے — یہ دیکھ لو کہ مجھے طاقتِ بیان نہیں

یہ گل ہیں داغ جگر کے انہیں سمجھ کر چھیڑ — یہ باغ سینۂ عاشق ہے گلستان نہیں

[3] نہ چاہوں روزِ جزا داد یہ ستم دیکھو — کب آزماتے ہیں جب وقتِ امتحان نہیں

[1] تو نے مرتے دم میرے منہ میں پانی چوایا اور غیر اس رشک سے ہلاک ہوگیا - یہی سبب ہے کہ میں وقتِ آخر پانی میں غیر کے خون کا مزہ پاتا ہوں -

[2] میری حالت تو یہ ہے کہ جان باقی نہیں اور تمھاری یہ کیفیت ہے کہ اس خیال سے مجھے آئنہ دکھاتے ہو کہ مبادا عاشق مکر کر رہا ہو - کیا اب بھی کہو گے کہ میں تمھاری طرح بدگمانی نہیں کرتا - قاعدہ ہے کہ جب کسی پر سکتہ وغیرہ کا احتمال ہوتا ہے تو منہ کے قریب آئینہ لیجاتے ہیں کہ سانس چل رہی یا نہیں -

[3] یہ بھی معشوق کا ظلم ہے کہ قیامت میں مجھ سے امید رکھتا ہے کہ اُسکے ظلم کی داد خدا سے نہ چاہوں - اسلیئے کہ وفاؤں کی آزمائش کا موقع دنیا میں تھا - نہ کہ آخرت میں -

نہ پوچھے حال تو جب تک مرا بیاں نہ کروں	مری زباں نہیں گر ترے دہاں نہیں
زبسکہ دیر لگی نامہ بر کو ڈھونڈتے ہم	عدم میں جاتے ہیں گو پاؤں کا نشاں نہیں
شب[۳] فراق میں پہونچی نہ دل سے جان تلک	کہیں اجل بھی تو مجھ سی ہی ناتواں نہیں
وہ[۴] حال پوچھے ہے میں چشم سرمگیں کو دیکھ	یہ چپ ہوا ہوں کہ گویا مری زباں نہیں
نہ کیوں[۵] نثار ہو جاں فرط کین جاناں پر	کہ اس کو میرے سوا اور کا دھیان نہیں

نکل کے دیر سے مسجد میں جا رہ لے مومن
خدا کا گھر تو ہے تیرے اگر مکاں نہیں

۱۲۹

ہجراں[۱] میں بھی زیست کیوں نہ چاہوں	جاں دادہ شوخ بے وفا ہوں
ہیں[۲] غیر مرے نکلنے سے خوش	گویا کہ میں اُن کا مدعا ہوں
اُف[۳] کر گئی یاد گرم جوشی	میں آتشِ مردہ سے جلا ہوں

۳ اجل کی ناتوانی اس سے ثابت ہے کہ دل سے جان تک کا فاصلہ طے نہ کر سکی۔ یعنی دل تو مردہ ہو گیا۔ جان ابھی باقی ہے۔
۴ اُس کی چشم سرمگیں کو دیکھ کر میری گویائی جاتی رہی۔ اس میں رعایت یہ ہے کہ سرمہ کھا لینے سے آواز بیٹھ جاتی ہے۔
۵ میں معشوق کی دشمنی پر بھی فدا ہوں کہ اُس کو ہر وقت میرا ہی خیال رہتا ہے (گو عداوت کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو) "میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں"
۱ میں ایک شوخ بے وفا پر عاشق ہوں اور چونکہ زیست بھی بے وفا کہلاتی ہے۔ اس لئے آلام فرقت کے باوجود اُس (زیست) کو بھی چاہتا ہوں۔ کیونکہ اُس کو بے وفائی میں معشوق سے یک گونہ نسبت ہے۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ میں ہجر میں اس لئے جینا چاہتا ہوں کہ میرے مرجانے پر کہیں وہ بے وفا شوخ مجھے کم ہمتی کا طعنہ نہ دے۔

۲ مدعی جس چیز کے نکلنے سے خوش ہوا کرتے ہیں وہ اُنکا مدعا ہے۔ اور چونکہ وہ میرے نکلنے سے خوش ہیں۔ اسلئے گویا میں اُن کا مدعا ہوں۔ ۳ اُف کرنا = پھونک دینا۔ گرم جوشی = اختلاط محبوب کے ساتھ پہلے جو مراسم اختلاط تھے اُنکی یاد نے مجھے پھونک دیا۔ گویا میں بجھی ہوئی آگ سے جلا ہوں گرم جوشی گذشتہ کو آتشِ مردہ کہنا ندرت و لطافت سے خالی نہیں۔

کیا[۵۴] شکوہ جفائے آسماں کا
میں آپ کو دور کھینچتا ہوں

دشمن[۵۵] سے ہے چشم مہربانی
محروم نگاہ آشنا ہوں

ربط[۵۶] اُس سے ہے مثل شعلہ و شمع
مر جاؤں گر ایک دم جدا ہوں

کیونکر[۵۷] نہ بگڑ کے وہ نکالے
میں دل کے غبار سے بنا ہوں

شکوہ نہیں غیر کے ستم کا
انصاف کرو تو میں بھی کیا ہوں

کھاتا ہوں بدن پہ عشق میں داغ
اعمال[۵۸] کی اپنے خود جزا ہوں

ہے طعن سے مدح شام ہجراں
میں کیسی بلا کو چھیڑتا ہوں

اُس[۵۹] کو میں نہ چھوڑ جائے مجھکو
ہر چند عدو کا نقش پا ہوں

خود[۶۰] بینی و بیخودی میں ہے فرق
میں تم سے زیادہ کم نما ہوں

بیزار ہے سوز عشق سے جی
کس شعلہ مزاج سے خفا ہوں

---

۵۴ میں اپنی تکالیف کو آسمان سے منسوب کرنا اپنی عالی حوصلگی کے منافی سمجھتا ہوں۔
۵۵ دشمن = رقیب۔ چشم یعنی توقع۔ آشنا سے محبوب مراد ہے۔ ۵۶ میرا دوست سے ربط ایسا ہے جیسے شعلہ کا شمع سے۔ جب شعلہ شمع سے جدا ہوتا ہے تو فنا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح میں بھی دوست کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ۵۷ میں سرتاسر غبار و کدورت ہوں۔ گویا میری تخلیق غبار دل سے ہوئی ہے۔ پھر محبوب کیوں نہ بگڑ کر مجھے نکالے۔ قاعدہ ہے کہ لوگ بگڑ کر (ناراض ہوکر) دل کا غبار نکالتے ہیں۔ ۵۸ یعنی خود میرا وجود میرے عمل کی مکافات ہے۔
۵۹ بالفرض اگر میں رقیب کا نقش پا بھی بنجاؤں تو بھی وہ مجھے کوئے یار میں چھوڑنے کا نہیں۔ قاعدہ ہے کہ انسان کہیں سے جاتا ہے تو نقش قدم زمین پر چھوڑ جاتا ہے۔
۶۰ محبوب کو اپنی کم نمائی پر ناز ہے۔ یعنی یہ کہ وہ خود نمائی نہیں کرتا اور مشتاقوں کو جمال نہیں دکھاتا۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر کم نمائی قابل ستائش ہے تو میں تم سے زیادہ کم نما ہوں۔ اسلئے کہ تم کم از کم خود بینی تو کرتے ہو (تم اپنے آپ کو تو دیکھتے ہو) میری تو بیخودی میں بسر ہوتی ہے (مجھے اپنی بھی خبر نہیں)۔

مجھ ۱۱؎ رمز شناس سے یہ باتیں ‏— کیا خوب مَیں غیر سے بُرا ہوں
اسے ۱۲؎ کاش عدو کو غیرت آوے ‏— مَیں منتظر اپنی مَوت کا ہوں

اس نام کے صدقے جس کی دولت ۱۳؎
مومن رہوں اور بتوں کو چاہوں

۱۶۰

ہردم ۱؎ رہیں کشمکش دست یار ہیں ‏— چلون کے بند کس کے گریباں کے تار ہیں
بالیدہ دم بدم جو مرے دل کے خار ہیں ‏— ہر آن برچھیاں سی کلیجے کے پار ہیں
کیا ۲؎ کیجئے کہ طاقت نظارہ ہی نہیں ‏— جتنے وہ بے حجاب ہیں ہم شرمسار ہیں
عمر ۳؎ دراز کی ہے رقیبوں کو آرزو ‏— دیکھو زمانِ ہجر کے امیدوار ہیں
مضطر ۴؎ وہ گُل جو میرے دمِ سرد سے ہوا ‏— کیا کیا شمال و باد صبا بیقرار ہیں
چھاتی سے مَیں لگائے رکھوں کیوں نہ رات دن ‏— یہ داغ و زخم دل کی مرے یادگار ہیں

۱۱؎ شاید معشوق نے اپنی ستمگری کی تائید میں کہا کہ ارباب زمانہ دوستی کے قابل نہیں۔ عاشق رمز شناس تاڑ گیا کہ یہ تعریض مجھ پر ہے چنانچہ کہتا ہے کہ کیا مَیں غیر سے بھی گیا گذرا ہوں۔ جو مجھ سے یہ دلآزاری کا سلوک اور اُس سے وہ دلجوئی کا برتاؤ۔ ۱۲؎ یعنی میری یہ کیفیت دیکھکر کاش عدو کو رشک آ ئے اور وہ بھی طالب مَوت ہو۔ ۱۳؎ دولت = بدولت۔

۱؎ چلون (چلمن) کے بند جو ہر وقت تاکنے جھانکنے کی وجہ سے دست یار کی کشمکش میں گرفتار رہو کر پارہ پارہ ہوگئے ہیں کسی عاشق کے گریبان کے تار سے مشابہ ہیں کیونکہ یہ بھی دست جنون کی کھینچا تانی میں سلامت نہیں رہتے۔ ۲؎ یعنی ہم اسلئے شرمسار ہیں کہ ہمیں محبوب کے بے حجابانہ جلووں کے نظارہ کی تاب نہیں ۳؎ رقیب عمر دراز کے طالب ہیں۔ مگر چونکہ عاشق کے نزدیک زمانہ ہجر ہی دراز ہوتا ہے اس لئے وہ سمجھتا ہے کہ یہ نادان ہجر کے امیدوار ہیں۔
۴؎ شمال = وہ ہوا جو قطب شمالی سے چلے۔ صبا = پُروا ہوا۔ وہ گُل (محبوب) میری آہ سرد سے بے چین ہو گیا جس کے رشک سے شمال و صبا بیقرار ہیں۔

جز نہ سپہر ہیں مرے دشمن تو اور بھی
لیکن بڑے غضب یہی دو تین چار ہیں

ہجوِ[۵] ملیح غیر سمجھ کر مزے اُٹھائے
خوش حرف بے نمک سے بھی ہم دلفگار ہیں

کیسا[۶] فلک کہ اختر طالع جلا دئے
کیا سرد مہر میرے دم شعلہ بار ہیں

کیونکر نہ رحم حال پہ آئے شبِ وصال
اندوہ و درد روزِ مصیبت کے یار ہیں

پانی کے بدلے برسے گی آج آگ ابر سے
اُٹھتے ہماری خاک سے بھی کچھ بخار ہیں

شبنم[۸] خراب مہر و کتاں سینہ چاکِ ماہ
لو اور بھی ستم زدہ روزگار ہیں

ناصح سے مجھکو کیونکہ نہوں بدگمانیاں
دشمن ہیں جو مرے وہ ترے دوستدار ہیں

کینے گلے رقیب کے کیا طعن اقربا
تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

مُردوں[۹] کو تجھ پہ دیتے ہیں ترجیح جو حسود
مومن یہ جان لے کہ سگِ جیفہ خوار ہیں

۵ محبوب نے غیر کی تعریف کی چونکہ غیر میں کوئی بات تعریف کے قابل نہیں اسلئے ہم نے اُس کو غیر کی ہجو ملیح سمجھ کر لُطف اُٹھایا اور دل کو تسلی دے لی گویا ہم دلفگار حرف بے نمک سے بھی خوش ہیں۔ ورنہ دلفگار تو نمک سے خوش ہوا کرتے ہیں۔ مدح غیر کو بے لطف ہونے کی بنا پر حرف بے نمک کہا۔ ہجو ملیح اُس ہجو کو کہتے ہیں جس میں بظاہر مدح کا احتمال ہو۔ ملیح مزے۔ نمک۔ دلفگار میں ایہام تناسب ہے۔ ۶ میری آہ شعلہ بار اس قدر بے مروت ہے کہ آسمان تو ایک طرف۔ میرے نصیب کے ستارے کو بھی جلا دیا کہ وہ بھی آسمان پر تھا۔ مطلب یہ ہے کہ میری آہوں نے میری تیرہ بختی میں اور اضافہ کر دیا۔
۷ اندوہ و درد مصیبت کے دن میرے ساتھی تھے۔ اب وصال کی شب ان دونوں سے جدائی ہوتی ہے۔ اسلئے ان کی بیکسی پر کیوں نہ رحم آئے۔
۸ میں سمجھتا تھا کہ صرف میں ہی ستم زدہ روزگار ہوں۔ اب معلوم ہوا کہ شبنم بھی آفتاب کی محبت میں برباد اور کتاں بھی ماہ کے عشق میں سینہ چاک ہے قاعدہ ہے کہ شبنم طلوع آفتاب پر فنا ہو جاتی ہے اور کتاں نور مہتاب میں پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ ۹ جو حاسد شعرائے سلف کو مومن پر ترجیح دیتے ہیں اُن کو سگِ مردار خوار قرار دیا ہے۔ جیفہ = مردار۔

۱۶۱

شبِ وصل اُسکے تغافل کی زبس تاب نہیں
تلخیِ مرگ ہے آنکھوں میں شکرِ خواب نہیں

ستمیں میرے نصیبوں میں لکھی ہیں کیا کیا
کتنے دفتر ہیں کہیں فصل نہیں باب نہیں

دل کا کیا حال کرے دیکھئے یہ گرمیِ حسن
ٹھہرتا آئینۂ یار میں سیماب نہیں

سرفروشوں کے اگر آپ خریدار ہوئے
تو گراں ہووے گی وہ جنس جو کمیاب نہیں

جبکہ وہ بدمست اودھر آیا تو عدو کے گھر سے
اپنی قسمت میں بجز دُردِ مئے ناب نہیں

رستنی کا عوض افلاک سے لوں گا پس مرگ
قتل عاشق ہے یہ خونریزیِ سہراب نہیں

کلبۂ تار میں کیونکر ترے بن گذرے گی
دن کو یاں دھوپ نہیں رات کو مہتاب نہیں

محتسب ہم ہے تو پہلے پلا دیکھ مجھے
نہ لنڈھا پی لے مئے ناب یہ زہرآب نہیں

عشق کیوں درپئے جاں شوق ہے کیوں سینہ شگاف
دشمنیِ دل شکنی شیوۂ احباب نہیں

گلۂ چرخ عبث شکوۂ جاناں بیجا
یاس و حرماں کو مرے حاجتِ اسباب نہیں

کشش ابروے صنم کی ہی کہاں اے مومن
لاکھ سجدے کرئے دل مائل محراب نہیں

کرئیں

۱؎ مجھے شبِ وصل یہ کبھی گوارا نہیں کہ ذرا دیر کو بھی محبوب مجھ سے غافل ہو۔ اگر ایسا ہوا تو یہ میرے لئے پیامِ موت ہے۔ اس لحاظ سے شبِ وصل اُسکی آنکھوں میں جو نیند آرہی ہے اسکے لئے شکرِ خواب ہو مگر میرے حق میں تلخیِ مرگ ہے کہ اتنی دیر وہ مجھ سے غافل رہے گا۔ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ میری آنکھوں میں جو شکرِ خواب وصل کا اثر ہے دراصل میرے لئے تلخیِ مرگ کا حکم رکھتا ہے کیونکہ اتنی دیر بھی محبوب سے غفلت مجھکو گوارا نہیں۔ مگر اس صورت میں مصرعِ اول میں اُس سے تغافل ہونا چاہئے۔ ۳؎ اُسکی گرمیِ حُسن کا یہ عالم ہے کہ ہنگامِ زینت آئینہ میں سیماب نہیں ٹھہرتا۔ دیکھئے اس گرمیِ حسن کے ہاتھوں میرے دل پر کیا گذرے۔ قاعدہ ہے کہ سیماب گرمی سے اُڑ جاتا ہے۔

۴؎ یعنی اُس صورت میں یہ جنس کم ارزاں (سرفروش) گراں قیمت ہو جائیگی۔ شعر میں ندرت یہ ہے کہ کمیاب جنس فراواں ارزاں ہوتی ہے۔ لیکن یہاں معاملہ برعکس ہوگا کیونکہ اب اُس کی خریداری بڑھ جائیگی۔ ۵؎ وہ بدمست رقیب سے ملاقات کرکے میرے یہاں آیا۔ گویا شراب تو رقیب کے حصہ میں آئی اور تلچھٹ میرے حصہ میں۔ ۶؎ اگر تو آئے تو میرا خانۂ تاریک روشن ہو سکتا ہے۔ ۷؎ عشق اور شوق کو شاعر نے احباب قرار دیا ہے ۸؎ یاس و حرماں ازل سے میری فطرت میں ودیعت ہیں۔ اسلئے اُن کے لئے سبب تلاش کرنا بے سود ہے۔ اور چرخ اور معشوق کی شکایت فضول۔

۱۶۲

آہ[1] فلک فگن ترے غم سے کہاں نہیں
جو فتنہ خیز اب ہے زمیں آسماں نہیں

کہنا پڑا[2] مجھے پئے الزام پند گو
وہ ماجرا جو لائق شرح و بیاں نہیں

ڈرتا ہوں[3] آسمان سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

اظہار[4] دوستی کی خوشی کیا شبِ وصال
دشمن سے سُن چکا ہوں کہ تو مہرباں نہیں

باتیں[5] تری وہ ہوش رُبا ہیں کہ کیا کہوں
جو کوئی رازداں ہے مرا رازداں نہیں

نومیدئ[6] جواب ہے کیوں اتنے شوق پر
یہ کیا ہوا کہ میں پسِ قاصد رواں نہیں

پیش عدو سمجھ کے ذرا حال پوچھنا
قابو میں دل نہیں مرے بس میں زباں نہیں

بے[7] صرفہ جانکنی کا مری کچھ تو ہو حصول
محنت کسی کی آج تلک رائگاں نہیں

کرتے[8] وفا اُمید وفا پر تمام عمر
پر کیا کریں کہ اُس کو سرِ امتحاں نہیں

اُس[9] کو بھی جانتا ہوں فریبِ وصال غیر
تم کو عبث یقیں ہے کہ میں بدگماں نہیں

---

[1] دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں تیرے غم (عشق) میں آسمان گرانے والی آہیں بلند نہ ہوتی ہوں اسلئے جو فتنے پہلے آسمان سے نازل ہوتے تھے اب تیرے دور میں زمین سے اُٹھتے ہیں۔ [2] پند گو (ناصح) مجھے عشق سے الزام دیتا تھا۔ آخر اُسکے قائل کرنے کے لئے مجھے مجبوراً ایسی باتیں (وصف یار اور عشق وغیرہ) کہنی پڑیں جو لائق بیان نہ تھیں۔ [3] میری قسمت ہر حال میں کسی نہ کسی آفت کا نشانہ بنتی ہے۔ اگر آشیاں صیاد کی نظر سے بچ گیا تو برق سے تباہ ہوگا۔ [4] میں دشمن سے تیری نامہربانیاں سُن چکا ہوں اسلئے جو تو اظہار دوستی کرتا ہے اُس کا مجھے اعتبار نہیں آتا۔ یعنی جس طرح تو نے اُس سے قطع ارتباط کیا ہے ایک روز مجھ سے بھی کرے گا۔

[5] تیری باتیں ایسی ہیں کہ سننے والوں کے ہوش اُڑتے ہیں۔ اسلئے جس سے تیرا راز الفت بیان کرتا ہوں وہ مرے سے کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ [6] شوق کا تقاضا یہ تھا کہ عاشق قاصد کو روانہ کرکے خود اُسکے پیچھے دوڑا جاتا مگر مایوسئ جواب کا یہ اثر ہے کہ قاصد کے پیچھے جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ [7] بے صرفہ = بے فائدہ۔ [8] اگر اُسکو ہماری آزمائش کا خیال ہوتا تو یہ اُمید بندھتی کہ ہماری وفا سے مطمئن ہوکر وہ بھی ہم سے وفا کرے گا مگر کیا کیجیے کہ اُسکو آزمایش کا خیال ہی نہیں۔ سر = خیال۔ [9] معشوق نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ تم (عاشق) مجھ سے بدگمان نہیں۔ عاشق جواب دیتا ہے کہ تمہارا یہ کہنا دراصل وصال غیر کا فریب ہے۔ یعنی تم یہ چاہتے ہو کہ اس طرح میری تعریف کرکے واقعات وصل غیر پر پردہ ڈالو اور میں اُسکا تفحص نہ کروں۔

میں[۱۰] اپنی چشم شوق کو الزام خاک دوں
تیری نگاہ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں

فطری[۱۱] ہے پیر چرخ نے اپنا مقابلہ
طفلی سے مجھکو حسرت بخت جواں نہیں

گذرے[۱۲] ہیں میری خاک سے غیروں کے ساتھ وہ
فتنہ اُٹھا ہے گرد پس کارواں نہیں

لگ[۱۳] جائے شاید آنکھ کوئی دم شب فراق
ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں

اتنے[۱۴] سُبک نظر میں ہیں اوضاع روزگار
دُنیا کی حسرتیں مرے دل پر گراں نہیں

ہر ذرہ میری خاک کا برباد ہو چکا
بس اے خرام ناز کہ تاب و تواں نہیں

نالے کے ساتھ دم کے نکل جانیکا ہے خوف
پر کیا علاج طاقت ضبط فغاں نہیں

میں[۱۵] جانتا ہوں نعش پہ آنے کا مدّعا
آسودگی پسند تری شوخیاں نہیں

اُس[۱۶] بُت کی ابتدائے جوانی مراد ہے
مومن کچھ اور فتنۂ آخر زماں نہیں

[۱۰] جو مراسم اختلاط میرے اور تیرے مابین ہو چکے ہیں خود تیری نگاہ شرم سے ظاہر ہیں۔ میری چشم شوق کا کیا قصور۔
[۱۱] بخت جوان = طالع نیک۔ مجھے لڑکپن سے بخت جوان کی تمنا نہ تھی۔ اگر ہوتی تو میں آسمان سے دشمنی مول نہ لیتا۔ فطری میں یہ مفہوم ہے کہ آسمان سے مخالفت میری فطرت کا مقتضا ہے "پیر" اور "طفل" کا "مقابلہ" ملحوظ رہے۔ [۱۲] چونکہ وہ میری قبر پر ہو کر گذرے ہیں اور گذرے بھی ہیں تو رقیبوں کے ساتھ۔ اسلئے گرد کارواں کے بدلے زمین سے فتنہ اُٹھا ہے۔ [۱۳] شاید ناصح کی پندگوئی کو افسانہ سمجھکر میں کوئی دم کو سو رہوں۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ شاعر کے نزدیک اُسکی نصیحت افسانہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ بلا کی شوخی ہے۔
[۱۴] دنیا کے معاملات کو میں اس قدر سُبک (حقیر) سمجھتا ہوں کہ اگر اُن میں ناکامی ہوتی ہے تو گراں نہیں گذرتی۔ سُبک اور گراں میں ایہام تضاد ہے۔
[۱۵] میری نعش پر تیرے آنے کی غرض اسکے سوا کچھ نہیں کہ تیری شوخیاں چاہتی ہیں کہ مجھے مرکر بھی چین نہ ملے
[۱۶] روایات مذہبی میں آخر زمانہ (قرب قیامت) کے فتنوں کی جو پیشگوئی کی گئی ہے اُس سے معشوق کے ابتدائے شباب کی ہنگامہ آفرینیاں مراد ہیں اور بس۔

۱۴۲

تاثیر صبر میں نہ اثر اضطراب میں
بیچارگی سے جان پڑی کس عذاب میں

پے نالہ مُنہ سے جھڑتے ہیں بے گریہ آنکھ سے
اجزائے دل کا حال نہ پوچھ اضطراب میں

چرخ وزمیں میں توبہ کا ملتا نہیں سُراغ
ہنگامۂ بہار و ہجوم سحاب میں

اُس زہرہ چہر دشمنِ منحوس کو نہ دیکھ[1]
نالے بہیں گے خون کے اس فتح باب میں

اتنی کدورت اشک میں حیران ہوں کیا کہوں[2]
دریا میں ہے سراب کہ دریا سراب میں

فکرِ مآل سے مے و شاہد رہے عزیز[3]
پیری میں موت یاد تھی پیری شباب میں

تم نکلے بہر سیر تو نکلے گا مہر بھی[4]
ہووے گا اجتماع شبِ ماہتاب میں

ڈوبی ہجوم اشک سے کشتی زمین کی[5]
ماہی کو اضطراب ہوا جوش آب میں

کھولا جو دفترِ گلہ اپنا زیاں کیا
گزری شبِ وصال ستم کے حساب میں

ج ۳

[1] فتح باب = دو ستاروں کی اس طرح نظر کہ اُنکے خانے باہم مقابل ہوں اور جب ایسا واقع ہوتا ہے تو بارش ہوتی ہے۔ مجازاً بارش۔ معشوق حُسن کی وجہ سے زہرہ جمال اور رقیب منحوس ہونے کے باعث زحل شیم ہے۔ اِن دونوں کی نظریں اگر باہم دگر مقابل ہوگئیں تو عاشق کو ڈر ہے کہ پانی کے بدلے خون کے نالے بہ جائیں گے۔ [2] سراب = وہ ریگ جو دور سے پانی معلوم ہو کدورت کو سراب سے اور اشک کو دریا سے تشبیہ دی ہے۔ [3] شراب اور معشوق کی محبت کا سبب یہ تھا کہ مجھے اپنے انجام کار کی فکر تھی یعنی شباب میں خیال تھا کہ ایک دن پیری آنے والی ہے اور پیری میں خوف تھا کہ ایک روز موت آئیگی اسلئے سوچا کہ جس قدر اور جتنی جلد داد عیش دے لوں اچھا ہے۔ شعر میں غضب کی شوخی ہے۔

[4] اجتماع اصطلاح تنجیم میں شمس و قمر کے جمع ہونے کو کہتے ہیں۔ یعنی تمھارا چاندنی میں بہر سیر نکلنا آفتاب کا طلوع ہونا ہے۔ اس طریقہ سے شب مہتاب میں ماہ و مہر کا اجتماع ہو جائیگا۔ ممکن ہے کہ مہر سے حقیقۃً مہر آسمان مراد ہو۔ یعنی تمھارے اشتیاق دید کی وجہ سے شب ماہ میں آفتاب برآمد ہوگا۔ [5] میں اس قدر رویا کہ میرے اشکوں کے طوفان سے ماہی زمین بیقرار ہوگئی۔ آخر اُسکی بیقراری کی وجہ سے کشتیٔ زمین جو اُسکے سہارے رُکی ہوئی تھی ڈوب گئی۔

اے حشر جلد کر تہ و بالا جہان کو
قاتل جفاسے باز نہ آیا وفاسے ہم
بازیچہ کر دیا ستمِ یار و جورِ چرخ

(۵)

یوں کچھ نہ ہو اُمید تو ہے انقلاب میں
فتراک میں جو سر ہے تو جاں ہے رکاب میں
طفلی سے غلغلہ ہے مرا شیخ و شاب میں

مومنؔ یہ عالم اُس صنمِ جانفزا کا ہے (۶)
دل لگ گیا جہانِ سراسر خراب میں

۱۶

جلتا ہوں ہجرِ شاہد و یادِ شراب میں
کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
پھیلی شمیمِ یار مرے اشک سُرخ سے
چینِ جبیں کو دیکھ کے دل بستہ تر ہوا

(۷)

شوقِ ثواب نے مجھے ڈالا عذاب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں
دل کو غضب فشار ہوا پیچ و تاب میں
کیسی کشود کار کشادِ نقاب میں

له اُس صنم جانفزا کے حُسن میں وہ دلکشی ہے کہ اُسکی بدولت جہانِ ویران میں میرا دل لگ گیا۔

له میں نے شوق ثواب کی خاطر مے و معشوق کو ترک کیا تھا مگر اب اُنکی جُدائی میں جل رہا ہوں۔ یعنی جس عذاب کے خوف سے مے و معشوق کو چھوڑا تھا وہی پیش آیا۔

له پیچ و تاب کی حالت میں میرے دل پر سخت دباؤ پڑا اور اشک سُرخ دل سے آنکھوں کی راہ نکلے۔ جس طرح پھولوں کے نچوڑنے سے عطر نکلتا ہے۔ مگر عطر سے خوشبو برآمد ہوتی ہے۔ یہاں میرے اشک سُرخ سے بوے یار پھیلی کیونکہ وہی میرے اندر بسا ہوا ہے۔ له پہلے تو اُمید تھی کہ روے یار سے نقاب اُٹھے گی تو کشود کار (کامیابی) نصیب ہوگی۔ مگر جب نقاب اُٹھی تو چین جبیں نظر آئی جس سے اور زیادہ دل گرفتگی بڑھ گئی۔ بستہ کشود اور کشاد میں رعایت ہے۔

۱ ہم کچھ تو بد تھے جب نہ کیا یار نے پسند — اے حسرت اسقدر غلطی انتخاب میں

رہتے ہیں جمع کوچۂ جاناں میں خاص و عام — آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں

۲ آنکھ اُسکی پھر گئی تھی دل اپنا بھی پھر گیا — یہ اور انقلاب ہوا انقلاب میں

ق

۳ بدنام میرے گریۂ رسوا سے ہو چکے — اب عذر کیا رہا نگہِ بے حجاب میں

مطلب کی جستجو نے یہ کیا حال کر دیا — حسرت بھی اب نہیں دلِ ناکامیاب میں

۴ گویا کہ رو رہا ہوں رقیبوں کی جان کو — آتش زبانہ زن ہوئی طوفانِ آب میں

ناکامیوں سے کام رہا عمر بھر ہمیں — پیری میں یاس ہے جو ہوس تھی شباب میں

۵ ہے اختیار یار میں سود و زیاں مگر — فاضل تھے ہم جہاں سے قضا کے حساب میں

۶ ناصح ہے عیب جوئے و دل آزار اسقدر — گویا ثواب ہے سخنِ ناصواب میں

۷ دونوں کا ایک حال ہے یہ مدعا ہو کاش — وہ ہی خط اُس نے بھیج دیا کیوں جواب میں

---

۱ اے حسرت تو نے ہمیں منتخب کرنے میں غلطی کی - ہم اگر کسی قابل ہوتے تو معشوق کی نظرِ انتخاب میں کیوں نہ آتے - ۲ ہم سے محبوب کی آنکھ پھر گئی تھی - یہی کیا کم تھا - اب ہمارا دل بھی ہم سے پھر گیا - ۳ میرے رونے نے تم کو بدنام تو کر ہی دیا - اب جو ہونا تھا وہ ہو چکا - اسلئے میری جانب نگہ بے حجاب کرنے میں کیا تامل ہے -

۴ میرے گریہ سے طوفان آب برپا ہوا اور طوفان میں سے آگ کے شعلے اُٹھنے لگے - گویا میں رقیبوں کی جان کو رو رہا ہوں جسکے اثر سے رونے میں طوفان کی کیفیت اور آتش رقابت کی بنا پر شعلہ ہائے آتش کی شکل پیدا ہو گئی - زبانہ زن = شعلہ زن -

۵ تمام نفع و نقصان یار (معشوق حقیقی) کے اختیار میں ہے - وہ جسے جو چاہے دے مگر ہم ایسے بے نصیب تھے کہ نہ ہم کو نفع ملا نہ نقصان - گویا ہم قضا کے حساب میں تمام جہان سے الگ مد فاضل تھے -

۶ ناصح نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ سخن ناصواب (عیب جوئی و دلآزاری) میں ثواب ہے - ۷ شاعر نے معشوق کو خط بھیجا جو بجنسہ اُس نے بگڑ کر واپس کر دیا - شاعر کہتا ہے کہ کاش اس واپسی کی وجہ یہ ہو کہ دونوں کا ایک حال ہے یعنی اشتیاق کے بارے میں مضمون واحد ہے - یہ طفل تسلی بھی خوب ہے -

تقدیر بھی بُری مری تدبیر بھی بُری — بگڑے وہ پرسشِ سببِ اجتناب میں

کیا[۱۱] جلوے یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں — بے بادہ مست ہوں میں شبِ ماہتاب میں

ہے[۱۲] منتوں کا وقت شکایت رہی رہی — آئے تو ہیں منانے کو وہ پر عتاب میں

تیری[۱۳] جفا نہ ہو تو ہے سب دشمنوں سے امن — بدمست غیر محو دل اور بخت خواب میں

ہیہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

۱۶۵

ہیہم[۱] بیداد و ستم کچھ دلِ مضطر میں نہیں — یوں ہوں نالاں کہ وہ گویا صفِ محشر میں نہیں

خار[۲] بستر پہ شبِ ہجر بچھاؤں کیونکر — دل میں تو ہے وہ گل اندام اگر بر میں نہیں

سر پٹکتا ہوں کہ بس ہم بھی نہوں گھر بھی نہ ہو — دھیان جس وقت یہ آتا ہے کہ وہ گھر میں نہیں

مجھ سے میکش کی طرف محتسب آتا ہے تو آئے — ایک قطرہ بھی سبو و خم و ساغر میں نہیں

---

۱۱ شبِ ماہتاب کو دیکھ کر جلوہ ما ہوش یاد آیا اور میں بے پئے مست ہوگیا۔

۱۲ محبوب اگرچہ میرے منانے کے لئے آیا ہے مگر چونکہ عتاب کی حالت میں آیا ہے اسلئے مجھے منت کرنی چاہئے شکایت کا موقع جاتا رہا ہے تو جانے دو۔ دستور یہ ہے کہ جب کوئی مناتا ہے تو اُس سے شکایت کی جاتی ہے اور جب عتاب میں ہوتا ہے تو اُسکی منت کی جاتی ہے۔

۱۳ شاعر نے غیر[۱]۔ دل[۲] اور بخت[۳] تینوں کو اپنا دشمن قرار دیا ہے مگر چونکہ وہ بدمست[۱]۔ محو[۲]۔ اور خوابیدہ[۳] ہیں اسلئے اُنسے ضرر کا اندیشہ نہیں۔

۱ میں محشر میں اس بے باکی سے نالے کر رہا ہوں کہ گویا معشوق یہاں موجود نہیں ورنہ دنیا میں اُسکی بیداد کے خوف سے نالہ کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ ۲ میری ایذا پسندی کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہجر میں بستر پر خار بچھاتا۔ مگر یہ ڈر لگتا ہے کہ اُس گل اندام کو (جو میرے دل میں ہے) اذیت پہونچیگی۔ مگر شاعرانہ ہے۔

جی اُٹھے اور وہی رنجِ محبت کے عذاب[۵۳] — ہم نہ مانیں گے کہ ایذا تری ٹھوکر میں نہیں

ہمنفس[۵۴] کیونکہ مسخر وہ پری رو ہوگا — نام اہلِ ہوس اور افسونگر میں نہیں

قطعِ[۵۵] اُمید سے سر کاٹنے کو کیا نسبت — مجھ میں وہ دَم ہے ابھی جو ترے خنجر میں نہیں

دے[۵۶] دیا کیجئے بوسہ طلبِ اوّل پر — سچ کہا تم نے مزا حرفِ مکرّر میں نہیں

کیا موثر ہو دعا وصل صنم کی مومن — ہم طلب کرتے ہیں وہ شے جو مقدر میں نہیں

ردیف الواو

۱۳۵۹

سُرمگیں[۱] آنکھ سے تم نامہ لگاتے کیوں ہو — خاک میں نام کو دشمن کے ملاتے کیوں ہو

گرم جولاں مرے مدفن پہ تم آتے کیوں ہو — اپنے دل سوختہ کی خاک اُڑاتے کیوں ہو

۵۳ یہ بات شاعر کے نزدیک طے شدہ ہے کہ معشوق کی ٹھوکر میں جاں بخشی کا اثر ہے۔ مگر کہتا ہے کہ تیری ٹھوکر میں ایذا ضرور ہے کیونکہ اگرچہ ہم اُسکی تاثیر سے جی اُٹھے۔ تاہم وہی اگلا سا عذابِ محبت باقی ہے۔ ۵۴ اے ہمدم فسونگر کے عمل تسخیر سے اس پری رو کا مسخّر ہونا خیال خام ہے کیونکہ وہ اگر کسی کا مسخر ہے تو اہل ہوس (رقیبوں) کا اور اہل ہوس کا نام عمل فسوں میں شامل نہیں۔ الفاظ میں رعایت ہے۔

۵۵ تیرا خنجر سر کاٹتا ہے اور میں اُمید قطع کرتا ہوں۔ اسلئے مجھ میں جو دَم ہے تیرے خنجر میں نہیں۔ کیونکہ جو اہم کام (قطعِ اُمید) میں کر سکتا ہوں تیرے خنجر کے اختیار سے باہر ہے۔ ابھی سے یہ مراد ہے کہ ہنوز جبکہ موت کے کنارے ہوں۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ تیرا خنجر میرا سر کاٹ سکتا ہے مگر میرے رشتۂ اُمید کو قطع نہیں کر سکتا۔ ۵۶ عاشق نے پہلے بوسہ طلب کیا۔ معشوق نے اعراض کیا۔ دوبارہ مانگا تو اُس نے جواب دیا کہ حرف مکرر میں مزا نہیں۔ عاشق کہتا ہے کہ اگر ایسا ہے تو پہلے بار طلب کرنے پر بوسہ دیدیا کیجئے اس طرح اُسی کی بات اُس پر لوٹ دی۔ ۱ سُرمہ کو خاک سے مشابہت دی ہے۔ نامۂ دشمن کی تعظیم سے باز رکھنے کی خوب ترکیب سوچی۔

شعلہ ہائے تپ دل آگ لگاتے کیوں ہو
گر ہو دلسوز[2] مرے مجھکو جلاتے کیوں ہو

کون سے سوختہ اختر کا خیال آتا ہے
سُرمہ[3] جب دیتے ہو تم اشک بہاتے کیوں ہو

بار گردن تو نہیں تیغ ستمگار آخر
جاں نثار و سرِ مشتاق جُھکاتے کیوں ہو

جن سے منظور وفا ہے ہو جفا بھی اُن پر
مجھ سے کچھ کام نہیں ہے تو ستاتے کیوں ہو

کھول[4] دو وعدہ کہ تم پردہ نشیں ہو نہ وصال
آپ چھپتے ہو چھپو بات چھپاتے کیوں ہو

دلِ بیتاب کی اکسیر بناؤ گے کہیں
اس قدر شوق تہِ دل سے جلاتے کیوں ہو

نہیں[5] منظور اگر بوالہوسی کا شکوہ
غیر کو تم مرے اشعار سُناتے کیوں ہو

توڑنا جان کا ہو جائے گا دشوار آخر
چارہ سازو مری اُمید بندھاتے کیوں ہو

اُس نے کیا غیر کو دزدیدہ نظر سے جھانکا
رخنہ ہائے درِ یار آنکھ چُراتے کیوں ہو

خیر[6] ہے کس نے کہا شور قیامت تم کو
نالہ ہائے سحری دھوم مچاتے کیوں ہو

دم قدم سے ہے لگا جان نکل جائے گی
دیکھو سینے سے مرے پاؤں اُٹھاتے کیوں ہو

کُھل گیا عشق صنم طرز سخن سے مومن
اب چھپاتے ہو عبث بات بناتے کیوں ہو

[2] دل سوز = ہمدرد - [3] سُرمہ دینا پہلے سُرمہ لگانے کے معنی میں مستعمل تھا۔
[4] وعدہ وصال کُھل کر کرنا چاہئے کیونکہ تم پردہ نشین سہی تمھارا وعدۂ وصال تو پردہ نشین نہیں جسکے چھپانے کی ضرورت ہو - [5] تم شاید اس لئے غیر کو میرے اشعار سُناتے ہو کہ اُسکی بوالہوسی کا شکوہ منظور ہے - یعنی تم اُس کو یہ جتانا چاہتے ہو کہ مومن اسقدر باوفا ہے اور تو (غیر) ایسا بیوفا
[6] مطلب یہ ہے کہ تم شور قیامت سے بھی بڑھکر ہو۔

۱۶۷

اگر[1] زنجیر کش سوئے بیاباں اپنی وحشت ہو
تو پائے قیس کا ہر ایک چھالا چشم حیرت ہو

ہمارے[2] قتل سے قاتل نہ کیوں غیروں کو عبرت ہو
بہم جوہر سے جوہر تیغ کا جب دستِ حسرت ہو

کسی کے ابروئے خوش خم کا کشتہ ہوں تعجب کیا
جو میری خاک سے تعمیر محرابِ عبادت ہو

دمِ[3] بسمل خیالِ شکوۂ قاتل گر آجاوے
لبِ زخمِ جگر میں دشنہ انگشت ندامت ہو

سمجھتا خوب ہوں میں اس بناوٹ کی لگاوٹ کو
قسم کھا جاؤں گا گر تیرے دل میں کچھ محبت ہو

ہوئے بیخواب آہِ نیم شب سے تو لگے کہنے
کہ سوتوں کو جگا دیتے ہو تم بھی کیا قیامت ہو

جلا[4] جاتا ہوں سوزِ رشک سے مانندِ پروانہ
جلامت اور کو تو گرچہ میری شمعِ تربت ہو

عدو سے بزم میں ہوتی رہی چشمک زنی کیا کیا
نہ دیکھا حال میرا تم بھی کتنے بیمروت ہو

بجائے سبزہ نکلے خاک سے میری زبان ظالم
دلِ نالاں پسِ مردن جو سرگرمِ شکایت ہو

بھلا ایسے صنم کو خاک دل دے کوئی اے مومن
نہ جس کو کچھ مروّت ہو نہ خاطر ہو نہ الفت ہو

---

[1] اگر میرا جنون سیر بیابان کی سلسلہ جنبانی کرے تو میرے جوش وحشت کو دیکھکر پائے قیس کا ہر ایک چھالا چشم حیرت بنجائے۔ [2] جوہر = وہ خطوط جو اصیل تلوار یا آئینہ میں ہوتے ہیں۔ تیغ قاتل پر جوہر کا بہم ہونا دست حسرت ملنے سے مشابہ ہے۔ یعنی جوہر بھی ہمارے قتل پر کف افسوس ملتے ہیں۔ [3] دمِ ذبح اگر مجھے قاتل کی شکایت کا خیال بھی آئے تو میری شرمندگی کا یہ حال ہو کہ لبِ زخم جگر میں خنجر کے ہونے سے انگشت ندامت کی صورت پیدا ہو جاوے۔ قاعدہ ہے کہ ندامت کے وقت لب میں اُنگلی دیتے ہیں۔ زخم جگر کو لب سے اور دشنہ کو انگشت ندامت سے تشبیہ دی ہے۔ [4] میں پروانہ کی طرح رشک کی آگ سے جلا جاتا ہوں اور جلن اس بات کی ہے کہ تم دوسروں کو کیوں جلاتے ہو۔ یعنی مجھے یہ بھی گوارا نہیں کہ تم کسی کو جلاؤ (کہ یہ بھی گونہ ارتباط کی شکل ہے) خواہ وہ میری شمع تربت ہی کیوں نہ ہو۔

۱۶۹

کیسے مجھ سے بگڑے تم اللہ اکبر رات کو — ذبح ہی کرتے جو ہوتا پاس خنجر رات کو

اپنی آوازِ قدم سے بھی وہ ڈر کر رات کو — مڑ کے پیچھے دیکھ لے تھا ہر قدم پر رات کو

ہم میں کیا باقی رہا تھا اے ستمگر رات کو — جاں بلب تھے بچ گئے قسمت سے مر کر رات کو

یاں جو تو اے مہروش تھا جلوہ گستر رات کو — چھٹ رہی تھی کیا ہوائی مہ کے منہ پر رات کو

صرصرِ آہ و فغانِ شعلہ زن طوفانِ اشک — جمع سامان خرابی تھا مرے گھر رات کو

بوئے گل کا اے نسیمِ صبح اب کس کو دماغ — ساتھ سویا ہے ہمارے وہ سمن بر رات کو

صبحِ[1] بزمِ مہتاب کا سا رنگ کیوں ہے گر نہ تھا — بوالہوس کے پاس تو اے ناز پرور رات کو

بزمِ[2] دشمن میں نہ ہو وہ نغمہ گر آتی رہی — ہر فغاں کے ساتھ لب پر جان مضطر رات کو

روزِ[3] ہجراں سے شبِ فرقت نہ ہو کیوں سخت تر — گاہے گاہے دن کو ملتے تھے وہ اکثر رات کو

رشک سے جلتا ہوں روز اے شمعِ بارِ عام ہے — دن کو ہے مجھ پر وہی صدمہ جو تجھ پر رات کو

دیکھئے وہ کونسی شب ہو گی اللہ رے جھوٹ — روز کہتے ہو کہ آؤں گا مقرر رات کو

رہ گئے ہم جھانکنے سے بھی یہ کیا اندھیر ہے — بند کس نے کر دئے تھے روزنِ در رات کو

بن ترے پیشِ نظر تھی یہ اندھیری چھا گئی — جائیں آنکھیں پھوٹ گر دیکھے ہوں اختر رات کو

کود کر گھر میں تو پہونچا میں ترے پر کیا کروں — دم نکل جاتا تھا کھٹکے کے برابر رات کو

یاد[4] دلوائی تپش نے تیری شوخی وصل کی — مر گئے ہم دیکھ کر چیں ہائے بستر رات کو

---

[1] تیرا رنگ اس طرح فق ہو گیا ہے جس طرح صبح کو چاند کی حالت ہوتی ہے۔ [2] آتی رہی کا تعلق مصرع ثانی سے ہے۔ [3] دوست سے ملاقات دن کو کمتر اور رات کو بیشتر ہوتی تھی اسلئے ہجر میں گذشتہ ایامِ عیش یاد آکر دن سے زیادہ رات میں مجھ پر اذیت گذرتی ہے۔

[4] ہم ہجر میں اس قدر تڑپے کہ تمام بستر شکن آلودہ ہو گیا۔ بستر کی شکن دیکھ کر ہمیں تیری وصال کی شوخیاں یاد آئیں اور جان نکل گئی۔

کیا کہوں تم جو نہ آئے کیا قیامت آ گئی		میہماں تھا میرے گھر میں روزِ محشر رات کو
کیا اُسی بتخانہ کو فرماتے ہو ظلمت کدہ[۵] حضرتِ مومن جہاں جاتے ہو چھپکر رات کو		
آنکھوں[۱] سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو	۱۲۹	ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو
اُس[۲] بُت کے لئے مَیں ہوسِ حور سے گذرا		اس عشق خوش انجام کا آغاز تو دیکھو
چشمک[۳] مری وحشت پہ ہے کیا حضرتِ ناصح		طرزِ نگہِ چشم فسوں ساز تو دیکھو
اربابِ[۴] ہوس ہار کے بھی جان پہ کھیلے		کم طالعیِ عاشقِ جانباز تو دیکھو
مجلس[۵] میں مرے ذکر کے آتے ہی اُٹھے وہ		بدنامیِ عُشاق کا اعزاز تو دیکھو

۵ مومن بتخانے کو کفر کی مناسبت سے ظلمت کدہ کہتا ہے مگر خود رات کو چھپکر وہیں پہونچتا ہے شعر میں طنز کا پہلو ہے۔

۱ [illegible] آنکھوں کا اندازِ حیا در اصل رقیبوں پر ستم ہے۔ کیونکہ وہ بے تکلفی کے خواہاں ہیں [illegible] کی منافی ہے۔ دوست کا ناز معشوقانہ یہ ہے کہ وہ ایسے نا اہلوں پر جفا کرتا ہے جو جفاسہی کے [illegible] نہیں۔ ۲ میں نے اُس بُت کی خاطر حوروں کی تمنّا چھوڑدی۔ عشق خوش انجام کا آغاز تو یہ تھا۔ [illegible] لیا ہو۔ خوش انجام کا لفظ طنزاً استعمال کیا ہے۔ اگر خوش انجام کو حقیقی معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ابھی تو (کہ ابتدائے عشق ہے) بت کے سودے میں خیال حور سے کنارہ کش ہوا ہوں۔ آخر میں جب وصال بُت میسّر ہوگا تو اُسکے سامنے کائنات کی تمام لذتیں ہیچ ہو جائیں گی۔

۳ میری وحشت پر کیوں اعتراض کرتے ہو۔ محبوب کی سحر آفریں نگاہوں کو دیکھو تو معلوم ہو کہ میری وحشت حق بجانب ہے۔ ۴ رقیب امتحان گاہِ محبت میں ناکام رہے مگر جی چھوڑ کر بھاگنے کے بجائے اپنی جان پر کھیل گئے (یعنی مر گئے) یہ بھی عاشقِ جاں باز کی بدقسمتی کہ اس طرح بوالہوسوں کو اُس سے گونہ ہم طرحی کا دعویٰ ہو گیا۔

۵ مجلس میں عاشقِ بدنام کا کسی نے ذکر کیا تھا کہ معشوق نفرت کی وجہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ عاشق اپنے دل کو تسلی دیتا ہے کہ اُسکا کھڑا ہونا نفرت کی بنا پر نہیں بلکہ عاشقوں کی بدنامی کی تعظیم منظور ہے۔

محفل[7] میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے
منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

اس[8] غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

دیں[9] پاکیِ دامن کی گواہی مرے آنسو
اس یوسفِ بیدرد کا اعجاز تو دیکھو

جنّت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بتوں سے
جَورِ اجلِ تفرقہ پرداز تو دیکھو

یہ قدرت ضعف میں بھی ہے فغاں کو
کہ دے پٹکے زمیں پر آسماں کو

وفا سکھلا رہے گا دل ہمارا
تمھاری خاطرِ نامہرباں کو

پڑی ہے اُس گلی میں لاش دشمن
اُٹھاؤں کیونکر اُس بارِ گراں کو

کہاں ہے تابِ نازِ برق لے کاش[10]
جلا دے آتشِ گل آشیاں کو

پسینے کی جگہ آنے لگا خوں
چھپاؤں کس طرح زخمِ نہاں کو

سمجھتا[11] کیونکہ دیوانے کی باتیں
نہ پایا محرم اپنے رازداں کو

[7] تاڑنے والے تمھاری دزدیدہ نظری سے تاڑ جائیں گے کہ ان کو اغیار سے ربط ہے۔
[8] ناہید = زہرہ جسکو مطربۂ فلک بھی کہتے ہیں۔ دیپک ایک قسم کا راگ ہے جسکے گانے سے آگ لگ جاتی ہے۔
[9] حضرت یوسفؑ کا یہ اعجاز تھا کہ ایک شیرخوار لڑکے نے اُنکی پاکدامنی کی شہادت دی تھی۔ شاعر کہتا ہے کہ میرے یوسف بیدرد (معشوق) کا معجزہ دیکھو کہ میرے طفلِ اشک اُسکی پاکیِ دامن کی گواہی دیتے ہیں یعنی میرا رونا اس امر کا ثبوت ہے کہ میں محرومِ وصالِ یار رہا ہوں۔ آنسو کو طفل قرار دینا شعرا کے یہاں عام الورود ہے۔
[10] آتشِ گل = پھولوں کی سُرخی جو آگ سے مشابہ ہے۔ کاش آتشِ گل ہی میرے آشیانے کو جلا کر خاک کردے اسکے لئے برق کا احسان کون اُٹھائے۔ یعنی حسنِ گل ہی میری خانہ بربادی کے لئے کافی ہے۔ [11] میرا رازداں دراصل میرے رازِ محبّت کی حقیقت سے ناواقف ہے۔ اسلئے کہ میں جنونِ عشق میں اپنا بھید کہہ بھی گذرتا ہوں تو وہ سمجھتا نہیں۔ ظاہر ہے کہ دیوانے کی بات کون سمجھے۔

عدو کے گھر میں ہے تصویرِ شیریں — دکھاؤں کس طرح اُس بدگماں کو
نہیں[۲۹] آتا وہ لیلیٰ وش سکھا دے — کوئی مجنوں کا قصہ ساربان کو
ہمارا[۳۰] غش ؟ کیا مرجائیں تو بھی — نہ کھولے طرّۂ عنبر فشاں کو
دیا اُس بدگماں کو طعنۂ غیر — غضب ہے کیا کہوں اپنی زباں کو
دلِ مضطر کی بیتابی نے مارا — کہاں سے روں اُس آرامِ جاں کو

سن اے مومن یہ ایماں ہے ہمارا
نہ کہنا کفر پھر عشقِ بتاں کو

۱۵۱

ایسے[۳۱] سے کیا درستیِ پیماں بستہ ہو — جو قول دے تو رنگِ حنا کا شکستہ ہو
دم[۳۲] ہی اُلٹ گیا جو سنا ہے ترا مریض — کیا حضرتِ مسیح سے درماں خستہ ہو
پروانہ وار گرمِ تپش ہیں قلق سے ہم — تم شوخیوں سے شعلۂ[۳۳] بیتاب جستہ ہو
کیوں[۳۴] جوشِ گریۂ شادی ہوں چشمِ تر — صبحِ شبِ وصال کا گر بند رستہ ہو

[۲۹] لیلیٰ عاشق نواز تھی اور مجنوں کے دیکھنے کے لئے صحرا کو گئی تھی۔ مومن کہتا ہے کہ وہ لیلیٰ وش (محبوب) میرے پاس نہیں آتا۔ کاش کوئی اُسکے ساربان کو قصۂ مجنوں سکھا دے۔ تاکہ وہ بر سبیل تذکرہ اسکو سنائے اور میری ملاقات کا محرک ہو۔

[۳۰] وہ بحیرِ غش ہونے پر طرّۂ زلف کیوں سنگھانے لگے۔ اُن سے تو یہ اُمید بھی نہیں کہ مرنے پر میرے ماتم میں بال کھولیں۔

[۳۱] وہ اس قدر بے وفا ہے کہ جب قول دینے کے لئے ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہے تو اُسکے دستِ نگارین کی حنا کا رنگ شکستہ ہو جاتا ہے (یعنی اُڑ جاتا ہے) پھر ایسے سے کیا توقع ہو کہ عہد باندھکر شکستِ عہد کا مرتکب نہ ہوگا۔ [۳۲] حضرت مسیحؑ نے جب یہ سنا کہ عاشق تیرا مریض ہے تو (معاذ اللہ) دفعتہً اُن کے اوسان خطا ہوگئے کیونکہ ایسا مریض ناقابل علاج ہے۔

[۳۳] شعلۂ بیتاب جستہ = شعلہ جو بیقرار ہو کر بھڑک اُٹھے۔

[۳۴] عاشق شبِ وصال خوشی کا رونا روتا ہے اور اپنے چشمِ تر سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اگر تیری بدولت صبحِ وصال کے آنے کی راہ بند ہو جائے تو میں تیرا شکر گزار رہوں گا۔

کب[۵۵] جان دے ہے بسمل ابرو نہ جب تلک شاید کبھی وہ میکش بدمست منہ لگائے	خنجر کا تیرے شاخ غزالاں کا دستہ ہو خاک اپنی کاش دُردِ[۵۶] تہِ خم نشستہ ہو

مومن نہ توڑ رشتۂ زنّار برہمن
مت کر وہ بات جس سے کوئی دل شکستہ ہو

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو ۱۵۴	وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر	مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں	وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی بیٹھے سب میں جو روبرو تو اشارتوں ہی سے گفتگو	وہ بیان شوق کا برملا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم	گلۂ ملامتِ اقربا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمھارے جی کو بری لگی ۲۰۶	تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی	کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
سنو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا	سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کہا میں نے بات وہ کوٹھے کی مرے دل سے صاف اتر گئی	تو کہا کہ جانے مری بلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا	وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

۵۵ جب تک تیرے خنجر کا دستہ شاخ غزالاں (ہرن کے سینگ) کا نہ ہوگا تیرے ابرو کا بسمل (عاشق) جان نہ دے گا۔ شاخ غزالاں کی خصوصیت اس لئے ہے کہ وہ پورے طور پر ابروے یار سے مشابہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ میرے قتل کے لئے خنجر کافی نہیں۔ بلکہ مناسبت ابروے جاناں چاہئے۔

۵۶ دُردِ تہِ خم نشستہ = شراب کی تلچھٹ جو خم کے نیچے بیٹھ جائے۔

آئے ہو جب بڑھا کر دل کی جلن گئے ہو — جوں سوزِ دل کہا ہے تم آگ بن گئے ہو

روٹھے سو روٹھے ہم سے ملتے نہیں ہو کیونکر — غیروں سے جب لڑے ہو لڑتے ہی مَن گئے ہو

باقی[۱] نہیں کدورت شوقِ ستم کی ہرگز — کیا اے دل و جگر تم تیروں سے چھن گئے ہو

جاؤ تو جاؤ سوئے دشمن سوئے فلک کیوں — اے گرم نالہائے آتش فگن گئے ہو

بادِ بہار میں ہے کچھ اور عطر ریزی — تم آج کل میں شاید سوئے چمن گئے ہو

کیا حال ہے عدم کا کہلا تو بھیجو جو تم — اے خوگرانِ غربت[۲] سوئے وطن گئے ہو

ہے کچھ تو بات مومن جو چھا گئی خموشی
کس بُت کو دے دیا دل کیوں بُت سے بن گئے ہو

۱۵۴

پونچھنے[۳] سے ہر مو دریا ہے کیونکر خشک ہو — سب کے دامن تر ہوں پر کب دیدۂ تر خشک ہو

آہ کی گرمی سے دنیا میں ہو جو تر خشک ہو — نوحؑ کا طوفاں بھی ہو تو خشک ہو پر خشک ہو

اُف رے سوزِ نالہ واللہ رے سیلابِ سرشک — اس سے تر روئے زمیں اُس سے سمندر خشک ہو

سوزِ دل آبِ[۴] جگر لینے دے دم تو کب تلک — تر رہیں آنکھیں ہمیشہ اور لب اکثر خشک ہو

موج زن ہے ایک دریا ہائے جوشِ اشک ہائے — آستیں ہو جائے تر داماں تر گر خشک ہو

[۱] جب کسی چیز میں روزن ہو جاتے ہیں تو اُسکے اندر کوئی چیز نہیں ٹھیرتی - عاشق کہتا ہے کہ میرے دل اور جگر میں شوقِ ستم کشی کے پورا نہ ہونے کی وجہ سے گرد ملال تھی - مگر جب سے دل و جگر قاتل کے تیروں سے چھن گئے وہ گرد ملال (کدورت) نکل گئی -

[۲] غربت سے دنیا اور وطن سے ملک عدم مراد ہے -

[۳] میرے دیدہ تر کے پونچھنے والوں کے دامن تر ہو جائینگے مگر یہ دریا (دیدۂ تر) خشک نہ ہوگا -

[۴] آبِ جگر سے یہ مراد ہے کہ جگر پانی ہو کر آنکھوں کی راہ بہا جاتا ہے -

شمع[1] ساں میں سوزِ گریہ سے سراپا جل گیا
ہے تعجب گر شجر پانی کے اندر خشک ہو

ابر بھی کھل جائے ہے دریا بھی گہہ تھم جائے ہے
دیدۂ پرنم کبھی تو بھی تو دم بھر خشک ہو

روزِ محشر آپ کے اس تشنۂ دیدار کا
حلق تشنہ تر نہ ہو اور حوضِ کوثر خشک ہو

گریۂ[2] خونیں کو قصدِ عالمِ بالا ہے پھر
کیوں نہ خوں روحانیوں کا آسماں پر خشک ہو

تشنہ کامِ عشق ہوں گر خاک سے میری بنے
آب جوں جوں بھرئیے ووں ووں اور ساغر خشک ہو

رونے کی جا ہے اگر ہو بعد ملنے کے فراق
ہے غضب گر نخل کوئی پھول پھل کر خشک ہو

نیش

شعر تر وہ ہیں مرے مومن کہ ہنگامِ جواب
خوف سے منہ اور زبانِ ہر سخنور خشک ہو

۱۵۴

اے ناصحو آ ہی گیا وہ فتنۂ ایام لو
ہم کو تو کہتے تھے بھلا اب تم تو دل کو تھام لو

مجنوں[1] محوِ یار ہوں سودے کا میرے کیا علاج
گر چارہ ساز و ہو سکے تو فصد لیلیٰ فام لو

کیا قہر ہے کب تاک کوئی رہ جائے آنسو پی کے یوں
ہنس ہنس کے میرے آگے تم دستِ عدو سے جام لو

[1] درخت اگر پانی میں کھڑا ہو تو خشک نہیں ہوتا۔ مگر میرا معاملہ بر عکس ہے۔ کیونکہ میں اشکوں کی گرمی کی وجہ سے شمع کی طرح سرتاپا جل گیا۔

[2] یعنی یہ سیلاب (گریہ خوں) فرشتوں کو غرق کرکے چھوڑے گا۔ روحانی یعنی فرشتہ۔

[1] سودا کی حالت میں مریض کی فصد لیجاتی ہے تاکہ خونِ فاسد کے اخراج سے مزاج کی اصلاح ہو۔ شاعر چارہ سازوں سے مخاطب ہوکر کہتا ہے کہ یوں تو میرے سودے کا علاج ناممکن ہے۔ ہاں اگر ہو سکے تو اُس لیلیٰ فام (محبوب) کی فصد کھولو اور چونکہ اُسکے عشق میں میری محویت حد کو پہونچ گئی ہے اسلیئے اُدھر اُس کی فصد کھلے گی اِدھر میرے جسم سے خون نکلے گا اور آخر جوشِ جنوں کو افاقہ ہو گا۔ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ لیلیٰ نے فصد کھلوائی اور مجنوں کی رگ سے خون جاری ہو گیا۔

بندے ہیں ہم صیاد کے کہتا ہے کس لطف سے	گر ہو سکے راہِ چمن اے رستگانِ دام لو
ایسی ادا سے بوسہ دو لب کا کہ شادی مرگ ہوں	جور و ستم کا میری جاں لطف و کرم سے کام لو
بختِ سیاہ اے منعمو آخر ملائے خاک میں	یک چند ملکِ ہند لو یا سرزمینِ شام لو
دن رات فکرِ جور میں یوں رنج اٹھاتا کب تلک	میں بھی ذرا آرام لوں تم بھی ذرا آرام لو
پھر سوے مقتل آئے وہ ہاتھ آئے تو بہرِ نثار	اے کشتگانِ شوق جاں زندوں سے سودے دام لو

مومن تم اور عشقِ بتاں اے پیر و مرشد خیر ہے
یہ ذکر اور منہ آپ کا صاحب خدا کا نام لو

یہ مایوسیِ دل و جاں نالۂ شبگیر تو کھینچو	۱۵۵	کھینچے گا اُس کا دل آہِ فسوں تاثیر تو کھینچو
شفیعِ بیگناہاں ہے نزاکت اس کلائی کی		بھلا خوں تو کروگے پہلے تم شمشیر تو کھینچو
سبکروحِ تجرد بھی کہیں پابند ہوتا ہے		شمیمِ گل کی نقاشو بھلا تصویر تو کھینچو

ہم تو صیاد کی محبت میں گرفتار ہیں اور وہ ہم کو دام سے رہا کرکے کس ادا سے کہتا ہے کہ اب ہو سکے تو چمن کی راہ لو۔ — اگر تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو تو اُسکی آسان تدبیر یہ ہے کہ مجھے اس ادا سے بوسۂ لب دے دو۔ کہ شادی مرگ ہو جاؤں اور کرم سے وہی مقصد حاصل ہو جائے جو ستم سے ہوتا۔

قاتل دوبارہ مقتل میں آیا ہے۔ اے کشتگانِ شوق تم تو اپنا نقد جان نذر کر چکے۔ اب اگر ممکن ہو سکے تو اُس پر نچھاور کرنے کے لئے زندوں سے جان کا سودا بطور قرض کرلو۔ یعنی زندوں سے جان قرض لیکر قاتل پر نثار کردو۔ دام بمعنی قرض۔

تمھاری کلائی کی نزاکت ہم بے گناہوں کی سفارش خواہ ہے۔ یعنی نزاکت قتل سے مانع ہے۔ خون کرنا تو درکنار تم سے شمشیر کھینچنا ہی مشکل ہے۔

تجرد = تعلقاتِ دنیا سے علحدگی۔ سبکروحِ تجرد = وہ شخص جسکی روح علائق کے بوجھ سے گرانبار نہ ہو۔ سبکروح تجرد پابند علائق نہیں ہو سکتا جس طرح بوئے گل کی (کہ بیحد سُبک ہوتی ہے) تصویر نہیں کھینچی جاسکتی۔ پہلا مصرع دعوی ہے اور دوسرا دلیل۔ شعر مثالیہ ہے۔

وہ آئے یا نہ آئے زیست میری ہو نہ ہو لیکن
اثر ہوتا ہے کب ہم سے وفاداروں کو ناصح[۳]
سرِ زور آزمائی جذبِ دل کو آج ہی دیکھو[۴]
عبث نالش ہے آہ تیرہ روزِ چشمِ جادو کی[۵]
دکھا دونگا تماشا بس نہ چھیڑو مجھ سے مجنوں کو

ذرا اے چارہ سازو زحمتِ تدبیر تو کھینچو
فغاں سے پیشتر تم خجلتِ تقریر تو کھینچو
کھنچے گا ہاتھ سینے سے تم اپنا تیر تو کھینچو
وہاں بندِ ہوس سُرمہ کی اک تحریر تو کھینچو
ہلا دوں گا زمین و آسماں زنجیر تو کھینچو

نو

کہاں اُس نوجواں کے ناز کی طاقت تجھے مومن
ابھی سرِ مشق[۶] تو ہو جورِ چرخِ پیر تو کھینچو

۱۵۸

اعجاز جاں دہی ہے ہمارے کلام کو
لکھو سلام غیر کے خط میں غلام کو
اب شور ہے مثال جو دی اس خرام کو[۷]

زندہ کیا ہے ہم نے مسیحا کے نام کو
بندے کا بس سلام ہے ایسے سلام کو
یوں کون جانتا تھا قیامت کے نام کو

۳ ناصح تو فغاں کرنے سے روکتا ہے مگر ہم پر اثر نہیں ہوتا - ہم تو فغاں ضرور کھینچیں گے مگر تو پہلے اِس تقریر بے حاصل پر شرمندگی تو کھینچ - شاعر نے فغاں کشیدن اور خجلت کشیدن کا ترجمہ کر دیا ہے - ۴ اگر تم میرے جذب دل کو بر سرِ زور آزمائی دیکھنا چاہتے ہو تو آج ہی امتحان کر لو - اُسکی صورت یہ ہے کہ اپنے تیر کو جو میرے دل میں پیوست ہے سینے سے کھینچو - نتیجہ یہ ہوگا کہ جذب دل کے اثر سے خود تمھارا ہاتھ میری طرف کھنچ آئے گا -

۵ نالش = شکایت - تیرہ روزِ چشم جادو = معشوق کی سحر بھری نگاہوں کا عاشق بدنصیب وہاں بندِ ہوس = بوالہوس کا مُنہ بند کرنے والا - وہاں بند اُس تعویذ کو بھی کہتے ہیں جس سے کسی کا منہ کیل دیا جائے رقیب آکر مجھ بدنصیب کی آہ کی تم سے شکایت فضول کرتے ہیں - تم ذرا اپنی آنکھوں میں سرمہ کی تحریر کھینچو - پھر دیکھنا کہ اُن کے ہوس کا مُنہ کیونکر نہ بند ہوگا - یعنی رقیب بھی خود آہ کرنے پر مجبور ہوں گے اور میری آہ کی شکایت کرنا چھوڑ دیں گے -

۶ سرمشق = قطعہ جس پر خوشنویسی کی مشق کی جائے - یعنی پہلے سرمشق تو بن لو کیونکہ اُس نوجوان کا ناز چرخ پیر کے جور سے زیادہ جانستاں ہے -

۷ جب سے ہم نے خرام یار کو قیامت سے مثال دی ہے دُنیا میں قیامت کا نام مشہور ہو گیا ہے پہلے کوئی جانتا بھی نہ تھا -

آتا ہے بہر قتل وہ دور اے ہجوم یاس
گھبرا نہ جائے دیکھ کہیں ازدحام کو

گو آپ نے جواب بُرا ہی دیا و لے
مجھ سے بیاں نہ کیجے عدو کے پیام کو

یاں[۱] وصل ہے تلافیِ ہجراں میں اے فلک
کیوں سوچتا ہے تازہ ستم انتقام کو

تیرے[۲] سمند ناز کی بیجا شرارتیں
کرتی ہیں آگ نالۂ اندیشہ گام کو

گریہ پہ میرے زندہ دلو ہنستے کیا ہو آہ
روتا ہوں اپنے میں دلِ جنت مقام کو

سُن سُن کے تا درست تری خو بگاڑ دی
ہم نے خراب آپ کیا اپنے کام کو

اُس[۳] سے جلا کے غیر کو اُمید پختگی
لگ جائے آگ دل کے خیالاتِ خام کو

بخت[۴] سعید آئینہ داری کرے تو میں
دکھلاؤں دل کے جور اُس آئینہ فام کو

جب[۵] تو چلے جنازۂ عاشق کے ساتھ ساتھ
پھر کون وارثوں کے سُنے اذنِ عام کو

شاید کہ دن پھرے ہیں کسی تیرہ روز کے
اب غیر اُس گلی میں نہیں پھرتے شام کو

مدت سے نام سنتے تھے **مومن** کا بارے آج
دیکھا بھی ہم نے اُس شعرا کے امام کو

---

[۱] اے فلک ہمیں وصل یار میسّر ہوا اور تو ہم سے اس کا انتقام لینے کے واسطے تازہ ستم سوچنے لگا اتنا تو غور کر کہ یہ وصال تو خود سابقہ مصائب ہجر کا معاوضہ ہے۔ لہٰذا حساب برابر ہو گیا۔ اگر کوئی نئی راحت (بے معاوضہ) ملتی تو تجھے ہم سے انتقام لینے کا موقع تھا۔ [۲] نالۂ اندیشہ گام = نالہ جسکے قدم کی رسائی خیال کی طرح دور تک ہو۔ یعنی تیرے ناز کی شوخیِ ناروا میرے نالۂ دُور رس کو اور زیادہ مشتعل کر دیتی ہے (نالہ کو زیادہ تحریک ہوتی ہے)۔ [۳] میرے دل کے خیالات خام کو آگ لگے کہ غیر کو جلا کر محبوب سے استواریِ محبت کی توقع رکھتا ہوں۔ یعنی یہ اُمید رکھتا ہوں کہ میں رقیب کو جلاؤں اور پھر بھی معشوق مجھ سے رشتۂ الفت قائم رکھے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ وہ رقیب کو جلائے اور مجھ سے تعلقات محبّت استوار کرے۔ جلانا۔ آگ۔ پختگی اور خام میں جو خوبی ہے ظاہر ہے۔ [۴] میرا بخت سعید اگر معشوق کے حضور میں آئینہ داری کی خدمت انجام دے تو میں اُس آئینہ فام کو اُسکے ظلم (جو میرے دل پر ہوئے ہیں) دکھاؤں یعنی اگر نصیب یاور ہو تو دوست سے حال دل کہنے کا موقع ملے۔ آئینہ دار = وہ شخص جو کسی کو آئینہ دکھائے۔ آئینہ فام = آئینہ رُو۔ رعایت الفاظ کا ماحصل یہ ہے کہ میرے حال دل کا عکس بخت سعید ہی کی مدد سے اُس آئینہ رو کے دل پر منعکس ہو سکتا ہے۔ [۵] قاعدہ ہے کہ نماز جنازہ کے بعد میت کے وارث اذنِ عام دیتے ہیں کہ جو لوگ کسی ضرورت سے واپس جانا چاہیں چلے جائیں یعنی جب تو میرے جنازے کے ساتھ ہو تو تیرے اشتیاق معیت میں ہزاروں مدفن تک جانے کو تیار ہونگے۔

۱۵۴

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو — عذر کچھ چاہئے ستانے کو

سنگ[۱] در سے ترے نکالی آگ — ہم نے دشمن کا گھر جلانے کو

صبح عشرت ہے وہ نہ شام وصال — ہائے کیا ہوگیا زمانے کو

بوالہوس[۲] روئے میرے گریہ پہ اب — مُنہ کہاں تیرے مُسکرانے کو

برق کا آسمان پر ہے دماغ — پھونک کر میرے آشیانے کو

سنگ[۳] سودا جنوں میں لیتے ہیں — اپنا ہم مقبرہ بنانے کو

شکوہ[۴] ہے غیر کی کدورت کا — سو مرے خاک میں ملانے کو

روزِ محشر بھی ہوش گر آیا — جائیں گے ہم شراب خانے کو

سُن کے وصف اُس پہ مر گیا ہمدم — خوب آیا تھا غم اُٹھانے کو

کوئی دن ہم جہاں میں بیٹھے ہیں — آسماں کے ستم اُٹھانے کو

ق

چل[۵] کے کعبے میں سجدہ کر مومن — چھوڑ اُس بُت کے آستانے کو

نقش پائے رقیب کی محراب — نہیں زیبندہ سر جھکانے کو

۱؎ ہم نے تیرے سنگ در پر اس قدر ناصیہ فرسائی کی کہ اُس سے آگ نکلنے لگی جس سے دشمن کا گھر جل گیا۔ ۲؎ پہلے تم گریہ پر مسکراتے تھے۔ اب میری تباہ حالی اس درجہ کو پہونچ گئی کہ بوالہوس سا سنگدل بھی میرے گریہ پر رونے لگا۔ لہذا تمھارے مُسکرانے کا موقع نہ رہا۔ ۳؎ سنگ سودا ایک قسم کا سیاہ پتھر جو ہلکا اور اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے۔ ہم سنگ سودا مقبرے کے لئے اس واسطے لیتے ہیں کہ مر کر بھی یادگار جنون قائم رہے لفظ سودا اور جنون میں ایہام تناسب ہے۔ ۴؎ یعنی مجھے تمھارا غیر سے اسقدر علاقہ بھی گوارا نہیں کہ تم مجھ سے اسکی کدورت کی شکایت کرو۔ ۵؎ یہ اور شعر مابعد قطعہ بند ہیں شعر دوم کے معنی یہ ہیں کہ اُس بُت کے در پر رقیب کا نقش پا ہے جو محراب سے مشابہ ہے اور مومن کو زیبا نہیں کہ ایسی جگہ سجدہ کرے۔

۱۵۸

صد حیف سینہ سوز فغاں کارگر نہو — یاں جان پر بنے ترے دل میں اثر نہو

دیکھیں[1] غم درونہ پہ کب تک نظر نہو — میرا شگافتہ سینہ ترا چاک در نہو

اے[2] آہ آسماں میں عبث رخنہ گر نہو — ڈرتا ہوں میں نزول بلا بیشتر نہو

فریاد[3] بے گناہ کشی جابجا کروں — گر وہم جاں نثاری پیغامبر نہو

معشوق وہم سے زاہد مفلس کو یاس ہے — قطع تعلقات کس امید پر نہو

ایسے سے قدر مہر و وفا کی امید کیا — جس کو ہنوز اپنے ستم کی خبر نہو

ہوں[4] خانماں خراب ستم سے زیادہ تر — ایسا نہو کہ اب بھی ترے دل میں گھر نہو

عابد فریب شوخی و رغبت فزا نگاہ — میں کیا کسی سے صبر تجھے دیکھکر نہو

اے[5] گردش زمانہ کبھی تو تغیر آئے — حسرت مجھے قبول اگر اس قدر نہو

سودا ہے مجھکو گرمی بازار عشق کا — اس کا کہاں خیال کہ اپنا ضرر نہو

پائے[6] طلب شکستہ نہ کوتاہ دست شوق — ہم بھی ستم کریں جو وہ نازک کمر نہو

حزن[7] و ملال میں ہے دل آزردگی کا وہم — کیسی بری بنے جو گلہ بے اثر نہو

---

[1] دیکھوں تو میرے غم درونہ (غم پنہاں) پر کب تک توجہ کریگا اور جس طرح تو اپنے چاک در کو (تاک جھانک کیلئے) ہر دم پیش نظر رکھتا ہے میرے شگاف سینہ کو (جس سے غم پنہاں کی حالت بخوبی معلوم ہو سکتی ہے) کب تک پیش نظر نہ رکھیگا۔ [2] آسمان سے یوں بھی بلائیں نازل ہوتی ہیں۔ اگر آہ نے شگاف کر دیا تو اور زیادہ بلائیں آئیں گی۔ [3] عاشق کو وہم ہے کہ میرا قاصد (جسکے مرنے کی خبر آئی ہے) کہیں معشوق کے حسن پر شیفتہ ہو کر جان نہ دے بیٹھا ہو۔ اگر یہ بدگمانی نہ ہوتی تو وہ (عاشق) معشوق کی عادت بے گناہ کشی کا لوگوں میں ضرور پرچا کرتا۔ [4] میں تیرے ظلم کی وجہ سے پہلے سے بھی زیادہ خانہ خراب ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اب بھی تیرے دل میں میرا گھر نہ ہو۔ یعنی میرا گھر تو برباد ہو چکا۔ اس حالت پر بھی تیرے دل میں گھر نہ ہوگا تو کہاں ٹھکانا ملے گا۔ [5] میرا یہ مطالبہ نہیں کہ حسرت بالکل نہ رہے۔ صرف یہ خواہش ہے کہ کبھی کبھی اس میں تغیر ہو تا رہے اور جتنی اب ہے اس سے کم ہوتی رہے۔ یعنی میری حسرت انتہائی نقطہ پر پہونچ چکی ہے۔ اب تغیر ہوگا تو کمی کی جانب ہی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ انسان بالطبع تغیر پسند ہے۔ [6] یعنی نزاکت اسکا خیال مانع ہے ورنہ ہم بھی ستم اٹھا کی کرتے ہوتے۔ [7] شکر ہے کہ میری شکایت کا دست پر اثر نہیں ورنہ اسکو حزن و ملال ہوتا اور اسکے ملال سے مجھے دل آزردگی ہوتی۔

ہیں[۸] آرزو سے مرگ کی بے التفاتیاں ‏ ‏ جینا مرا محال تو دشمن اگر نہو

صحبت[۹] میں ایک رات کی وہ تنگ آگئے ‏ ‏ طول امل سے قصہ مرا مختصر نہو

لذت[۱۰] بغیر جان دہی مردگاں محال ‏ ‏ آبِ بقا فشردۂ دامانِ تر نہو

ہیں جاں نثار کہئے تو مرجائیں ہم ابھی ‏ ‏ یہ کام بوالہوس سے کبھی عمر بھر نہو

جب فرق بے کلاہ ہوا چین آگیا ‏ ‏ راحت زیادہ تر ہو اگر تن پہ سر نہو

پامال کیجے شوق سے پر بزم خاص میں ‏ ‏ اتنا تو ہو کہ خاک مری دربدر نہو

سوتے[۱۱] سے اُٹھکر آئے ہیں یارب نجائیں وہ ‏ ‏ شرمندہ آہِ شب سے دعائے سحر نہو

اب[۱۲] کیجے آہ تاب گسل ہر جفا کے ساتھ ‏ ‏ جب جان سے گذر گئے پھر درگذر نہو

مومن ہوا رقیب خدارا صنم پرست
ایسے سے ڈریے جس کو خدا کا بھی ڈر نہو

[۸] تو مجھ سے دشمنی کرتا ہے جس پر میں تنگ آکر مرگ کی آرزو کرتا ہوں - مگر جیسا کہ قاعدہ ہے جس چیز کی آرزو کی جاتی ہے اُس کے حصول میں دشواریاں ہوتی ہیں - اسی لئے مرگ بھی مجھ سے بے التفاتیاں کرتی ہے - اور مَیں مر نہیں سکتا - اگر تو دشمنی نہ کرتا تو میں کبھی کا مر چکا ہوتا - گویا میری زندگی تیری نامہربانی پر موقوف ہے - خیال میں بہت ندرت ہے - [۹] یعنی مجھے خوف ہے کہ کہیں طول مدعا میرا کام تمام نہ کر دے یا رسم محبت ختم نہ کر دے کیونکہ ایک ہی شب کے عرض تمنا میں دوست مجھ سے تنگ آگیا -

[۱۰] آب حیات سے مردوں میں جان آتی ہے جیسا کہ نظامی کہتے ہیں - شگفتہ نشد کا ب حیواں گہر + کہ ندماہی مردہ را جانور مگر جب تک آب حیات میں لذت نہ ہوگی جان بخشی کا اثر ہونا معلوم - اس سے ثابت ہوا کہ اُس میں لذت ضرور ہے - اور چونکہ شاعر کے نزدیک تمام لذتوں کا سرچشمہ دامان تر ہے - اسلئے قیاس چاہتا ہے کہ آب حیات دامان تر کا نچوڑا ہوا ہے جو اس میں اس قدر مزہ ہے - دامان تر (دامن گناہ آلودہ) سے لذت کا تعلق بدیہی ہے - جاں دہی = جان بخشی دیکھو مطلع غزل ۱۵۷ [۱۱] آہ شب نے تو اپنا اثر دکھایا کہ دوست رات سوتے سے اٹھ کر میرے گھر آیا - اب اگر صبح کو وہ چلا گیا تو دعائے سحر کی بے اثری ثابت ہوگی - اسلئے آرزو ہے کہ وہ اب نہ جائے تاکہ میری دعائے سحری شرمندہ نہ ہو - [۱۲] جب جان کا خیال چھوڑ دیا تو آہ میں کوتاہی کیوں کی جائے -

۱۰۹

خالی[1] ہوائے فتنہ سے گا ہے جہاں نہ ہو
اُس دم قیامت آئے اگر آسماں نہ ہو

اعجاز[2] سے زیادہ ہے سحر اُنکے ناز کا
آنکھیں وہ کہہ رہی ہیں جو لب سے بیاں نہ ہو

یوں تو بہت سے دل کے خریدار ہیں و لے
جو ہے سو بد معاملہ کیونکر زیاں نہ ہو

لکھتا[3] ہوں اس کو بستگیِ دل کا ماجرا
آنسو رواں نہ ہو تو سیاہی رواں نہ ہو

شیخِ حرم سے کام نہ پیرِ مغاں سے ربط
کیا کفر و دیں جو پاس وہ زیبا جواں نہ ہو

تر کر دیا ہے ابرِ بہاری نے اس قدر
بجلی گرے تو گرم مرا آشیاں نہ ہو

اب شوق وصل ہے نہ غمِ قربِ مدعی
پامال ہو چکا ہوں عبث سرگراں نہ ہو

کرتی[4] نہ تھیں بگاڑ کی باتیں گلہ میں ہائے
کیسی بنے جو دل سے وہ نامہرباں نہ ہو

عزمِ سفر جہاں سے کروں کیا شبِ فراق
میں جانتا ہوں چین کہاں تو جہاں نہ ہو

اس شرط پر جو لیجے تو حاضر ہے دل ابھی
رنجش نہ ہو فریب نہ ہو امتحاں نہ ہو

یہ[5] جامہ پارہ پارہ تڑپنے سے ہو گیا
صبحِ شبِ فراق ہے تو بدگماں نہ ہو

مومن[6] بہشت و عشقِ حقیقی تمھیں نصیب
ہم کو تو رنج ہو جو غمِ جاوداں نہ ہو

---

[1] دنیا کبھی فتنوں سے خالی نہیں ہوتی۔ اگر جورِ فلک نہ ہو تو فتنۂ قیامت برپا ہو جائے۔

[2] لب کو جاں بخشی کی رعایت سے صاحبِ اعجاز اور آنکھوں کو فتنہ انگیزی کے اعتبار سے ساحر قرار دیا ہے۔ [3] بستگیِ دل = دل گرفتگی۔ انقباض۔ حالِ بستگیِ دل کے لکھنے کا یہ اثر ہے کہ دوات کی سیاہی بھی جم گئی۔ اگر میرے آنسو نہ جاری ہوتے تو سیاہی کا رواں ہونا محال تھا۔

[4] میں نے غلطی کی کہ محبوب سے شکایت میں بگاڑ کی باتیں کیں۔ کیونکہ اگر اُسکی برہمی محض اوپری دل سے ہے تو کسی روز ان باتوں کی بدولت مجھے اُس سے شرمندہ ہونا پڑے گا۔

[5] عاشق کا جامہ پارہ پارہ ہونے سے محبوب کو بدگمانی ہوئی کہ یہ نتیجہ ہے کسی دوسرے حسین کے ساتھ وصال میں کشمکش کا۔ اسلئے اسکی بدگمانی کو دور کرتا ہے۔

[6] شاعر غمِ جاوداں (غمِ عشق) کو بہشت کے عیشِ مخلد پر ترجیح دے رہا ہے۔

ردیف الہاء

١٦٠

چل پرے ہٹ مجھے نہ دکھلا مُنہ
اے شبِ ہجر تیرا کالا مُنہ

آرزوے نظارہ تھی تو نے
اتنی ہی بات پر چھپایا مُنہ

دشمنوں سے بگڑ گئی تو بھی
دیکھتے ہی مجھے بنایا مُنہ

بات پوری کبھی مُنہ سے نکلی نہیں
آپ نے گالیوں پہ کھولا مُنہ

ہو گیا رازِ عشق بے پردہ
اُس نے پردہ سے جو نکالا مُنہ

شبِ غم کا بیان کیا کیجے
ہے بڑی بات اور چھوٹا مُنہ

جب کہا یار سے دکھا صورت
ہنس کے بولا کہ دیکھو اپنا مُنہ

کس[1] کو خونِ جگر پلائے گا
ساغرِ مے کو کیوں لگایا مُنہ

پھر گئی آنکھ مثلِ قبلہ نما
جس طرف اُس صنم نے پھیرا مُنہ

ق

گھر میں بیٹھے تھے کچھ اداس سے وہ
بولے بس دیکھتے ہی میرا مُنہ

ہم بھی غمگین سے ہیں آج کہیں
صبح اُٹھے تجھے دیکھ تیرا مُنہ

سنگِ[2] اسود نہیں ہے چشمِ بتاں
بوسہ مومن طلب کرے کیا مُنہ

١٦١

جو[3] تیرے مُنہ سے ہو شرمسار آئینہ
تو رُخ کرے سوئے آئینہ دار آئینہ

کہے ہے دیکھ کے رخسارِ یار آئینہ
کہ اس صفائی پہ صدقے نثار آئینہ

[1] تو نے ساغرِ شراب کو مُنہ لگایا ہے یقین ہے کہ عاشق اس رشک سے خونِ جگر پئیں گے۔
[2] یعنی بتوں کی چشمِ سیاہ کا رتبہ سنگِ اسود سے بڑھ کر ہے۔
[3] آئینہ تیری صفائی رخ کی وجہ سے شرمندہ ہو کر آئینہ دار سے آنکھیں چراتا ہے یہی سبب ہے کہ وہ اسکی طرف رُخ نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ آئینہ دار کی طرف آئینہ کی پشت ہوتی ہے۔ شعر میں حسنِ تعلیل ہے۔

۱ سیاہ رو نہ کرے ترک الفت گلفام
میں بوالہوس کو دکھاؤں ہزار آئینہ

۲ صفائے دل کی کہاں قدر تیرہ روزی میں
چراغ صبح ہے شبہائے تار آئینہ

۳ سمجھ لیا مگر اس سبز رنگ کو طوطی
کہ ہے نظارہ کا امیدوار آئینہ

۴ وہ سخت جاں ہوں کہ دکھلائیں گر دم مرگ
تو توڑ دے کمر کوہسار آئینہ

۵ مقابل اس رخِ روشن کے کھل گئی قلعی
نہ ٹھہرا آگ پہ سیماب وار آئینہ

سما رہے ہیں مگر تیرے نو بنو جلوے
کہ بن گیا ہے طلسمِ بہار آئینہ

۶ شکستِ رنگ پہ مستی میں ہنستے ہیں ہم بھی
دکھائیں گے انھیں وقتِ خمار آئینہ

۷ مجھے تو کہتے ہو مست دیکھ میری جانب تو
اور آپ دیکھتے ہو بار بار آئینہ

۸ بلا ہے منع وفا نور اڑ گیا ناصح
تو لے کے دیکھ تو رنگِ عذار آئینہ

سمجھ تو مومن اگر ناروا ہے خودبینی
تو دیکھیں کاہے کو پرہیزگار آئینہ

۱ رقیب سیاہ رو اس حسین کی الفت ترک کرنیوالا نہیں۔ اگرچہ میں اسکو ہزار آئینہ دکھاؤں کہ کہاں تیرا منہ کہاں اس کا عشق۔ ۲ سیاہ بختی کی حالت میں صفائے دل کی قدر نہیں ہوتی۔ جس طرح شبہائے تار میں آئینہ چراغِ صبح کی مانند بے رونق ہوتا ہے۔ ۳ قاعدہ ہے کہ طوطی کے آگے تصویردار آئینہ رکھتے ہیں تاکہ وہ اس میں اپنی شبیہ دیکھکر سرگرم گفتار ہو۔ آئینہ نے اُس سبز رنگ دلربا کو شاید طوطی سمجھ لیا ہے کہ اسکے نظارۂ جمال کا اُمیدوار ہے۔ "سبز رنگ" کی مناسبت "طوطی" سے ظاہر ہے۔ اگرچہ سبز رنگ اصطلاح میں سانولے کو کہتے ہیں۔ ۴ میں اسقدر سخت جان ہوں کہ اگر مجھے مرتے وقت آئینہ دکھائیں تو آئینہ جیسی نازک چیز میں اسقدر سختی آجائے کہ پہاڑ کی کمر کو توڑ دے۔ قاعدہ ہے کہ بیہوشی کی حالت میں سکتہ اور موت کے امتیاز کے لئے آئینہ مُنہ کے قریب لیجاتے ہیں۔ آئینہ کا تعلق کوہسار سے ظاہر ہے۔
۵ رُخ روشن کو آگ اور آئینہ کو سیماب سے تشبیہ دی ہے۔ ۶ معشوق مستی کی حالت میں ہے اور میرے رنگ رخ کے اُڑنے پر ہنس رہا ہے۔ اب جب اُسکا نشہ اُترے گا اور رنگ فق ہوگا تو میں اُسکو آئینہ دکھاؤں گا۔
۷ تم اپنے جلوے کے اسقدر مشتاق ہو تو میں اُسکا مشتاق کیوں نہ ہوں۔ ۸ ناصح وفا سے منع کرنا بُرا ہے۔ جس کے اثر سے تیرے چہرے کا نور جاتا رہا۔ ذرا آئینہ اُٹھا کر رنگ رُخ تو دیکھ۔

۱۶۲

سیماب ہے پہلو میں مرے دل تو نہیں یہ ۔۔۔ اس دل نے ستایا مجھے غارت ہو کہیں یہ

معلوم[1] رسائی ترے کانوں تک اگرچہ ۔۔۔ نالہ مرا کہتا ہے کہ ہے عرش بریں یہ

کچھ شور محبت کی تو لذت ہی نہ پوچھو ۔۔۔ ہے آپ کے بھی حسن سے کتنا نمکیں یہ

اِک آہ ہی کرلوں کہ ہو شاید اُسے تاثیر ۔۔۔ فرصت نہیں اب ہے نفسِ بازپسیں یہ

حسرت سے کہا خضر نے دیکھ اُسکی گلی کو ۔۔۔ مرتا ہوں ابھی گر ملے مدفن کو زمیں یہ

کیا یار کے آنے کی سُنی کچھ کہ اجل کی ۔۔۔ کاہے کی خوشی ہجر میں ہے جانِ حزیں یہ

کیوں[2] چھیڑتے ہو مجھکو بُرا ہونے لگا کیوں ۔۔۔ ہے غیر کا نامہ نہ مرا خطِ جبیں یہ

ہاں

یاں[3] پردہ اُٹھا ورنہ کھلا شوقِ نہانی ۔۔۔ اب مجھ سے تو چھپتا نہیں اے پردہ نشیں یہ

یاں کاہے کو وہ آنے لگا اے کششِ دل ۔۔۔ تو لاکھ کہے پر کوئی آتا ہے یقیں یہ

ق

بیدم سا پڑا تھا کوئی اس کوچہ میں اُس نے ۔۔۔ دروازے میں آ جھانک کے دیکھا جو کہیں یہ

اس رحم کے صدقے وہیں گھبرا کے کہا ہاں
جا کر کوئی دیکھو کہیں **مومن** تو نہیں یہ

۱۶۳

دلبستگی سی ہے کسی زلفِ دوتا کے ساتھ ۔۔۔ پالا پڑا ہے ہم کو خدا کس بلا کے ساتھ

کب تک نبھائیے بُتِ ناآشنا کے ساتھ ۔۔۔ (1) کیجے وفا کہاں تلک اُس بیوفا کے ساتھ

یادِ ہوائے یار نے کیا کیا نہ گُل کھلائے ۔۔۔ (2) آئی چمن سے نکہتِ گُل جیبِ صبا کے ساتھ

[1] اگرچہ میرا نالہ عرش کے قریب پہونچ گیا مگر تیرے کانوں تک رسائی محال۔

[2] محبوب نے چھیڑنے کو مزاحاً کہا کہ غیر کا خط بُرا ہے۔ عاشق کہتا ہے کہ یہ کیوں بُرا ہوتا۔ یہ غیر کا نامہ ہے میرا خطِ جبیں (خطِ تقدیر) تھوڑا ہی ہے جو بُرا ہو۔

[3] تیرے نہ پردے کی وجہ سے مجھے اضطراب ہوگا اور رازِ عشق ظاہر ہو جائے گا۔ اسلئے پردہ اُٹھا دے۔

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

ہے کس کا انتظار کہ خوابِ عدم سے بھی
ہر بار چونک پڑتے ہیں آوازِ پا کے ساتھ

یارب[1] وصالِ یار میں کیونکر ہو زندگی
نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ

اللہ رے سوزِ آتشِ غم بعد مرگ بھی
اُٹھتے ہیں میری خاک سے شعلے ہوا کے ساتھ

سو زندگی نثار کروں ایسی موت پر
یوں روئے زار زار تو اہلِ عزا کے ساتھ

ہر دم[3] عرق عرق نگہِ بے حجاب ہے
کس نے نگاہ گرم سے دیکھا حیا کے ساتھ

مرنے کے بعد بھی وہی آوارگی رہی
افسوس جاں گئی نفسِ نارسا کے ساتھ

دستِ جنوں نے میرا گریباں سمجھ لیا
اُلجھا ہے اُن سے شوخ کے بندِ قبا کے ساتھ

آتے ہی تیرے چل دئے سب ورنہ یاس کا
کیسا ہجوم تھا دلِ حسرت فزا کے ساتھ

میں کینے سے بھی خوش ہوں کہ سب تو کہتے ہیں
اُس فتنہ گر کو لاگ ہے اس مبتلا کے ساتھ

مومن وہی غزل پڑھو شب جس سے بزم میں
آتی تھی لب پہ جان زہ و حبذا[5] کے ساتھ

[1] یہ مکرر شاعرانہ اور ندرت خیال قابل داد ہے۔ مرزا غالب نے بھی اسی مضمون کو باندھا ہے مگر اسقدر تغزل اور لطافت پیدا نہ کر سکے۔ مرزا کا شعر ہے۔ خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ + کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے
[2] وصل میں محبوب کی ہر ادا جانستاں ہے۔ پھر زندگی کیونکر ہوگی۔ خیال میں جدت ہے۔ [3] معشوق نے شرم کے ساتھ نگاہ گرم (نگاہ غضب) سے مجھے دیکھا جس کا یہ اثر ہوا کہ میری نگاہ بے حجاب پسینے پسینے ہو گئی۔ اپنی نظر کو بے حجاب اسلئے کہا ہے کہ وہ نظر بازی میں بے باک ہے۔ [4] نفس نارسا = آہ بے اثر جس طرح میری آہ نارسا ہمیشہ اپنی منزل مقصود سے بیگانہ رہی اسی طرح مرنے کے بعد میری روح بھی اپنے ٹھکانے پر پہونچنے کے بجائے بھٹکتی رہی یعنی جو آوارگی حیات میں تھی بعد ممات بھی باقی ہے۔ [5] زہ و حبذا دونوں کلمہ تحسین ہیں۔ جیسے شاباش، مرحبا۔

اُلٹے[1] وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ	بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ
بہرِ عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ	دم ہی نکل گیا مرا آوازِ پا کے ساتھ
بے پردہ[2] وہ غیر پاس اُسے بیٹھا نہ دیکھتے	اُٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ
وہ لالہ رو[3] گیا نہ ہو گلگشتِ باغ کو	کچھ رنگ بو سے گُل کے عوض ہے صبا کے ساتھ
اس کی گلی کہاں یہ تو کچھ باغِ خلد ہے	کس جا پہ مجھکو چھوڑ گئی موت لا کے ساتھ
آتی ہے[4] بوئے داغ شبِ تارِ ہجر میں	سینہ بھی چاک ہو نہ گیا ہو قبا کے ساتھ
گلبانگ[5] کس کا مشورۂ قتل ہو گیا	کچھ آج بوئے خوں ہے وہاں کی ہوا کے ساتھ
تھے[6] وعدے سے پھر آنے کے خوش بے خبر تھی	ہے اپنی زندگانی اُسی بیوفا کے ساتھ

[1] معشوق عاشق سے اپنی جفاؤں کی معذرت کرتا ہے مگر دیکھنا کس ادا کے ساتھ کہتا ہے کہ میں نادم ہوں کہ میں نے تم پر اس قدر ظلم کئے حالانکہ تم میرے ظلم کے متحمل نہ ہونے کی بنا پر اس سلوک کے قابل نہ تھے گویا عذر کا عذر ہے اور شکوہ کا شکوہ۔ شکوہ سے مراد عاشق کی بے طاقتی کا طعنہ ہے کیونکہ وہ ستم برداشت نہ کر سکا۔ [2] جس طرح دنیا سے حیا اُٹھ گئی کاش ہم بھی اُٹھ جاتے کہ یہ رشک نہ سہنا پڑتا۔

[3] صبا کے ساتھ ہمیشہ بوئے گُل آیا کرتی تھی۔ مگر آج صبا بوئے گل کی عوض رنگینی میں ڈوبی ہوئی ہے جس سے اس امر کا سراغ ملتا ہے کہ وہ لالہ رو (محبوب) سیرِ باغ کو گیا ہوگا۔ لالہ رو کی مناسبت سے رنگ کا لفظ استعمال کیا۔

[4] ہجر میں تڑپنے کی وجہ سے قبا چاک ہو گئی ہے۔ ڈر ہے کہ قبا کے ساتھ کہیں سینہ بھی شق نہ ہو گیا ہو ورنہ جگر کے داغ کی بو کیوں آتی۔ دوسرے مصرع میں جو شک ظاہر کیا ہے اُسکی وجہ یہ ہے کہ شبِ تاریک ہجر میں اچھی طرح نظر نہیں آ سکتا۔

[5] گلبانگ = آواز خوش۔ مراد آوازِ معشوق یعنی معشوق کے یہاں پہلے عاشق کا مشورہ قتل ہوتا تھا۔ اب اُس مشورے نے معشوق کی زبان سے اعلان کی صورت اختیار کر لی۔ جسکو شاعر نے گلبانگ سے تعبیر کیا ہے۔ چونکہ ہوا کے ساتھ گل سے بوئے گُل آیا کرتی ہے۔ ضرور ہے کہ گُل بانگ سے (جو قتل عاشق سے متعلق ہے) بوئے خون آئے۔ گُل کی رعایت سے بو اور قتل کی رعایت سے بوئے خوں لکھا ہے۔ [6] محبوب نے دوبارہ آنے کا وعدہ کیا اور ہم سادہ دلی سے خوش ہو گئے۔ مگر اُدھر اُسنے قدم باہر رکھا اُدھر ہماری جان نکل گئی کیونکہ ہماری زندگی اُسی سے وابستہ تھی

کوچہ سے اپنے غیر کا منہ ہے ہٹا سکے ۔۔۔ عاشق کا سر لگا ہے ترے نقش پا کے ساتھ

اللہ رے گمرہی بت و بتخانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ

۱۶۵

تکلیف[1] سے جوں پنجۂ گل لال ہوا ہاتھ ۔۔۔ نازک ہے وہ بس چھوڑ دے لے رنگ حنا ہاتھ

میں[2] اپنے گریباں کے ٹکڑوں کا ہوں پیرو ۔۔۔ چلتے ہیں جنوں میں مرے پاؤں سے سوا ہاتھ

ہے[3] دست مری نبض کی تف سے ید بیضا ۔۔۔ یہ معجزۂ تازہ مسیحا کے لگا ہاتھ

ہنگام[4] وداع آہ گلا کاٹ رہے تھے ۔۔۔ کیا کھینچتے دامن کو ترے کام میں تھا ہاتھ

رکھا[5] تو دل و چشم سے اب اٹھ نہیں سکتا ۔۔۔ قربان نزاکت کے ہیں کیا پاؤں ہے کیا ہاتھ

ہونے نہ دیا چاک گریبان کفن کو ۔۔۔ یاروں نے کئے دفن مرے تن سے جدا ہاتھ

رقیب مجھے اپنے کوچے سے نہیں ہٹا سکتا کیونکہ وہاں تیری آمد و رفت ہے اور جہاں تیرا نقش قدم ہوگا وہاں عاشق کا سر ہونا ضروری ہے۔

[1] شاعر محبوب کے کف نگارین کی رنگینی کی توجیہ یوں کرتا ہے کہ رنگ حنا نے اس کا ہاتھ پکڑا اسلئے وہ نزاکت کی وجہ سے پنجۂ گل کی طرح سرخ ہوگیا۔ [2] جنوں کی حالت میں میرے ہاتھ پاؤں سے زیادہ چلتے ہیں یعنی میں دشت نوردی کے مقابلہ میں پارہ دری کی مشق زیادہ کرتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے اپنے گریبان کے پرزے کرکے آگے پھینکتا ہوں اور پھر بادیہ گردی کے لئے قدم بڑھاتا ہوں۔ اس حساب سے پارہ ہائے گریبان میرے پیشرو ہیں اور میں انکا پیرو۔

[3] حضرت مسیح نے میری نبض پر ہاتھ رکھا تھا کہ نبض کی حرارت سے ہاتھ پر داغ پڑ گیا اور آپکے ہاتھ میں ید بیضا کی شان پیدا ہوگئی۔ ید بیضا = حضرت موسیٰ کا ہاتھ جس پر آگ کا داغ پڑ گیا تھا اور بعد کو بطور معجزہ آفتاب کی طرح چمکتا تھا۔ مراد یہ ہے کہ (معاذ اللہ) میری بدولت جناب مسیح کو وہی معجزہ ملا جو حضرت موسیٰ کو حاصل تھا۔

[4] تیرے رخصت ہونے کے وقت ہم اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ رہے تھے اسلئے تجھے روک نہ سکے کہ ہاتھ خالی نہ تھے۔

[5] معشوق نے میرے سینہ و دل پر ہاتھ رکھا کہ تسکین ہو اور میری آنکھوں پر پاؤں رکھا کہ آنکھوں کی [illegible] نکل جائے۔ مگر نزاکت کے قربان جاؤں کہ اب وہ اپنے ہاتھ یا پاؤں کو اٹھا نہیں سکتا۔

یہ دستِ[۶] بریدہ مرے قاصد کا نہووے — ہے مہر کا خط ہائے شعاعی سے بھرا ہاتھ

جیسا[۷] مجھے آرام ترے ہاتھ سے آیا — اللہ کرے یوں ہی ترا سینہ مرا ہاتھ

جوں[۸] شاخ گل اے جوشِ جنوں زار ہوں یعنے — جب چاک ہوا جامہ تو بس ٹوٹ گیا ہاتھ

بیٹھا[۹] کفِ افسوس ملے گا پسِ کُشتن — غیروں سے بھی ظالم تو مرے ساتھ اُٹھا ہاتھ

ہم[۱۰] اور یہ بدعت تپشِ دل کے سبب سے — مومن مرے سینہ پہ رہے بعد فنا ہاتھ

۱۶۶

ہم[۱۱] میں فلک اتنی کی بھی طاقت نہ چھوڑ دیکھ — دستِ مژہ سے پنجۂ خورست مروڑ دیکھ

اے جامہ زیب میں ہوں وہ مجنوں کہ قیس کا — پھٹ جائے سینہ میرے گریباں کے جوڑ دیکھ

دورِ[۱۲] خمار کا بھی ہے کچھ دھیان یا نہیں — اے مستِ حُسن شیشۂ دل کو نہ توڑ دیکھ

گر ناز کی سے بار ہے دشنہ تو اک نگاہ — ہم نیم بسملوں کو تڑپتا نہ چھوڑ دیکھ

۶ پنجۂ مہر میں خط شعاعی دیکھ کر عاشق خیال کرتا ہے کہ یہ میرے قاصد کا دستِ بریدہ معلوم ہوتا ہے جو میرا خط لیکر گیا تھا اور اسی جرم میں کاٹا گیا ہے۔ آفتاب کو قاصد کے کفِ دست سے اور خط شعاع کو تحریر سے مشابہت دی ہے۔ ۷ جس طرح تونے میرے سینے پر ہاتھ رکھا (اور مجھے تسکین ہو گئی) اسی طرح اللہ کرے الی آخرہ۔ شعر میں شوخی ہے اور شاعر نے یہ فرض کر لیا ہے کہ سینے پر ہر شخص کے ہاتھ رکھنے سے تسکین ہوتی ہے۔ اسلئے دعا دیتا ہے۔ ۸ اے جوشِ جنوں میں شاخِ گل کی طرح کمزور و ناتواں ہوں جیسے شاخِ گل کے جامہ کے چاک ہونے پر (پھول کے کھلنے پر) گل کے توڑتے ہی شاخِ گل بھی ٹوٹ جاتی ہے۔ ایسے ہی جب میں نے وحشت میں کپڑے پھاڑے تو ضعف کے باعث ہاتھ ٹوٹ گئے۔ گل کی مناسبت جامہ سے اور شاخِ گل کی ہاتھ سے ظاہر ہے۔ ۹ یعنی میرے قتل کے بعد غیر بھی خوف سے دعوائے عشق چھوڑ بیٹھیں گے اور تو پچھتائے گا۔ ۱۰ مومن کی شان نہیں کہ بدعت کا مرتکب ہو۔ مگر دل کے تڑپنے سے مجبور ہو کر میں نے مرنے کے بعد اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ لیے۔ کہ شاید اسی طرح کچھ تسکین ہو۔ واضح رہے کہ مرنے پر میت کے ہاتھ سیدھے کر دئے جاتے ہیں۔ سینہ پر رکھنا بدعت ہے۔ ممکن ہے کہ اس میں سینہ کوبی کی طرف اشارہ ہو جو شرعاً ممنوع ہے۔

۱۱ اے فلک ہم میں اتنی طاقت بھی نہ چھوڑ کہ کسی پر نگاہ کر سکیں۔ ورنہ ہم اپنے دستِ مژہ سے پنجۂ خور کو مروڑ ڈالیں گے اور تو اُس کا باعث ہوگا۔ مژہ (پلک) کو ہاتھ سے اور خور (آفتاب) کو پنجہ سے تشبیہ دی ہے۔ ۱۲ خمار = اترنا نشہ کا۔ نشہ اترنا۔ اے مستِ حسن دیکھ میرے شیشۂ دل کو نہ توڑ ورنہ جب نشۂ حسن اترے گا تب تو عاشقوں کو یاد کر کے پچھتائے گا۔

اغوا[۳۲] ے غیر سے نہ جگا خفتہ فتنہ کو — میں غش نہیں ہوں لاش میری ہنس مجھوڑ دیکھ

آئینہ خانہ[۳۳] بن گیا دل توڑنا نہ تھا — یعنے اب ایسے جلوہ نما ہیں کروڑ دیکھ

طوفاں[۳۴] ہیں آب ہر گہر اشک میں نہاں — اے یاد دوست دامن مژگاں نچوڑ دیکھ

میر[۳۵] اقلق بھی قبلہ نما سے نہیں ہے کم — باور نہیں تجھے تو ذرا منہ کو موڑ دیکھ

گیا[۳۶] رحم دیکھنے کی بھی بندی ہو چاہتے — اے چشم اسکے سامنے تو ہاتھ جوڑ دیکھ

جلنا[۳۷] ترا بتوں میں بھی تاثیر کر گیا

مومن یقیں نہیں ہے تو پتھر کو پھوڑ دیکھ

ردیف الیاء

۱۴۷ ۱

منظور[۱] نظر غیر سہی اب ہمیں کیا ہے — بے دید تری آنکھ سے دل پہلے پھرا ہے

کھائی[۲] ہے قسم ہم نے کہ پرہیز کرینگے — گر درد سے پھر جائے طبیعت تو بھلا ہے

۳۲ میں مرگیا ہوں مگر غیر کے بہکانے سے تجھے میری موت کا یقین نہیں آتا اور میری لاش کو جھنجھوڑتا ہے۔ دیکھ ایسا نہ ہو کہ کوئی نیا فتنہ اُٹھ کھڑا ہو۔ ۳۳ تو نے میرا شیشۂ دل اس ضد پر توڑ ڈالا کہ اس میں تیری صورت جلوہ گر تھی۔ لیکن اب دل کے ہر ٹکڑے میں تیری صورت نظر آنے لگی اور دل آئینہ خانہ بن گیا۔ اسلئے تیری کوشش رایگاں گئی۔ یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ اب تیری یکتائی کا دعویٰ باطل ہو گیا۔

۳۴ یادِ دوست میں میرا یہ حال ہے کہ ہر آنسو میں ایک طوفان پوشیدہ ہے۔ اگر میرا دامن مژگاں نچوڑا جائے تو میرے دعوے کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ پلکوں کو اکثر دامن سے تشبیہ دیتے ہیں۔

۳۵ میرے دل کی تڑپ مجھے پھیر کر تیری جانب کر دے گی۔ خواہ تو کسی جانب رُخ کرے۔

۳۶ اے چشم اُس سے رحم کی توقع عبث ہے۔ ڈر یہ ہے کہ کہیں تجھے دیکھنے کی بھی بندش نہ ہو جائے۔ یقین نہ ہو تو اُسکے سامنے ہاتھ جوڑ کر دیکھ لے۔ واضح رہے کہ آنکھ کا ہاتھ جوڑنا آنکھ کا بند ہونا ہے۔

۳۷ پتھر سے آگ کا نکلنا اس کا ثبوت ہے کہ تیرے سوزِ عشق نے بتوں پر بھی اثر کیا۔

۱ یعنی تیری آنکھ پھرنے سے پہلے ہمارا دل تجھ سے پھر گیا۔ بے دید = بے مروّت۔ ۲ اگر درد عشق سے طبیعت بیزار ہو جائے تو بہتر ہے۔ کیونکہ ہم نے قسم کھائی ہے کہ (طلب یار سے) پرہیز کرینگے۔

جب گھر میں نہ ہو تم تو رہیں کوچے میں ہم کیوں
شکوہ جو تمھارا تو ہمارا بھی بجا ہے

بس بس نہ کرو بات کہ یاد آئے ہے مجھکو
ناصح سے جو کچھ بے خودیوں میں بھی سنا ہے

کس طرح نہ اُس شوخ کے رونے پہ ہنسوں میں
نظروں میں مروت ہے نہ آنکھوں میں حیا ہے

اب شوق سے تم محفلِ اغیار میں بیٹھو
یاں گوشۂ خلوت میں عجب لطف اُٹھا ہے

یارب کوئی معشوقۂ دلجو نہ ملے اب
جو اُن کی دعا ہے وہی اپنی بھی دعا ہے

توبہ گنہِ عشق سے فرماے ہے واعظ
یہ بھی کہیں دل دے کے گنہگار ہوا ہے

آزردۂ حرمانِ ملاقات سے ملتے کیا
یعنے کہ نہ ملنا ہی نہ ملنے کی سزا ہے

پرہیز سے اُس کے گئی بیماریِ دل آہ
بیگانگیوں میں بھی عجب ربط رہا ہے

ثہ میری بیخودی کے زمانہ میں ناصح یہ کہکر عشق سے منع کرتا تھا کہ معشوق بے وفا ہے - مگر میں دھیان نہ دیتا تھا لیکن کان پڑی بات کبھی نہ کبھی کام آجاتی ہے - چنانچہ تمھارے ظلم دیکھکر اب اُسکی باتوں کی تصدیق ہوتی ہے - اسلئے میرے سامنے صفائی پیش کرنے سے فائدہ - سے معشوق ارتباط غیر کی تردید میں اپنے کو بے قصور ثابت کرنے کے لئے روتا ہے - اور میں اُسکے رونے پر ہنستا ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ اُس کا رونا تصنع کی بنا پر ہے - ثہ دعا دونوں کی ایک ہے مگر نیت مختلف - معشوق عاشق سے ناراض ہوکر دعا کر رہا ہے اور عاشق عشق سے بیزار ہوکر ہوسکتا ہے کہ یہاں "دلجو" کے دو معنی مراد ہوں یعنی مہربانی کرنے والا اور دل کا تلاش کرنے والا - معشوق نے معنی اول مراد لیئے ہوں اور عاشق نے معنی ثانی دیکھو مطلع غزل ۲۴ - سے مراد یہ ہے کہ اگر واعظ گنہگار نہ ہوتا تو توبہ کیوں کرتا - "فرماے ہے" طنزاً استعمال کیا ہے - ممکن ہے کہ "توبہ فرماے ہے" توبہ ہی فرمائیے" کا ترجمہ ہو - یعنی توبہ کا حکم دیتا ہے - ثہ جو شخص ملاقات یار سے محروم رہنے کی وجہ سے آزردہ ہے (یعنی عاشق) وہ اب معشوق کے منانے سے بھی نہیں من سکتا - کیونکہ معشوق جو اتنے عرصہ تک نہیں ملا اُس کی سزا یہی ہے کہ عاشق بھی آیندہ اُس سے نہ ملے - ثہ عموماً ربط باہمی یگانگی کی حالت میں ہوتا ہے - مگر یہاں بیگانگی میں بھی ربط (یکسانی طبیعت) کا یہ حال رہا کہ اُدھر دوست نے ہم سے پرہیز کیا اِدھر ہماری بیماریِ دل رخصت ہوئی - یعنی اُسکی سرد مہری نے ہمارا جوش الفت فرو کر دیا - گویا جس رُخ کو اُسکی طبیعت بدلی اُسی رُخ کو ہماری طبیعت بھی پلٹی یا یہ کہ بیگانگی کے باوجود اُسکی ذات سے مجھے یہ فائدہ پہونچا کہ بیماریِ دل جاتی رہی آہ کا لفظ مصرع ثانی سے متعلق ہے اور یہ پتہ دے رہا ہے کہ عاشق کو اب اسقدر مشارکت بھی پسند نہیں -

تھا[9] محوِ رخِ یار میں کیا آئینہ دیکھوں — معلوم ہے یارو مجھے جو رنگ مرا ہے

چاہا[10] کرے دل لاکھ نہ بولونگا جو ہمدم — وہ میرے منانے کو رقیبوں سے خفا ہے

میں[11] ترک وفا سے بھی وفادار ہوں مشہور — کیں تجھ سے جو اے دشمنِ اربابِ وفا ہے

مومن[12] نہ سہی بوسہ یا سجدہ کرینگے
وہ بت ہے جو اوروں کا تو اپنا بھی خدا ہے

(۸)

خوشی نہ ہو مجھے کیونکر قضا کے آنے کی — خبر ہے لاش پہ اس بیوفا کے آنے کی

ہے[13] ایک خلق کا خوں سر پہ اشک خوں کے مرے — سکھائی طرز اُسے دامن اُٹھا کے آنے کی

سمجھ[14] کے اور ہی کچھ مر چلا میں اے ناصح — کہا جو تو نے نہیں جان جا کے آنے کی

اُمید[15] سرمہ میں تکتے ہیں راہ دیدۂ زخم — شمیم سلسلۂ مشک سا کے آنے کی

۱۷۸

[9] احباب نے عاشق سے کہا کہ ذرا آئینہ لیکر تو دیکھو۔ عشق کی بدولت تمھارے چہرے کی کیا حالت ہوگئی ہے۔ اُس کا جواب دیتا ہے کہ میں رُخ یار میں محو تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کے رنگ رُخ کا کیا حال ہوگا۔ پھر آئینہ دیکھنے سے کیا حاصل۔ اس میں لطافت یہ ہے کہ رُخ یار خود آئینہ فام ہے۔ آئینہ کی حاجت نہیں [10] اگر دوست میرے منانے کی خاطر رقیبوں سے خفا ہوا ہے تو میں اُس سے ہرگز نہ بولونگا (کتنا ہی دل کیوں نہ چاہے) کیونکہ میری تو عین خواہش ہے کہ وہ ہمیشہ رقیبوں سے ناراض رہے۔ اگر میں اُس سے من گیا تو ڈر ہے کہ وہ یہ سمجھ کر کہ مقصود تو حاصل ہو ہی گیا پھر اُن سے ملتفت نہ ہو جائے۔ [11] کیونکہ تجھ جیسے دشمن ارباب وفا سے میرا ترک وفا کرنا بھی اہل عقل کے نزدیک داخل وفاداری ہے۔ کیں = دشمنی۔ [12] اگر بُت کا بوسۂ پا نہیں ملتا۔ تو نہ ملے۔ ہم آئندہ سے خدا کو سجدہ کرینگے۔ غزل میں سرتا پا واسوخت کا رنگ ہے۔ [13] میرے اشک خوں کو دیکھ کر محبوب نے دامن اُٹھا لیا کہ آلودہ خون نہ ہو جائے۔ لوگ اس ادا کو دیکھ کر ہلاک ہوگئے اور سب کا خون میرے اشک خون کی گردن پر رہا۔ [14] ناصح نے سمجھایا کہ جان جا کر آنے والی نہیں جس سے اُسکی مراد یہ تھی کہ عمر چند روزہ کو مغتنم سمجھو اور عمل خیر کی طرف توجہ کرو۔ عاشق اپنی "خوش فہمی" سے یہ سمجھا کہ جب زندگی کا اعتبار نہیں تو جہانتک ہو سکے "کاروبار" عاشقی سے غافل نہ رہنا چاہیئے۔ مر چلا = مرنے لگا۔ عشق کرنے لگا۔ [15] شمیم سلسلۂ مشک سا = زلف مشکیں کی بو۔ جس طرح آنکھ سرمہ کی طالب ہوتی ہے میرے دیدہ ہائے زخم زلف مشکیں کی شمیم کا انتظار کر رہے ہیں۔ زخم کو شکل کے اعتبار سے آنکھ سے تشبیہ دیجاتی ہے سرمہ۔ دیدہ۔ سلسلۂ مشک سا میں رعایت ہے۔

چلی ہے جان نہیں تو کوئی نکالو راہ
تم اپنے پاس تک اس مبتلا کے آنے کی

نہ جائے کیوں دلِ مرغِ چمن کہ سیکھ گئی
بہار وضع ترے مسکرا کے آنے کی

مشامِ غیر میں پہونچے ہے نکہتِ گلِ داغ
یہ بے سبب نہیں بندی ہوا کے آنے کی

جو بے حجاب نہ ہوگے تو جان جائے گی
کہ راہ دیکھی ہے اس نے حیا کے آنے کی

پھر اب کی لا ترے قربان جاؤں جذبۂ دل
گئے ہیں یاں سے وہ سوگند کھا کے آنے کی

خیالِ زلف میں خود رفتگی نے قہر کیا
امید تھی مجھے کیا کیا بلا کے آنے کی

کروں میں وعدہ خلافی کا شکوہ کس کس سے
اجل بھی رہ گئی ظالم سنا کے آنے کی

کہاں ہے ناقہ ترے کان بجتے ہیں مجنوں
قسم ہے مجھکو صدائے درا کے آنے کی

کاشانۂ محبوب میں ہوا کا گذر نہیں - شاعر اسکی توجیہ یوں کرتا ہے کہ ہوا کے ذریعے سے میرے داغِ عشق (جو گل سے مشابہ ہے) کی بو غیر کے دماغ میں پہونچتی ہے - اس وجہ سے ہوا کی بندش کی گئی ہے - ظاہر ہے کہ غیر کو نکہتِ گلِ داغ کیوں پسند آنے لگی - وہ اس لذت سے واقف ہی نہیں

اگر تم خلوت میں مجھ سے بے حجاب نہ ہوگے تو میری جان جائے گی - مانا کہ خلوت میں آمد و رفت کی راہیں بند ہیں - تاہم جس راہ سے تمھاری حیا یہاں آگئی اسی راہ سے میری روح کا نکل جانا بھی ممکن ہے - زلف کی محبت میں مجھ لذت کش ایذا کو بلا کے آنے کی امید تھی - مگر خیالِ زلف میں اس قدر بیخودی رہی کہ مجھے بلا کے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی اور اسکا خیر مقدم کرنے سے قاصر رہا - زلف کو بلا سے تشبیہ دیتے ہیں - اسی مناسبت سے عاشق بلاکش نزولِ بلا کا مشتاق تھا

اگر مصرعِ اول میں "سے" کی بجائے "کی" ہو تو عبارت زیادہ صاف ہو جائے - یعنی محبوب تو درکنار - اجل بھی وعدہ خلافت نکلی اور آنے کی خبر سنا کر رہ گئی - اب کس کس کی وعدہ خلافی کی شکایت کی جائے - درا = جرس - گھنٹہ - قافلہ یا ناقہ کی گھنٹی - یہاں آخر الذکر مراد ہے - مجنوں! مجھے صدائے جرسِ ناقۂ لیلیٰ کی قسم ہے کہ ناقۂ لیلیٰ کا کہیں پتہ نہیں - تجھے جو صدائے جرس کا گمان ہے یہ در اصل تیرے کان بجتے ہیں -

مرے[۹] جنازہ پہ آنے کا ہے ارادہ تو آ — کہ دیر اُٹھانے میں کیا ہے صبا کے آنے کی

مجھے[۱۰] یہ ڈر ہے کہ مومن کہیں نہ کہتا ہو
مری تسلّی کو روزِ جزا کے آنے کی

۱۶۹

میں[۱۱] اگر آپ سے جاؤں تو قرار آجائے — پر یہ ڈرتا ہوں کہ ایسا نہ ہو یار آجائے

باندھو[۱۲] اب چارہ گرو چلّے کہ وہ بھی شاید — وصل دشمن کے لئے سوئے مزار آجائے

کر[۱۳] ذرا اور بھی اے جوش جنوں خوار و ذلیل — مجھ سے ایسا ہو کہ ناصح کو بھی عار آجائے

نام[۱۴] بدبختیِ عشاق خزاں ہے بلبل — تو اگر نکلے چمن سے تو بہار آجائے

جیتے[۱۵] جی غیر کو ہو آتشِ دوزخ کا عذاب — گر مری نعش پہ وہ شعلہ عذار آجائے

کلفت[۱۶] ہجر کو کیا روؤں ترے سامنے میں — دل جو خالی ہو تو آنکھوں میں غبار آجائے

۹؎ میرے جنازے کے اُٹھانے میں دیر کیا ہے (صرف) صبا کے آنے کی (دیر ہے) اسلئے اگر شرکت جنازہ مقصود ہے تو جلد آ۔ صبا کا ذکر اسلئے کیا گیا ہے کہ عاشق ناتواں کی مشتِ خاک تھوڑی دیر میں اُڑ جائیگی۔ ۱۰؎ عاشق ہدفِ ستم ہو رہا ہے۔ اسکا ایک ہمدم (مومن) اُسے اطمینان دلاتا ہے کہ قیامت میں اِن مظالم کی تلافی ہو جائیگی۔ اس پر وہ کہتا ہے کہ مجھے خوف ہے کہیں مومن یہ باتیں محض میرے "دل کے بہلانے" کی غرض سے تو نہیں کرتا۔

۱۱؎ میری تڑپ کا صرف یہ علاج ہے کہ بیخود رہوں۔ مگر یہ خوف ہے کہ اگر ایسی حالت میں دوست آیا تو مجھے بیخودی کی وجہ سے اسکے آنے کی خبر بھی نہ ہوگی۔ ۱۲؎ عاشق اپنی زیست سے مایوس ہو کر چارہ گروں سے کہتا ہے کہ زندگی میں تو محبوب کے آنے کی کوئی صورت نہ ہو سکی۔ اب ایک تدبیر باقی ہے۔ کہ میرے مزار پر اعتکاف کرنا۔ شاید وہ کبھی کسی مقبول الدعوات بزرگ کی قبر سمجھ کر وصل دشمن کی دعا کرانے کے لئے اِدھر آنکلے اور میری تمنائے دیرینہ بر آئے۔ ۱۳؎ یعنی میری دیوانگی کی وجہ سے محبوب تو مجھ سے ملتا نہیں۔ کاش جوش جنوں کے ہاتھوں میری رسوائی اس درجہ کو پہونچ جائے کہ ناصح بھی مجھ سے ملنے میں کراہت کرنے لگے۔ ۱۴؎ عاشق بلبل سے (جو بہار کی طالب اور گل پہ عاشق ہے) کہتا ہے کہ خزاں دراصل عشاق کی بدنصیبی کا دوسرا نام ہے اسلئے تو اگر باغ سے جائے تو بہار آجائے صرف تیرے دم تک چمن میں خزاں ہے۔ ۱۵؎ عذاب سے عذاب رشک مراد ہے شعلہ عذار (شعلہ رخسار) اور آتش دوزخ میں مناسبت ہے۔ ۱۶؎ کلفت = کدورت۔ غبار۔ جب آدمی روتا ہے تو دل خالی ہو جاتا ہے اور دل کا بخار نکلجاتا ہے اگر میں کدورت ہجر کو روؤں تو ڈر ہے کہ جو غبار ابتک دل میں مستور تھا آنکھوں میں جاگزیں ہو جائے گا۔

محوِ دلدار ہوں کس طرح نہ ہوں دشمنِ جاں | مجھپہ جب ناصحِ بیدرد کو پیار آجائے
ٹھہر جا جوشِ تپش ہے تو تڑپنا لیکن | چارہ سازوں میں ذرا دمِ دلِ زار آجائے

حسنِ انجام کا مومن مرے بارے ہے خیال
یعنے کہتا ہے وہ کافر کہ تو مارا جائے

۱۷۰

تیری پابوسی سے اپنی خاک بھی مایوس ہے | نقشِ پا پر نقشِ پا ظالم کفِ افسوس ہے
ہائے یادِ مرغِ مجنوں کی جنوں افزائیاں | میرے سر کو سایۂ بالِ ہما منحوس ہے
چشم دریا بار ہے کس کے خیالِ خط میں جو | فلسِ ماہی داغ افزائے پرِ طاؤس ہے
کیا یہ مطلب ہے کہ برعکسِ وفا ہوگی جفا | جو تمہارے عہد نامہ میں خطِ معکوس ہے
یاں جلا یا جی حجابِ شمع رو نے اور بھی | سوزِ پروانہ کو مانع پردۂ فانوس ہے
بسکہ شامِ وصل آغازِ سحر میں مر گئے | سینہ کوبی اہلِ غم کی ہم صدائے کوس ہے

[۸] میں محوِ دلدار ہوں - یعنی یادِ یار میں اسقدر محو ہوں کہ اب خود مجھ میں جلوۂ یار کا پرتو نظر آتا ہے - اسلئے جب کبھی ناصح جیسے بیدرد کو میری حالت پر رحم یا مجھپر پیار آتا ہے تو میرا جذبۂ رشک بھڑک اُٹھتا ہے اور یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ کہیں ناصح مجھکو مظہرِ جمالِ یار سمجھکر تو محبت نہ کرتا ہو - اسلئے اپنا دشمنِ جان ہوں - کہ نہ میں ہونگا نہ ناصح کو مجھپر پیار آئے گا - یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ میں ناصح کا دشمنِ جان ہوں - [۹] وہ کافر (محبوب) ناراض ہوکر مومن سے کہتا ہے کہ تو مارا جائے - حضرت اُسکی تاویل فرماتے ہیں کہ اسمیں بھی اُس کافر کو میرے حسنِ انجام کا خیال ہے - کیونکہ مومن اگر مارا جائے گا تو درجۂ شہادت پائیگا - [۱۰] میری خاکِ مزار کو بھی یہ اُمید نہیں کہ تیری قدمبوسی نصیب ہو اسلئے میری خاک کفِ افسوس ملتی ہے - قاعدہ ہے کہ خاک پر جب راہرو چلتے ہیں اور نقشِ پا پر نقشِ پا بنجاتا ہے تو کفِ افسوس ملنے کی شکل پیدا ہوتی ہے - [۱۱] مرغِ مجنوں = وہ طائر جس نے مجنوں کے سر میں آشیانہ بنایا تھا - بالِ ہما کا سایہ مجھ دیوانے کے سر پر پڑا اور معاً اُسکو دیکھکر مجھے مرغِ مجنوں کی یاد آئی جس سے وحشت کو اور ترقی ہوئی - اس اعتبار سے سایۂ ہما سعد ہونے کے عوض میرے حق میں نحس ثابت ہوا - [۱۲] میری آنکھ کس (حسین) کے خطِ عارض کی یاد میں آنسوؤں کا دریا بہا رہی ہے کہ دریا کی مچھلی کے فلس (سنے) حسن میں پرِ طاؤس کو رشک دے رہے ہیں - [۱۳] عہد نامہ = اقرار نامۂ محبت خطِ معکوس = وہ تحریر جو اُلٹی لکھی جائے - [۱۴] پردۂ فانوس کی وجہ سے پروانہ جلنے سے محفوظ رہتا ہے - یہاں اسکے برعکس اُس شمع رو کے پردہ کرنے سے جی جل گیا - [۱۵] اُدھر شبِ وصل ختم ہوئی اور سحر کا آغاز ہوا اودھر ہم نے جان دیدی یہی وجہ ہے کہ ہمارے اقرباکے ماتم کی آواز کوس کی آواز میں ملگئی ہے - کوس سے یہاں صبح کی نوبت مراد ہے -

غیرتِ[7] آمد شدِ دشمن سے تلووں سے لگی
جل بجھیں گے اب کہ حالِ مشعلِ منکوس ہے

گر[8] نہو شکر جفائے متصل سے دردِ سر
لب پہ کچھ کچھ التماسِ جانِ غم مانوس ہے

نزع[9] میں جی کا نکلنا تیرا آنا ہوگیا
بسکہ مرتے مرتے دل میں حسرتِ پابوس ہے

شاعری[10] اپنی ہوئی نیرنگیِ دانشوری
جو سخن ہے سو طلسمِ رازِ بطلیموس ہے

کر چکا[11] ہوں دورِ اخلاصِ بتاں میں امتحاں
میں نہ مانوں گا کہ مومن زاہدِ سالوس ہے

۱۸۱

دیتے[12] ہو تسکیں مرے آزار سے
دوستی تم کو نہیں اغیار سے

کچھ[13] نہ سوجھا حسرتِ دیدار سے
سہل چھوٹے مردنِ دشوار سے

ے مشعلِ منکوس = الٹی یا اوندھی مشعل - جلتی ہوئی مشعل کو اگر سرنگوں کر دیا جائے تو جلد جل بجھتی ہے - دشمن کی آمد ورفت کے رشک کے باعث میرے تلووں سے آگ لگی ہے جسکی وجہ سے میرا مشعلِ منکوس کا سا حال ہے - یقین ہے کہ جلد جل کر خاک ہوجاؤنگا -

۸ جانِ غم مانوس = وہ جان جسے غم پسند ہو - میں تمھاری جفائے پیہم کا شکر کرتا ہوں اور تم کو اس سے بھی سرگرانی ہوتی ہے - اگر بار خاطر نہ ہو تو میں جانِ غم مانوس کی طرف سے کچھ عرض کروں - یعنی شکر ستم کروں -

۹ مرتے مرتے میرے دل میں تیری پابوسی کی حسرت ہے - اس لئے اس حسرت کی وجہ سے نہ جیتا ہوں نہ مرتا ہوں گویا میرا دم نکلنا ایسا ہی دشوار ہوگیا جیسے تیرا آنا - یعنی دونوں معرض تعویق میں پڑ گئے -

۱۰ طلسمِ رازِ بطلیموس = بطلیموس (حکیم اسکندریہ) کا طلسمِ راز - میری شاعری عقل و خرد کے عجائبات کا مجموعہ ہے - اسی لیے میرے شعر میں طلسم کی کیفیت ہے -

۱۱ سالوس = ریاکار - مکار - جس طرح مومن پہلے بتوں کی محبت میں راسخ تھا - اسی طرح اب ترکِ عشق کے بعد زہد میں بھی یقیناً صادق ہوگا -

۱۲ تم رقیبوں کی دلجوئی کی غرض سے مجھپر ظلم کرتے ہو اور اتنا نہیں سمجھتے کہ میرے حال عبرت خیز سے اور انکی ہمت ٹوٹ جائیگی اور وہ عوائے الفت سے دست بردار ہوجائینگے - اس سے معلوم ہوا کہ تمھیں انسے دوستی نہیں ورنہ ایسا نہ کرتے - شعر میں کرشاعرانہ ہے - ۱۳ مجھے حسرتِ دیدار میں اسقدر محویت رہی کہ آسانی سے جان نکل گئی اور موت کی تکالیف کا احساس تک نہ ہوا - نہ سوجھا = احساس نہ ہوا -

داغ[۳] خون سے میرے وہ حیراں ہوا — دامن اُلجھا ہے گُلِ بے خار سے
چھوڑ[۴] جلد اے بوالہوس سر کو کہ اب — جھانکتے ہیں روزنِ دیوار سے
فصد[۵] کی حاجت مجھے کیا چارہ گر — بہ گیا خوں دیدۂ خونبار سے
مال کیسا جاں بھی دے کر بوالہوس — گر بنے تو دل چھڑا لوں یار سے
مت[۶] کرو کنگھی نہ یہ دزدِ حنا — دل چُرا لے طرۂ طرّار سے
آہ[۷] دورِ چرخ کی کیا خاک اُڑائے — فتنہ برپا ہے تری رفتار سے
کھا[۸] گیا جان آ کہ دوں اسکو نکال — میں نہیں خوش صحبتِ غمخوار سے
یوں کہے درد آیا اپنی چیز کا — حال دل گر پوچھئے دلدار سے
گر[۹] نصیحت گر ہیں سچ ہوں سادہ لوح — تو سمجھے گی خوب اُس عیّار سے
کیوں[۱۰] نہ کاٹیں لب اطبا مر گیا — حال پوچھا تھا ترے بیمار سے
وعدہ کر کے وہ نہ آئے نامہ بر — تو نے پوچھا تھا پر تو نکلا تکرار سے

۳ داغ خوں کو گل سے تشبیہ دیجاتی ہے مگر اسقدر فرق ہے کہ اس گل میں خار نہیں ہوتا۔ قاتل اپنے دامن پر میرے خون کا داغ دیکھکر حیران ہے۔ گویا اُس کا دامن ایسے گُل سے اُلجھ گیا ہے جس میں خار نہیں۔ خیال میں ندرت ہے۔ ۴ وہ پردہ نشین روزنِ دیوار سے جھانک رہا ہے۔ اے رقیب جلد اپنا سر پھوڑ کہ اُسکے ذوقِ تماشا کے لئے کچھ سامان چاہئے۔ مبادا اُسکی زحمتِ نظر رائگاں جائے۔ ۵ میری آنکھوں سے خون بہ گیا اور جو فصد کا مقصد تھا حاصل ہو گیا۔ ۶ دزدِ حنا = مہندی کا چور۔ ہاتھ کی ہتھیلی پر سفیدی جو حنا لگانے کے بعد ہاتھ میں رہ جائے۔ طرۂ طرّار = زلفِ چالاک۔ طرّار گرہ کٹ کو بھی کہتے ہیں۔ میرا دل تمھاری زلف میں ہے۔ کنگھی کرنے میں یہ خوف ہے کہ ہاتھ میں جو دزدِ حنا ہے وہ زلف سے دل نہ چُرا لے۔ ۷ میری آہ دورِ چرخ کو کیا تباہ کرے۔ کیونکہ اصل میں تو تیری رفتار سے دنیا میں فتنہ بپا ہے۔ اُسکا کیا علاج ہوگا۔ فتنۂ چرخ مٹ گیا تو کیا اور قائم رہا تو کیا۔ ۸ ہمدم (یا ناصح) سے میں خوش نہیں۔ تم آؤ تاکہ میں اسکو نکال دوں اور تمھاری موجودگی میں اسکی غمخواری کی ضرورت نہ رہے۔ ۹ نصیحت گر (ناصح) نے کہا کہ تم سادہ لوح ہو۔ تم کو اس عیّار (معشوق) سے دور رہنا چاہئے۔ مبادا اُسکے دام میں گرفتار ہو جاؤ۔ عاشق جواب دیتا ہے کہ اگر ایسا ہے تو خوب نبھے گی کیونکہ سادہ لوحی کی وجہ سے مجھے اُسکی عیّاریوں کا احساس کیوں ہونے لگا۔ ۱۰ تیرے بیمار ناتواں سے اطبا نے حال پوچھا ہی تھا کہ وہ اس صدمے سے مر گیا۔ لب کاٹنا = افسوس کرنا۔

دستِ قاصد کاٹئے کیوں تا بسے کیا[۱۱]	زردیِ مضمون مرے طومار سے
ہائے بختِ خفتہ کی یوں جھپکی آنکھ[۱۲]	دشمنوں کے طالعِ بیدار سے
مجھ سے وہ چھپتے پھریں اسکے سوا	اور حاصل عشق کے اظہار سے

کہہ غزل اک اور بھی مومن کہ ہے
شوق اُس بت کو ترے اشعار سے

زہر ٹپکے ہے نگاہِ یار سے[۱]	موت سوجھی نرگسِ بیمار سے
قتل ہوکر ہم بچے آزار سے	عمر کے دن کٹ گئے تلوار سے
جا بجا نہریں ہیں جاری ہیں اشک[۲]	پونچھے ہوں گے دامنِ کہسار سے
گر نہ کھیلیں جان پر جی ہار دیں[۳]	عشق بازی سیکھئے اغیار سے
لاغری سے زندگی مشکل ہوئی[۴]	ہے گراں تر جان جسمِ زار سے
کر علاجِ جوشِ وحشت چارہ گر[۵]	لا دے اِک جنگل مجھے بازار سے

[۱۱] شرع میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے۔ طومار = خط۔ مکتوب۔ [۱۲] آنکھ جھپکنے سے یہاں خفیف و خجل ہونا مراد ہے۔

[۱] محبوب کی نگاہ سے زہر ٹپکتا ہے (یعنی اُسکی نظر ہلاکت آفریں ہے) گویا اُسکی نرگس بیمار (آنکھ) سے ہمیں اپنی موت نظر آرہی ہے۔ [۲] قاعدہ ہے کہ اشک دامن سے پونچھے جاتے ہیں۔

[۳] جان پر کھیلنا = جان دے دینا۔ جی ہار دینا = ہمت ہارنا۔ دوسرے مصرع میں طنز کا پہلو ہے۔ [۴] جسمِ زار کی لاغری کا یہ عالم ہے کہ جان (جیسی لطیف شے) بھی اُسکے مقابلے میں بھاری ہے۔ اسوجہ سے زندگی دشوار ہے۔ جان کے گراں تر ہونے میں یہ مفہوم ہے کہ اب جسم نحیف اُسکے برداشت کرنے کے قابل نہیں۔

[۵] میرے جوشِ وحشت کا علاج صرف جنگل میں ممکن ہے۔ اگر علاج کرنا ہے تو بازار سے جنگل لا دے مطلب یہ ہے کہ جیسے یہ محال ہے ویسے ہی تیرے ہاتھ سے میرے جنوں کا افاقہ پذیر ہونا محال۔

ذکرِ رشکِ غیر میں رنگینیاں	بوئے خوں آئی تری گفتار سے
عشق میں ناصح بھی ہے کیا مدعی	جرم ثابت ہو گیا انکار سے
چھڑکے ہے کانِ ملاحت لون کیا	خود لپٹ جا سینۂ افگار سے

گر دعا کرتا ہوں مومن وصل کی
ہاتھ باندھے ہے وہ بُت زنار سے

۱۷۳

ہے نگاہِ لطف دشمن پر تو بندہ جائے ہے	یہ ستم اسے بے مروت کس سے دیکھا جائے ہے
سامنے سے جب وہ شوخِ دلربا آ جائے ہے	تھامتا ہوں پر یہ دل ہاتھوں سے نکلا جائے ہے
حالِ دل کیونکر کہوں میں کس سے بولا جائے ہے	سر اٹھے بالیں سے کیا کچھ جی ہی بیٹھا جائے ہے
جاں نہ کھا وصلِ عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں	جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے
رشکِ دشمن نے بنا دی جان پر اے بے وفا	کب تلک کوئی نہ بگڑے حال بگڑا جائے ہے

؎ تو غیر کے گریہ محبت کا ذکر اس قدر رنگ آمیزی سے کرتا ہے کہ میرا دل رشک سے خون ہوا جاتا ہے۔ گویا تیری باتوں سے مجھے خون کی بو آتی ہے۔

؎ ناصح منکرِ محبت ہے (عشق کا قائل نہیں) اسکے انکار سے اُسکا جرم ثابت ہے۔ یعنی یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ وہ بھی مدعی (رقیب) ہے ورنہ اپنی پند و نصیحت سے مجھے عشق سے کیوں باز رکھتا۔ انکار سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ ناصح کہتا ہے کہ میں صرف تمہارے بھلے کے لئے نصیحت کرتا ہوں ورنہ مجھے معشوق کی محبت سے سروکار نہیں کہ تمہارے ترکِ عشق سے مجھے ذاتی مفاد مدِ نظر ہوتا۔ اس انکار سے عاشق کی بدگمانی بڑھتی ہے۔

؎ کانِ ملاحت = محبوب جو سرتاپا ملاحت (نمک) ہے۔ اگر تجھے زخم پر نمک چھڑکنے میں لطف آتا ہے تو اسکی آسان تدبیر یہ ہے کہ تو خود میرے زخمی سینے سے آکر لگ جا کیونکہ تو ہمہ تن کانِ نمک ہے اس طرح تیری تمنائے ستم پوری ہو جائیگی۔ مکر شاعرانہ ملاحظہ ہو۔

تلخ کام عشق شیریں لب جئے تو کیا ہوا[1]
شور بختی سے مزا ہی زندگی کا جائے ہے

حسن روز افزوں پہ غرہ کس لئے اے ماہرو
یوں ہی گھٹتا جائے گا جتنا کہ بڑھتا جائے ہے

پونچھے آنسو وارثوں کے کیا کروں اب ہائے ہائے[2]
داغ میرے خون کا دامن سے چھوٹا جائے ہے

غیر کے ہمراہ وہ آتا ہے میں حیران ہوں[3]
کس کے استقبال کو جی تن سے میرا جائے ہے

تاب و طاقت صبر و راحت جان و ایماں عقل و ہوش
ہائے کیا کہئے کہ دل کے ساتھ کیا کیا جائے ہے

رو رہا ہوں خندۂ دنداں نما کی یاد میں[4]
آب گوہر کے لئے آنکھوں سے دریا جائے ہے

خاک میں مل جائے یارب بیکسی کی آبرو
غیر میری نعش کے ہمراہ روتا جائے ہے

اب تو مر جانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو
ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اٹھا جائے ہے

پند گو اب تو ہی فرما کس کو سودا ہے یہ کون
اور کی سنتا نہیں اپنی ہی بکتا جائے ہے

دیکھئے انجام کیا ہو مومن صورت پرست[5]
شیخ صنعاں کی طرح سوئے کلیسا جائے ہے

---

[1] تلخ کام عشق شیریں لب = معشوق شیریں لب کے عشق میں گرفتار مصیبت۔ شور بختی = بد نصیبی۔ تلخ کام شیریں، شور۔ مزہ میں رعایت ہے۔ [2] دامن قاتل سے آنسو پونچھنے میں میرے خون کا داغ چھوٹا جاتا ہے۔ داغ چھوٹنے میں حقیقی اور مجازی (یعنی جرم کا ہلکا ہونا) دونوں پہلو مدنظر ہیں۔

[3] یعنی مجھے حیرت ہے کہ دوست کی پیشوائی کے لئے فرط خوشی سے میری جان نکلی جا رہی ہے یا دشمن کی معیت کے رشک سے صدمے کے باعث۔ [4] دنداں کی رعایت سے آب گوہر اور رونے کی مناسبت سے دریا استعمال کیا ہے رونے اور خندہ میں تضاد اور آب گوہر اور دریا میں ایہام تناسب ہے۔

[5] شیخ صنعاں ایک بزرگ تھے جو سفر حج کے دوران میں عشق خانہ خراب کے ہاتھوں مجبور ہو کر عیسائی ہو گئے تھے (یہ قید کر دیا ہے) داخل ہو گئے تھے۔ "صورت پرست" میں یہ نکتہ ہے کہ مسیحیوں کے کلیسا (کیتھولک چرچ) میں تصویروں کی پرستش کی جاتی ہے۔

۱۷۲

ہوئی تاثیر آہ وزاری کی
رہ گئی بات بیقراری کی

شکوۂ دشمنی کریں کس سے
واں شکایت ہے دوستداری کی

مبتلائے[1] شبِ فراق ہوئے
ضد سے ہم تیرہ روزگاری کی

یاد[2] آئی جو گرمجوشیٔ یار
دیدۂ تر نے شعلہ باری کی

کیوں نہ ڈر جاؤں دیکھ کر وہ زلف
ہے شبِ ہجر کی سی تاریکی

پاس[3] دیکھو کہ غیر سے کہہ دی
بات اپنی امیدواری کی

بسکہ ہے یار کی کمر کا خیال
شعر کی سوجھتی ہے باریکی

کردے روزِ جزا شبِ دیجور
ظلمت اپنی سیاہ کاری کی

تیرے ابرو کی یاد میں ہم نے
ناخنِ غم سے دلفگاری کی

قتل[4] دشمن کا ہے ارادہ اسے
یہ سزا اپنی جاں نثاری کی

کیا مسلماں ہوئے کہ اے مومن
حاصل اُس بُت سے شرمساری کی

[1] تیرہ روزگاری (سیاہ بختی) نے ہم سے دشمنی نکالی اور مبتلائے شبِ فراق کر دیا۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ تیرہ روزگاری کی ضد پر ہم نے شبِ فراق کو اختیار کیا کہ وہ بھی سیاہ ہے۔ یعنی "غمِ روزگار" سے [illegible] لئے "غمِ عشق" قبول کیا۔ [2] گرم جوشی (اختلاط) کی رعایت سے شعلہ باری کا لفظ استعمال کیا ہے۔ [3] اب ہم عشق میں اس قدر مایوس ہو گئے ہیں کہ رقیب سے بھی اپنی آرزو بیان کر دی کیونکہ یہ یقین تھا کہ [illegible] بر آنے والی نہیں۔ پھر چھپانے سے حاصل؟ مضمون نیچرل ہے۔ [4] یعنی "خنجر آزمائی" کے مستحق تو ہم جاں نثار تھے نہ کہ دشمن۔

۱۷۵

دفن[1] جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہونگے — فلس ماہی کے گلِ شمع شبستاں ہونگے

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہونگے — (۱) نیم بسمل کئی ہونگے کئی بے جاں ہونگے

تاب[2] نظارہ نہیں آئنہ کیا دیکھنے دوں — (۲) اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہونگے

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے — (۳) ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہونگے

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم — لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھسے بھی ناداں ہونگے

کر کے زخمی مجھے نادم ہوں یہ ممکن ہی نہیں — گر وہ ہونگے بھی تو بے وقت پشیماں ہونگے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس — (۴) ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہونگے

ہم[3] نکالیں گے سُن اے موجِ ہوا بل تیرا — اُس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہونگے

صبر[4] یارب مری وحشت کا پڑیگا کہ نہیں — چارہ فرما بھی کبھی قیدیِ زنداں ہونگے

منت[5] حضرتِ عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی — (۵) زندگی کے لئے شرمندۂ احساں ہونگے

---

[1] سوختہ ساماں = بے سروساماں - گُلِ شمع شبستاں = شمعِ کاشانہ کا گُل - ہم سوختہ ساماں جب زمین میں دفن ہونگے تو ہماری سوختہ سامانی کے اثر سے ماہی زمین کے سینے بھی گلِ شمع کی طرح جلنے لگیں گے یا گلِ شمع کا کام دینگے - [2] معشوق کے نظارۂ جمال کی کسی کو (حتیٰ کہ خود اُسکو بھی) تاب نہیں - اسلئے میں اُسکو آئینہ نہیں دیکھنے دیتا - مبادا وہ اپنی صورت دیکھکر خود حیران ہو جائے اور پہلے سے زیادہ تصویر بن جائے - واضح رہے کہ تصویر کو شعراء حیران قرار دیتے ہیں - حیرانی سے آئینہ کی مناسبت بھی روشن ہے -

[3] بل نکالیں گے = سیدھا کر دیں گے -

[4] کاش میرے جنوں کا صبر پڑے اور چارہ گر بھی (جنھوں نے مجھ دیوانہ کو زنداں میں قید کر دیا ہے) کبھی قیدِ زنداں میں گرفتار ہوں - [5] مصرع ثانی میں استفہام انکاری ہے - "زندگی" کے لفظ پر زور دیا ہے - یعنی زندگی جیسی بے حقیقت چیز کے لئے کیا شرمندۂ احساں ہونگے -

تیرے[۶] دل تفتہ کی تربت پہ عدو جھوٹا ہے
گُل نہ ہونگے شررِ آتشِ سوزاں ہونگے

غور[۷] سے دیکھتے ہیں طوف کو آہوئے حرم
کیا کہیں اُسکے سگِ کوچہ کے قرباں ہونگے

داغ دل نکلیں گے تربت سے مری جوں لالہ
یہ وہ اخگر نہیں جو خاک میں پنہاں ہونگے

چاک پردہ سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہونگے

ق

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہونگے

سنگ[۸] اور ہاتھ وہی وہ ہی سر و داغ جنوں
وہ ہی ہم ہونگے وہی دشت و بیاباں ہونگے

(۵)

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

(۱) ۱۶۷

سینہ[۱] کوبی سے زمیں ساری ہلا کے اُٹھے
کیا عَلَم دھوم سے ترے شہدا کے اُٹھے

آج اُس بزم میں طوفان اُٹھا کے اُٹھے
یاں تلک روئے کہ اُس کو بھی رُلا کے اُٹھے

دل سے کیونکر نہ دھواں ساتھ ہوا کے اُٹھے
شعلہ ہائے تپِ غم سینہ جلا کے اُٹھے

[۶] پہلے مصرع میں تعقید ہے۔ دشمن نے محبوب کو خبر دی کہ تیرے دل تفتہ (عاشق دل سوختہ) کی تربت پر گل پڑے ہوئے تھے شاعر کہتا ہے کہ وہ جھوٹا ہے۔ سوز عشق کی لذت کیا جانے۔ عاشق کی قبر پر گُل ہونگے۔ آتشِ دل کی چنگاریاں ہونگی جو مدفن سے باہر آگئی ہیں۔ [۷] آہوئے حرم = حرم مکہ کے ہرن جنکو شکار کرنا ممنوع ہے۔ آہوانِ حرم زائران کعبہ طواف کو غور سے دیکھتے ہیں۔ کہیں انکا مقصد یہ نہ ہو کہ طرز طواف سیکھ کر اُس کافر کے سگِ کوچہ کے گرد پھریں اور اپنے آپکو قربان کردیں۔ [۸] یہ اور شعر ماقبل قطعہ بند ہیں۔ اُدھر اطفال کے ہاتھ ہونگے اور سنگ ہونگے جن سے دیوانہ کو ماریں گے۔ اِدھر دیوانہ کا سر ہوگا اور اُس پر زخموں کے داغ ہونگے۔

[۱] جس وقت تیرے شہیدان محبت کے عَلَم اُٹھے تو اہل ماتم نے اُنکے غم میں اسقدر سینہ کوبی کی کہ زمین ہلنے لگی۔

گر[۵۲] نہ ہو دل میں خیالِ نگہِ خواب آلود — (2) درد کیا کیا اثرِ خفتہ جگا کے اُٹھے

شمع[۵۳] کے چور کا محفل میں جو مذکور ہوا — دل چُرا بیٹھے تھے جب آنکھ چُرا کے اُٹھے

گو کہ[۵۴] ہم صفحۂ ہستی پہ تھے اِک حرفِ غلط — (3) لیک اُٹھے بھی تو اِک نقش بٹھا کے اُٹھے

ہو عذابِ شبِ[۵۵] یلدا سے رہائی یا رب — زلف مُنہ سے کہیں اُس مہرلقا کے اُٹھے

اُف رے گرمئ محبّت کہ ترے سوختہ جاں — (4) جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کے اُٹھے

مَیں دکھاتا تمھیں تاثیر مگر ہاتھ مرے — ضعف کے ہاتھ سے کب وقتِ دعا کے اُٹھے

سوزشِ دل سے ہوا کیا ہی مَیں پانی پانی — وہ جو پہلو سے پسینے میں نہا کے اُٹھے

جی ہی مانند نشانِ کفِ پا بیٹھ گیا — (5) پاؤں کیا کوچے سے اُس ہوش ربا کے اُٹھے

شعر[۵۶] مومن کے پڑھے بیٹھ کے اُسکے آگے
خوب احوالِ دلِ زار سُنا کے اُٹھے

۵۲ مَیں صرف اسوجہ سے نہیں تڑپتا کہ محبوب کی نگاہ خواب آلودہ کا خیال ہے اگر اُسکی نیند میں خلل پڑنے کا اندیشہ نہ ہو تو درد اس طریقہ سے اُٹھے کہ سویا ہوا اثر بھی جاگ جائے (یعنی محبوب کے دل میں تاثیر کرے)

۵۳ شمع کا چور = دزدِ شمع۔ شمع کا گُل کاٹنے کے بعد جو ریشہ باقی رہجائے۔ معشوق جو میرا دل چُرا چکا تھا دزدِ شمع کا ذکر سنتے ہی محفل سے خفیف ہو کر اُٹھ گیا۔ مثل مشہور ہے کہ چور کی داڑھی میں تنکا ۵۴ نقش بٹھانا = اثر قائم کرنا۔ ۵۵ یلدا = سب سے بڑی اور لمبی رات جو ایکبار ہر سال پوس کے مہینے میں پڑتی ہے۔ یہاں زلفِ سیاہ سے عارضِ روشن کے چھپ جانے کو شبِ یلدا سے تعبیر کیا گیا ہے

۵۶ مراد یہ ہے کہ مومن کے اشعارِ حالیہ ترجمانِ وارداتِ دل ہوتے ہیں " جو سنتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے" ہم نے اس بہانے سے دوست کو اپنا حالِ دل سُنا دیا۔

منہ کو نہ سیا ناصح کی بخیہ گری اتنی
لوں میں بھی ابھی لتّے ہیں پردہ دری اتنی

تم اُٹھ گئے محفل سے ذکر آتے ہی مجنوں کا
سایہ سے مرے وحشت لے رشک پری اتنی

دل لے کے وفا کیسی پر قول تو دینا تھا
اے سیمتن آفت ہے تو مفت بری اتنی

بے پردہ پسِ چلون یکبار تم آ بیٹھے
ہے تاب نظر کس کو کیوں جلوہ گری اتنی

لازم تھا حذر مجھ سے ناچیز کے نالوں سے
پر تجھ کو کہاں غیرت لے بے اثری اتنی

لو چھیڑے ہے نکہت کو گلہائے شبینہ کی
اب تم سے بھی چل نکلی بادِ سحری اتنی

یہ کون کہے اُس سے کی ترک وفا میں نے
کر تو ہی ذرا ناصح پیغامبری اتنی

کیا ہو گئی خود بینی اب غیر سے چشمک ہے
یا خوش نگہی وہ کچھ یا بد نظری اتنی

---

۱ لتے لینا = خبر لینا - ہیں کلمہ تنبیہ ہے - یعنی کیوں میرے رازِ محبت کی پردہ دری کر رہا ہے - میرے چاکِ گریباں کو تو نے سیا مگر اپنے منہ کو نہ سیا ہے شرط جو ابھی تیری خبر لوں ۲ جنوں کے باب میں عاشق اپنے کو اصل اور مجنوں کو اپنا سایہ قرار دیتا ہے مجنوں - سایہ - وحشت - پری میں رعایت ہے - ۳ مُفت بری = مُفت اُڑا لے جانا - اگر ہے تو اتنی مُفت بری ضرور آفت ہے - ۴ یعنی سب نے (حتیٰ کہ اثر نے) حقیر سمجھ کر مجھ سے کنارہ کیا مگر اسے بے اثری تو بے غیرت ہے کہ میرے نالوں کا ساتھ نہیں چھوڑتی - مگر شاعرانہ ہے ۵ لو بادِ سحری تم سے بھی شوخیاں کرنے لگی کہ تمھارے رات کے باسی ہار کے پھولوں کو چھیڑتی ہے یعنی پھولوں کی نکہت کو اُڑائے پھرتی ہے کہ شب گذشتہ کے عیش کی پردہ دری کر کے تمھیں خجل کرے - ۶ اصلاً ترکِ وفا مقصود نہیں بلکہ شاید شوخی سے ناصح کی نصیحت قبول کرنے کا ادعا کیا ہے اور اُسکو پیغامبر بنانا چاہا ہے تاکہ وہ خود جا کر جمالِ جاناں کی تجلّی دیکھ لے اور آئندہ عاشق کو عشق میں معذور سمجھے -
۷ تم ہر وقت غیر سے نظر بازی کرتے ہو - وہ تمھاری خود بینی اب کہاں گئی ہائے

کہتا ہے[۸] مرے آگے وہ مجھ پہ عدو غش ہے | ہے ہے مری الفت سے ہے بے خبری اتنی

سجدہ[۹] نہ کہیں کرنا مومن قدم بت پر
کعبے ہی میں ہوتی ہے بیہودہ سری اتنی

۱۲۸

پھر وہ وحشت کے خیالات ہیں سر میں پھرتے | دشت یاد آتے ہیں آہو ہیں نظر میں پھرتے

واہ[۱۰] اے طالع برگشتہ کہ وہ پھر ہی گیا | آن کر دیکھ مجھے راہ گذر میں پھرتے

پھرتے[۱۱] دن اپنے تو غیروں کی طرح راتوں کو | کیسے ہم کوچۂ مہتاب قمر میں پھرتے

عطر[۱۲] غیروں کو لگا کر جو رلایا اس نے | تر مرے سے ہیں مرے دیدۂ تر میں پھرتے

منتظر کس کے یہ رہتے ہیں کہ ہم ہر شب کو | تا سحر شام سے اٹھ اٹھ کے ہیں گھر میں پھرتے

ہے[۱۳] زباں بند اثر دل سے شب وصل میں اور | فکر سو سو ہیں دل مرغ سحر میں پھرتے

قلق[۱۴] دل سے ہے جنبش ترے پیکانوں کو | پوچھ مت حال کہ برچھے سے ہیں بر میں پھرتے

۸ اگر اسے میری محبت کا اندازہ ہوتا تو غیر کی فریفتگی کا یوں اظہار نہ کرتا۔ ۹ یہ شعر گویا دوسرے کی زبان سے ادا کیا ہے۔ مومن کو سجدہ بت سے انکار ہے۔ معترض کہتا ہے کہ غیر تمھیں ضد ہے تو قدم بت پر سجدہ نہ کرنا۔ سچ ہے اس قسم کی لغویات (سجدہ وغیرہ) تو کعبے ہی میں ہوا کرتی ہیں۔ نعوذ باللہ منہ۔ شعر کا لہجہ سخت طنزیہ ہے۔ ۱۰ میں انتظار یار میں رہ گذر پر پھر رہا تھا۔ اسکا اثر یہ ہونا چاہئے تھا کہ محبوب میرے ذوق شوق کی قدر کرتا۔ مگر میرے نصیب کی برگشتگی دیکھئے کہ وہ مکان پر میری عدم موجودگی کا بہانہ تلاش کر کے اپنے گھر واپس چلا گیا۔ اور میرے یہاں نہ آیا ۱۱ اگر ہمارے دن اچھے ہوتے تو دیکھتے کہ ہم بھی کس آزادی سے (کیسے) راتوں کو رقیبوں کی طرح اس قمر لقا (محبوب) کے کوچے میں پھرتے۔ اگر غیروں سے بیگانے مراد لیں اور کیسے بمعنی کاہے کو ہو تو یہ معنی ہونگے کہ ہم کاہے کو شب میں بیگانوں کی طرح اسکے کوچے میں پھرتے اور اسکی محفل ناز سے محروم رہتے۔ ۱۲ معشوق نے رقیبوں کے عطر لگا کر مجھے جو رشک سے رلایا ہے تو میرے دیدۂ تر میں تر مرے سے پھرتے ہیں تر مرے ضعف کی وجہ سے آنکھوں کے آگے جو تارے سے نظر آتے ہیں۔ یہ چکنائی کے داغ جو پانی کے اوپر نظر آئیں عطر اور دیدۂ تر کی مناسبت سے دوسرے معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ ۱۳ آسمان کی دشمنی کا تقاضا تو یہ تھا کہ میرے شب وصل میں ہر شام سے مرغ سحر بولنے لگتا مگر نہ بولنے کا سبب یہ ہے کہ میرے دل کی تاثیر سے اسکی زبان بند ہو گئی ہے۔ اگرچہ اسکے دل میں سو سو خیال آ رہے ہیں کہ کسطرح عاشق کی شب عیش کا خاتمہ ہو۔ ۱۴ برچھے پہلو میں میرے پہلو میں تیر پیوست ہیں جو دل کی تڑپ سے جنبش کرتے ہیں اسی وجہ سے میرے پہلو میں تکلیف ہے جو برچھے کے گڑھ جانے سے ہو سکتی ہے۔

ایک[6] دم گردشِ ایام سے آرام نہیں | گھر میں ہیں تو بھی ہیں دن رات سفر میں پھرتے

مر گئے تھے تو تسلی کو میری کہہ جاتے | کہ اب آتا ہوں وہ گو آٹھ پہر ہیں پھرتے

زرد[7] رخ رنگ طلائی کے ہوئے دیوانے | کیمیا ساز بھی ہیں خواہشِ زر میں پھرتے

سرمہ[8] گیں چشم کی گردش جو نہ بھا جاتی تو | خاک یوں کاہے کو ہم ڈالتے سر میں پھرتے

جنبشِ[9] نرگسِ جنت نے رلایا مومن
چشمِ کافر کے اشارے ہیں نظر میں پھرتے

۱۴۹

پامالیِ[1] اک نظر میں قرار و ثبات ہے | اُس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے

پیغامبر رقیب سے ہوتے ہیں مشورے | سُنتا نہیں کسی کی یہ کہنے کی بات ہے

چھٹ[2] کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی | ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

۶ہ ہمیں گھر میں بھی سفر کی سی صعوبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ "گردشِ ایام" سے کسی وقت راحت نہیں۔ گردش کو سفر سے تعبیر کیا ہے۔ ۷ہ زرد رخ سے یہاں چمپئی رنگ حسین مراد ہیں اور اسی مناسبت سے انکو کیمیا ساز قرار دیا ہے کہ زرد (چمپئی رنگ) کو کہتے ہیں۔ چمپئی رنگ والے حسین بھی معشوق کے کندنی رنگ کے دیوانے ہو گئے۔ گویا کیمیا ساز بھی زر کی جستجو میں پھرتے ہیں۔ رنگ طلائی کی مناسبت سے زر کا لفظ استعمال کیا۔ ۸ہ سرمہ کی مناسبت خاک سے اور گردش کی مناسبت پھرنے سے ظاہر ہے۔ ۹ہ جنت میں نرگسِ جنت کی جنبش دیکھکر چشمِ کافر کے غمزے یاد آتے ہیں اور رونا آتا ہے۔

۱ہ محبوب کا میری طرف نہ دیکھنا بھی نگہِ التفات کا حکم رکھتا ہے کیونکہ اگر وہ اِدھر دیکھتا تو میرا قرار و ثبات پامال ہو جاتا۔ ۲ہ ناصح عاشق کو ترکِ محبت کی ترغیب دیتا ہے تاکہ بندِ غم سے رہائی ہو۔ وہ جواب دیتا ہے کہ بندِ غم میرے حق میں بمنزلۂ قیدِ حیات ہے اسلئے اگر بندِ غم سے چھوٹ گیا تو میرا جینا محال ہے۔ مرزا نے بھی یہ مضمون فلسفیانہ انداز میں باندھا ہے مگر لطفِ تغزل نہیں "قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں + موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں"

کیا[۱] یوں ہی جائے گی مری فریاد سرزنش — واعظ کو روزِ حشر امید نجات ہے

بدنامیوں[۲] کے ڈر سے عبث تم چلے کہیں — ہوں تیرہ روز میری سحر بھی تو رات ہے

لکھا[۳] جو اُس کو خط میں بلانوشیوں کا شکر — بالیدگی سے جوں خم گردوں دوات ہے

کیا مال[۴] ہیں کہ جان دیں دیتے ہیں دم تمھیں — اغیار بوالہوس کی یہی کائنات ہے

کیا ابتدائے حسن میں مَیں تجھ پہ مر گیا — خلقت کا تیری دن مرا روزِ وفات ہے

جھوٹی[۵] شراب اپنی مجھے مرتے دم تو دے — یہ آب تلخ شربتِ قند و نبات ہے

کیونکر[۶] خدا کو دوں کہ بتوں کو ہے احتیاج
مومن یہ نقدِ دل زرِ جاں کی زکات ہے

[۱] واعظ مجھے سرزنش (ملامت) کرتا ہے اور میں اُسکے طرزِ عمل پر فریاد۔ اب واعظ کو جو حشر میں اپنی نجات کی اُمید ہے تو کیا اُس نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ میری فریاد یوں ہی رائگاں جائیگی۔ [۲] تم صبحِ شبِ وصال بدنامی کے خیال سے کیوں جا رہے ہو۔ مَیں تو ازلی تیرہ روز (سیاہ بخت) ہوں اور میری صبح بھی رات کی طرح تاریک ہے۔ پھر بدنامی کا کیا ڈر۔ تیرہ روز ہونے کی بنا پر اپنی سحر کو رات قرار دیا ہے۔ [۳] بلانوشی = کثرت مے نوشی۔ مَیں نے اپنی کثرت شرابخواری کا شکر جو دوست کو تحریر کیا تو اُسکے اثر سے دوات بڑھکر خم گردوں کے برابر ہو گئی یعنی چونکہ بلانوشی میں کثرت کا مفہوم داخل ہے۔ اسلئے ہر چیز میں بالیدگی آگئی حتیٰ کہ دوات میں بھی بلانوشی اور خُم کی مناسبت ظاہر بعض نسخوں میں شکر کی جگہ ذکر ہے۔ [۴] کیا مال ہیں = کیا چیز ہیں۔ دم دیتے ہیں = دھوکا دیتے ہیں۔ [۵] آبِ تلخ سے شراب مراد ہے۔ کہ تلخ ہوتی ہے یعنی مجھے شربت کی طرح مرغوب ہے۔ قاعدہ ہے کہ مرتے وقت مُنہ میں شربت ٹپکاتے ہیں۔ [۶] میرا نقدِ دل زرِ جاں کی زکوٰۃ ہے یعنی جان (جو بمنزلہ راس المال ہے) کے مقابلہ میں دل کی حقیقت زکوٰۃ سے زیادہ نہیں۔ اب یہ دل خدا کو کیونکر دوں وہ تو بے نیاز ہے۔ ہاں بتوں کو دینا چاہیئے کہ اُنکو اس (دل) کی احتیاج ہے اور زکوٰۃ محتاج ہی کو دیجاتی ہے نہ کہ غنی کو۔

۱۸۶/

نہ دینا بوسۂ پا گو فلک جھکتا زمیں پر ہے ۔۔۔ کہ یہ اُتنا زمیں کے نیچے ہے جتنا زمیں پر ہے

تڑپتا ہے پڑا شوقِ شہادت خاک و خوں میں ۔۔۔ گرا کوچے میں تیرے یہ لہو کس کا زمیں پر ہے

خرامِ ناز نے کس کے جہاں کو کر دیا برہم ۔۔۔ زمیں گردی فلک پر ہے فلک گرتا زمیں پر ہے

تری دوری میں بھی کیا جا کے جاں اس پاس جانا ہے ۔۔۔ کہ جس نے آسماں پر سے اُسے پٹکا زمیں پر ہے

رہا اس کو میں مٹی یار لیجائیں تو لیجائیں ۔۔۔ کہ پڑتا پاؤں مانندِ نشانِ پا زمیں پر ہے

نویدِ قتل سے بھی ہو دلِ مضطر کو کیا تسکیں ۔۔۔ کہ قدرِ نیم رقصِ مرغِ بسمل جا زمیں پر ہے

مری فریاد سُن کہتا ہے اسرافیل حیرت سے ۔۔۔ قیامت آ گئی کیونکر یہ غل کیسا زمیں پر ہے

گلہ ہے گردشِ چشمِ سیہ کا تیرے وحشی کو ۔۔۔ کہ تنگی سے سدا ہے ہے فلک لگتا زمیں پر ہے

وہ سر جو کل ترے زانو پہ تھا سو آج اے ظالم ۔۔۔ کبھو رہتا ہے پتھر پر کبھی رہتا زمیں پر ہے

کبھو

لہ کسی شخص کی عیّاری کا ذکر کرتے ہیں تو کہا کرتے ہیں کہ یہ جتنا اوپر (نمایاں) ہے اُتنا ہی نیچے (گہرا) ہے۔ آسمان کی نسبت قدیم ہیئت کا خیال تھا کہ یہ زمین کے اوپر او نیچے انڈے کی سفیدی کی طرح محیط ہے۔ چنانچہ شاعر معشوق سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اگرچہ آسمان بطور خوشامد زمین پر جھکتا ہے تاہم اسکو اپنے پاؤں کا بوسہ نہ دینا۔ کیونکہ یہ عیّار ہے۔ اس کی ظاہری عاجزی کا کیا اعتبار۔

ٹہ تیرے کوچے میں کس (رقیب) کا لہو زمین پر گرا ہے کہ میرا شوقِ شہادت اُس (لہو) کو دیکھکر خاک و خون میں تڑپ رہا ہے یعنی میں بے تاب ہوں کہ یہ سعادت مجھے کیوں نہ ملی۔

سٹہ شاعر ہجر میں اپنے نہ مرنے کی توجیہ کرتا ہے کہ اگر مر جاؤں گا تو اُس (خدا) کے پاس جانا ہوگا جس نے اس جان کو آسمان سے زمین پر دے پٹکا یعنی دنیا میں بھیجا۔ جب پہلے ہی اُس نے میری جان کی قدر نہ کی تو اب کیا کرے گا۔

سٹہ میں تو اب کوے یار کا ہو رہا۔ ہاں مرنے کے بعد اگر احباب چاہیں تو میری مٹی لے جائیں۔ زندگی میں محال ہے کیونکہ جس طرح نشانِ قدم گر کر نہیں اُٹھتا میرا پاؤں بھی اُس کوچے کی زمین سے نہیں اُٹھتا۔ شہ زمین میں مقدار وسعت نہیں کہ مرغِ بسمل کے نیم رقص کے لئے جا نکل سکے اسلئے میرے دلِ مضطر کو مژدۂ قتل سُنکر بھی تسکین نہیں کیونکہ قتل کے بعد تڑپنے کے لئے گنجائش کہاں آئیگی۔ شہ اسرافیل = ایک فرشتہ کا نام جو قیامت کو صور پھونکے گا اور تمام کا تمام درہم برہم ہو جائیگا۔ شہ تیرا دیوانہ تنگ آکر زمین پر بیٹھا ہے فلک لگتا مگر اصل میں اسکو فلک کی نہیں بلکہ تیرے چشمِ سیاہ کی گردش کا مقصود کیونکہ اُسکے نزدیک فلک بھی چشمِ سیاہ کے اشارہ پر چلتا ہے۔ زمین پر لکھنا حرکات جنون ہے محبوبوں کی نسبت کبھی ایسا ہی قصہ مشہور ہے

فرشتو لیچلے اُس کو سے کیوں جنت میں تم مجھکو | بھلا کیا ساکنانِ چرخ کا دعویٰ زمیں پر ہے

ہوا[۵۰] مُہرِ براءت عفو نقشِ سجدہ مومن کو
قدم رکھتا فلک پر ہے کہ سر رکھتا زمیں پر ہے

۱۸۱

مجھے یاد آگئی بس دو ہیں اُسکے قد و قامت کی | چمن میں دیکھکر گل سرو میں نے کیا قیامت کی
دیا[۵۱] ظالم کو دل جاں غیر کو آرام وحشت کو | کسی کا شکوہ کیا کیجے یہ خوبی اپنی قسمت کی
ستم پیشہ ہے بدخو ہے ستمگر ہے جفا جو ہے | کروں کیا کیا شکایت دوستو اُس بے مروت کی
موے[۵۲] ہیں حسرتِ دیدار میں خوں روتے روتے ہم | عجب کیا ہے جو نکلے سُرخ نرگس اپنی تربت کی
مبارک[۵۳] خفتگانِ خاک کو تصدیع بیداری | کہ گورِ تیرہ سے یاد آئی مجھکو رات فرقت کی
جفا کا شکوہ اب کیوں جو کیا اچھا کیا اُس نے | سزا ہے اے دلِ ناداں اُس الفت اس محبت کی
تری[۵۴] دل گرمیاں آخر جلا رہونگی غیروں کو | کہ دوزخ نے قسم کھائی ہے میرے سوزِ غیرت کی

۵۰ براءت = روپیہ کا چک۔ دستاویز۔ سجدہ کا نقش مومن کے لئے فرمانِ مغفرت کی مہر بن گیا یعنی باعثِ بخشش ہو گیا گویا مومن کا زمین پر سجدے کے لئے سر رکھنا آسمان پر پاؤں رکھنے کا حکم رکھتا ہے۔ آسمان پر پاؤں رکھنے میں حصولِ افتخار و شرف کا مفہوم ہے۔ نقشِ سجدہ کو مہر سے تشبیہ دی ہے۔

۵۱ ہم نے نگار (معشوق) کو دل۔ رقیب کو جان اور جنون کو اپنا آرام دے ڈالا۔ قسمت بمعنی تقدیر بھی ہے اور بمعنی تقسیم بھی اسلئے شاعر نے اس لفظ سے خاص فائدہ لیا ہے۔ ۵۲ حسرتِ دیدار کی رعایت سے نرگس اور خون رونے کی مناسبت سے سُرخ استعمال کیا ہے۔ ۵۳ خفتگانِ خاک = اہلِ قبور۔ تصدیع = تکلیف۔ چونکہ گورِ تیرہ و تاریک شبِ ہجر سے مشابہ ہے اسلئے قبر میں پہونچکر مجھے شبِ ہجر یاد آئی اور میں آمادۂ فریاد ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام مردے میرے نالوں سے جاگ اُٹھیں گے۔ یہ مبارکباد ہیں جو طنز سے قابلِ داد ہے۔ ۵۴ دل گرمی = اختلاط۔ گرم جوشی۔ میرا سوزِ رشک اس حد تک پہونچ گیا ہے کہ آتشِ دوزخ بھی اُس کو مانتی ہے اور اُسکی قسم کھاتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر تو رقیبوں سے گرم جوشی کریگا تو وہ غیرت سے جلتے تھے بالآخر ایک دن یہی میرا سوزِ غیرت اُنکو پھونک دیگا۔

مرے خواب عدم کا بیستوں کو کاٹ کر پایا ملی فرہاد شیریں کام کو راحت یہ محنت کی
گلہ کیا کیجئے اُس بدگماں عیّار پُرفن کا کہ عرضِ حال سے جسکو شکایت ہو شکایت کی

وہی مذہب ہے اپنا بھی جو قیس و کوہکن کا تھا
نئی راہ افترا ہے کب بھلا مومن نے بدعت کی

۱۸۲

وہ گردن دیکھ یہ حالت ہوئی تغیر شیشہ کی کہ تھمتی ہی نہیں ہچکی ہوئی ہے دیر شیشہ کی
مدام اُس دلبر سیکش کے منہ لگتا ہے لے ساقی بنائی ہائے کیا اللہ نے تقدیر شیشہ کی
سوا اے محتسب اسکے کہ اپنے دل کی صورت ہے سزاوار شکستن کون سی تقصیر شیشہ کی
اثر اُس سنگدل کو کیا ہو عرضِ دلشکستن کا شکایت ہے مری فریاد بے تاثیر شیشہ کی

مشہور مقولہ ہے کہ محنت کے بعد راحت ہے۔ فرہاد نے یہ محنت جھیلی کہ شیریں کی خاطر کوہ بے ستون کو کاٹا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ خواب عدم کی راحت میسّر ہوئی۔ فرہاد کو شیریں کام اسوجہ سے کہا ہے کہ اُسکو مصائب زندگی سے آرام ملگیا۔ فرہاد اور شیریں کام میں ایہام تناسب ہے۔ جو میرے عرضِ حال کو شکایت سمجھکر شکایت کرتا ہے۔ مومن نے نئی راہ کب ایجاد کی۔ یہ اُسپر افترا ہے۔ اصل میں وہ اُسی مذہب عشق پر قائم ہے جو قیس و کوہکن کا تھا۔ بدعت نئے کام کو خصوصاً مذہب میں نئی بات کو کہتے ہیں۔ گردنِ معشوق کو صراحی (شیشہ) سے تشبیہ دیجاتی ہے اور ہچکی سے صدائے قلقل مراد ہے۔ دوسرے مصرع میں سخت تعقید ہے یعنی دیر ہوئی ہے۔ شیشہ کی ہچکی تھمتی ہی نہیں۔ محتسب تو جو شیشۂ شراب توڑتا ہے اسکا کیا قصور۔ ہاں یہ قصور ضرور ہے کہ یہ (شیشہ) میرے دل سے مشابہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ تیرا مقصد میری دلشکنی ہے اور بس شیشۂ شراب توڑنے کا تو صرف بہانہ ہے۔ عرضِ دلشکستن = دلشکنی کا بیان۔ میں اپنی دلشکستگی کا اُس سنگدل سے بیان کرتا ہوں۔ مگر اُس پر اثر نہیں ہوتا۔ گویا میری شکایت ایسی ہی رائگاں ہے جیسے شیشہ کی فریاد بے تاثیر۔ شیشہ کے ٹوٹنے کی جھنکار کو فریاد کہا ہے۔

ہوں اک آئینہ رو کا دیدۂ پرآب دیوانہ — بنا اشکِ مسلسل سے مرے زنجیر شیشہ کی

بیاں کرتا ہے ہکلانے کا اُس بدمست کے عالم — وہ لے کیا سمجھئے پیچیدہ ہے تقریر شیشہ کی

یہ کیا طاقت کہ اب بھی محتسب پامال کر ڈالے — ملا تو خاک میں پر ہے وہی توقیر شیشہ کی

کرامت ہے رخِ زرد آپ کے دل تفتہ کا ورنہ — کہیں بنتی سُنی ہے آجتک اکسیر شیشہ کی

بھلا کیا اعتبار اے مومن ایسی پارسائی کا
کہ بیخود ہو گئے تم دیکھکر تصویر شیشہ کی

۱۸۴

کشتۂ حسرتِ دیدار ہیں یارب کس کے — نخل تابوت میں جو پھول لگے نرگس کے

وہ چلا جان چلی دونوں یہاں سے کھسکے — اِس کو تھاموں کہ اُسے پاؤں پڑوں کس کس کے

پاؤں تربت پہ مری دیکھ سنبھل کر رکھنا — چوُر ہے شیشۂ دل سنگ ستم سے پس کے

سکہ اے دیدۂ پرآب - میں ایک آئینہ رو کی محبت میں دیوانہ ہوں - اور اُسکی یاد میں رو رہا ہوں - اسلئے میرے "تار اشک" سے شیشہ کی زنجیر تیار کر - یعنی آئینہ رو کے دیوانہ کے لئے زنجیر بھی شیشہ کی ہونی چاہئے - آئینہ رو کی مناسبت سے شیشہ اور اشک مسلسل کی مناسبت سے زنجیر لکھا ہے - ھہ شیشہ کی قلقل (جسے تقریر کہا گیا ہے) کی توجیہ شاعر نے یہ کی ہے کہ یہ اُس بدمست کے نشہ میں ہکلانے کی کیفیت بیان کر رہا ہے - مگر اس (شیشہ) کی تقریر پیچیدہ ہے اسلئے سمجھ میں نہیں آتی - ہکلانے کی معنوی مناسبت قلقل مینا سے ظاہر ہے - لہ کیونکہ اگر محتسب شیشہ کو خاک میں ملانے کے بعد پامال کریگا تو اُسکے پاؤں زخمی ہو جائینگے - کہ دل تفتہ = عاشق جسکا دل سوختہ ہے اکسیر = وہ خاک جو سونا بنا دے - میرا دل جلکر خاک ہوا اور خاک میں اکسیر کی خاصیت پیدا ہو گئی جسکے اثر سے میرے چہرہ کا رنگ زرد ہو گیا - یہ کرامتِ عشق ہے ورنہ شیشہ کی اکسیر نہیں بنتی - رخ زرد سونا ہے جو اکسیر کا نتیجہ ہے - دل کی مناسبت سے شیشہ کا لفظ استعمال کیا ہے - شہ شیشہ سے مراد شیشۂ مے ہے - سلہ نخل تابوت = ایک قسم کی آرائش جو مُردے کے تابوت پر کیجاتی تھی حسرتِ دیدار کی مناسبت سے "نرگس کے پھول" استعمال کیا نخل اور پھول کی رعایت ظاہر ہے - تلہ مبادا تیرے پائے نازک کو گزند پہونچ جائے -

وصل کی بات کب بن آئی تھی
بات اپنی وہاں نہ جمنے دی
سن کے اُڑتی سی اپنی چاہت کی
اور ہی کچھ بڑھا دیا اُس کو
بن کہے راز ہائے پنہانی
کیا تماشا ہے جو نہ دیکھے تھے

دل سے دفتر بنائے لوگوں نے
اپنے نقشے جمائے لوگوں نے
دونوں کے ہوش اُڑائے لوگوں نے
دشمنوں کے پڑھائے لوگوں نے
اُسے کیونکر سنائے لوگوں نے
وہ تماشے دکھائے لوگوں نے

کر دیا مومن اُس صنم کو خفا
کیا کیا ہائے ہائے لوگوں نے

۱۸۵

تمھیں تقصیر اُس بت کی کہ ہے میری خطا لگتی
تڑپنے لوٹنے رونے کا باعث تجھ پہ بھی کھلتا
ستم[1] اے شور بختی میری ہڈی کیوں ہما کھاتا
جو[2] مر جاتا تو یہ دُکھ کاہے کو سہتا اگر آمیں
وہ پھر ہے گرم نظارہ کہاں تک زخم دل[3] ٹانکوں

مسلمانو! ذرا انصاف سے کہیو خدا لگتی
ترے دل کو بھی میری سی اگر اے بیوفا لگتی
سگِ لیلیٰ ادا کو گر نہ ظالم بدمزا لگتی
نہ کہتا میں تو شاید دشمنوں کی بددعا لگتی
کہ ہے ہر ہر نگہ کے ساتھ اک برچھی سی لگتی

---

[1] شاعر کو شکایت ہے کہ میرے مرنے کے بعد میری ہڈیاں ہما نے کیوں کھائیں۔ اگر محبوبہ لیلیٰ ادا کا کتا کھاتا تو میری سعادت تھی۔ ظالم شور بختی (بدنصیبی) تیرا برا ہو۔ اگر تو نہ ہوتی تو میری ہڈیاں دوست کے کتے کو کیوں بدمزہ لگتیں۔ شور اور بدمزہ کی رعایت اوپر گذری۔ کہا جاتا ہے کہ ہما کی غذا استخواں ہے۔ سگ لیلیٰ کا قصہ مشہور ہے۔ [2] رقیبوں نے مجھے بددعا دی (کہ اسے موت آئے) میں کہ زیست سے بیزار تھا شامت اعمال سے اُس پر آمین کہہ اُٹھا۔ مگر چونکہ اثر کو میرے ساتھ دشمنی ہے میرے آمین کہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ موت ٹل گئی۔ کاش میں آمین نہ کہتا تو شاید دشمنوں کی بددعا لگتی اور میں مر کر غم سے چھوٹ جاتا۔ اگر آمین کا تعلق مصرع ثانی سے ہے۔

نسیم مصر کا دم پیر کنعاں کاہے کو بھرتا
جو گر یہ تر نہ کر دیتا تو جیسے نالہ کھینچا تھا
کئے تھے کاٹ کاٹ آلودہ خوں سے ہاتھیاں اپنے
بلائے جاں ہوا دھیان اُس سیہ کاکل کی چوٹی کا

اگر کوچہ کی تیرے خاک آلودہ ہوا لگتی
چمن میں کوہ میں صحرا میں آتش جابجا لگتی
وہاں دستِ عدو سے پاؤں میں تھی شب حنا لگتی
نہ لگتا دل تو دل کے پیچھے کاہے کو بلا لگتی

کہیں سے ڈھونڈھ کر لانا بُتِ کافر کو اے مومن
طبیعت سیر جنت میں نہیں اُسکے سوا لگتی

۱۸۶

سرگیں چشم سے کیوں تیز نظر کرتا ہے
کب مرا نالہ ترے دل میں اثر کرتا ہے
جب وہ حیرت زدہ چہرے پہ نظر کرتا ہے
آئنہ صد گلہ آئنہ گر کرتا ہے
گر تصور سے ہوں ہم بزم تو بیتاب رہے
کس قدر وہ مرے ملنے سے حذر کرتا ہے
کس کے ہنسنے کا تصور ہے شب و روز کہ یوں
گدگدی دل میں کوئی آٹھ پہر کرتا ہے

نسیم مصر = مصر کی ہوا جو مصر سے حضرت یوسفؑ کی بوئے پیرہن اُنکے پدر بزرگوار تک لائی - پیر کنعان = حضرت یعقوب علیہ السلام - دم بھرنا نسیم کے لئے خالی از لطف نہیں -

تو مجھے مصروف نالہ پاکر ناراض کیوں ہوتا ہے ؟ میرا نالہ تیرے دل پر اثر کرنے والا نہیں اور ظاہر ہے کہ بے اثر چیز پر ناراض ہونا بے سود ہے -

جس وقت محبوب ہنگام آرایش آئینہ میں اپنے کمال حُسن کو دیکھکر حیرت زدہ انداز میں اپنے چہرہ پر نظر ڈالتا ہے تو آئینہ منفعل ہوکر اپنے بنانے والے کا گلہ کرتا ہے - کہ نہ آئینہ گر مجھے بناتا نہ مَیں محبوب کی حیرانی کا باعث ہوتا اگر حیرت زدہ چہرہ سے چہرۂ عاشق مراد لیں تو یہ معنی ہونگے کہ آئینہ رشک سے آئینہ گر کی شکایت کرتا ہے کہ مجھے آئینہ کیوں بنایا - کاش مَیں بھی عاشق کا چہرہ ہوتا -

اُس کو مجھ سے اس قدر نفرت ہے کہ اگر مَیں عالم تصور میں بھی اُس کا ہم بزم ہوتا ہوں تو وہ بیتاب ہو جاتا ہے -

غم[۵۴] خط میں ترے مرجائیں تو کچھ کیا ہے عجب
زہر کو جو کوئی کھاتا ہے ضرر کرتا ہے

اِک[۵۵] نمکداں سے تو لذت نہ اُٹھی اے قاتل
زخمِ دل عرضِ نمکدانِ دگر کرتا ہے

کیا کیا دل نے کہ آنکھوں سے کہا رازِ نہاں
ایسے غمّاز کو بھی کوئی خبر کرتا ہے

عیش میں بھی تو نہ جاگے کبھی تم کیا جانو
کہ شبِ غم کوئی کس طور سحر کرتا ہے

عدم آباد سے آنا مجھے یاد آئے ہے جب
کوئی حسرت زدہ دنیا سے سفر کرتا ہے

بخت[۵۶] بدنے یہ ڈرایا ہے کہ کانپ اٹھتا ہوں
تو کبھی لُطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے

قتل[۵۷] کی ٹھہر گئی اپنے رقیبوں میں کہ آج
خندہ کچھ طرزِ دگر چاکِ جگر کرتا ہے

سُن رکھو سیکھ رکھو اس کو غزل کہتے ہیں
مومن اے اہلِ فن اظہارِ ہُنر کرتا ہے

۱۸۷

دیکھ[۱] گریاں مجھے وہ چشم کو تر کرتا ہے
اشکِ غمّاز بھی کیا آنکھوں میں گھر کرتا ہے

ذکر[۲] کر بیٹھیں بُرائی ہی سے شاید میرا
اب وہ اغیار کی صحبت سے حذر کرتا ہے

[۵۴] سبزۂ خط کی مناسبت زہر سے ظاہر ہے کیونکہ زہر کھانے سے بدن سبز پڑ جاتا ہے۔ شعر کے معنی صاف ہیں [۵۵] نہ اُٹھی = نہ حاصل ہوئی۔ عرضِ نمکدانِ دگر = دوسرے نمکدان کی خواہش ظاہر کرنا۔ [۵۶] بخت بد سے یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ دوست کی عنایت بھی کہیں میرے لئے تمہیدِ مصیبت نہ ثابت ہو۔ کیونکہ میری قسمت کہاں اور سامانِ مسرت کہاں۔ [۵۷] چاکِ جگر یا زخمِ جگر کے کھل جانے کو خندۂ زخم سے تعبیر کرتے ہیں۔ شعر کا مطلب یہ ہے زخمِ جگر یوں تو پہلے بھی ہنستا تھا مگر آج نئی طرز سے ہنس رہا ہے یعنی اُسکے خندہ میں طنز کا پہلو ہے۔ اسکی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ شاید رقیبوں میں میرے قتل کا مشورہ ہوا ہے۔ ہاں اگر محبوب خود قتل کرتا تو خندہ مسرت کا محل تھا۔

[۱] غمّاز = چغل خور۔ اشک کو اسلئے غمّاز کہتے ہیں کہ رازِ محبت کو افشا کر دیتا ہے۔ آنکھوں میں گھر کرنا = عزت حاصل کرنا۔ میرے اشکِ غمّاز نے اُسکی آنکھوں میں گھر کیا کہ مجھے روتا دیکھکر وہ بھی رونے لگا۔ [۲] محبوب اغیار کی صحبت سے اسلئے پرہیز کرتا ہے کہ کہیں وہ میرا ذکر نہ کر بیٹھیں گو بُرائی ہی سے ہو۔ ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں۔

۱؎ نالۂ غیرتِ بلبل سے بھڑک اٹھے ہے آگ
گُل مری قبر پہ کیا کارِ شرر کرتا ہے

۲؎ سدِ راہ ایسی نہیں غیرتِ یادِ اغیار
کب خیال اپنا ترے دل میں گذر کرتا ہے

۳؎ میرے زرد آبلوں سے تختۂ صد برگ ہے دشت
ہے وہ اکسیر جنوں خاک کو زر کرتا ہے

۴؎ ہے تری جا تو ہر ایک کے دل میں کیونکر
دیکھیے حال مرا سب کو اثر کرتا ہے

۵؎ تیری غفلت سے یہ حالت ہے کہ اب دیکھ مجھے
ترک آئینہ گری آئنہ گر کرتا ہے

۶؎ کیا رلاتی ہے مجھے فکرِ خیالِ دشمن
وصل میں جب وہ ادھر سے نظر کرتا ہے

۷؎ اشکِ شادی نے دمِ وصل رلایا کہ مجھے
منعِ نظارہ مرا دیدۂ تر کرتا ہے

۸؎ محوِ وعدہ ہے کسی بُت کا تو مومن کہ نماز
پھیر کر قبلہ سے مُنہ جانبِ در کرتا ہے

۱؎ میری قبر پر پھول پڑے ہیں اُنکو دیکھکر بلبل غیرت (رشک) سے نالے کرتی ہے۔ جنکی وجہ سے آگ بھڑک اُٹھتی ہے۔ اس طور سے گُل میری قبر پر چنگاری کا کام دیتا ہے۔

۲؎ تیرے دل میں یادِ اغیار ہے جسکے رشک سے چاہئے تھا کہ میرا خیال تیرے دل میں نہ جائے۔ لیکن میں یہ ننگ گوارا کر لوں تو بھی امید نہیں کہ میرا خیال تیرے دل میں گذر کر سکے۔ یعنی یادِ اغیار کا رشک تو چنداں مانع نہیں۔ تو خود ہی میرا خیال نہیں کرتا۔

۳؎ صد برگ = گیندے کا پھول۔ میرے زرد آبلوں کی وجہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دشت میں گیندے کا تختہ کھلا ہوا ہے۔ جنوں دراصل اکسیر کا حکم رکھتا ہے کہ اُسکے فیض سے خاک (دشت) میں زر (زرد آبلہ) کی خاصیت پیدا ہو گئی۔ ۴؎ لوگوں پر میری حالت دیکھکر کیا اثر ہو جبکہ ہر ایک کے دل میں تیری جگہ ہے ایسی حالت میں سب تیرے ہی طرفدار ہو جائینگے۔ ۵؎ آئینہ گر میری تباہ حالت دیکھکر آئینہ گری ترک کرتا ہے کہ نہ آئینہ ہوگا۔ نہ معشوق محوِ آرایش ہوگا اور نہ اپنے حسن پر مغرور ہو کر عاشق سے غفلت کرے گا۔ ۶؎ یعنی مجھے بدگمانی یا فکر ہوتی ہے کہ دوست کہیں دشمن کے خیال میں نہ مبتلا رہا ہو۔ ۷؎ وصل کی خوشی میں جو آنسو نکلے اُنھوں نے مجھے یہ ستایا کہ رونے کی وجہ سے نظارۂ یار میں دشواری پیدا ہوئی۔ ۸؎ نماز کرنا نماز کردن کا ترجمہ ہے۔ اُردو میں رائج نہیں اُردو میں نماز پڑھنا کہتے ہیں

۱۸۸

فغاں کیا دم بھی لینا پارہ ہائے دل اُڑاتا ہے
کہوں کیا دردِ پنہاں کی کلیجہ مُنہ کو آتا ہے

[۱] سنا اُسنے مرا نالہ اثر بھی کچھ ہوا شاید
کہ دشمن کہہ گیا بیفائدہ کیوں غُل مچاتا ہے

[۲] پری لوٹے ہے انگاروں پہ دوزخ میں تپیں حوریں
تمھارا حُسن عالم سوز کس کس کو جلاتا ہے

[۳] گراں خوابی وہی ہے بختِ خوابیدہ کی اے ظالم
مرا شورِ فغاں کاہے کو سوتوں کو جگاتا ہے

[۴] گرائے اشک پُر تاثیر کیوں خلوت میں اے آنکھو
کوئی یوں خاک میں ایسے گُہر کو بھی ملاتا ہے

[۵] کبھی کی پھر گئیں آنکھیں فرشتے بھی نظر آئے
تمھارا مُنہ چھپانا دیکھئے کیا کیا دکھاتا ہے

[۶] نہیں ایسا ہوں کہ دونگا تجھکو طعنہ بیوفائی کا
بگڑنا گر نہیں دشمن سے کیوں باتیں بناتا ہے

[۷] نہ کرنی تھی نصیحت اسکے بیٹھے پر قیامت کی
عجب فتنہ ہے ناصح بھی کہ یہ فتنے اٹھاتا ہے

[۸] خیالِ خوابِ راحت ہے، علاج اس بدگمانی کا
وہ کافر گور میں **مومن** مرا شانہ ہلاتا ہے

---

۱ میرا نالہ سنکر دوست بددماغ ہوا - چنانچہ دشمن اُسکا ترجمان بنکر مجھ سے کہہ گیا - کہ بے فائدہ کیوں غُل مچاتا ہے - شاعر کے نزدیک نالے کے "اثر" کی ایک صورت یہ بھی ہے - یعنی کچھ اثر تو ہوا - گو مفید مطلب نہ سہی -
۲ پری لوٹے ہے . . . . یعنی آتش رشک سے - پری (آتشی نژاد) کی مناسبت انگاروں سے اور حوروں کی دوزخ سے ظاہر ہے - ۳ محبوب نے شکایت کی کہ تمھارا شور فغاں سوتوں کو جگاتا ہے - عاشق جواب دیتا ہے کہ اگر یہ الزام درست ہوتا تو میرا سویا ہوا نصیب ایسی گہری نیند کیوں سوتا - یعنی وہ بھی میرے شور فغاں سے جاگ اُٹھتا - ۴ خلوت (تنہائی) کے بجائے معشوق کے حضور میں اشک گرتے تو تاثیر بھی ہوتی - ۵ نزع کے وقت محتضر کو فرشتے نظر آیا کرتے ہیں - ۶ محبوب عاشق سے کہتا ہے کہ اگر میں نے تمھارے حسب منشا، رقیب سے بگاڑ کر لیا تو کل کو تم (عاشق) ہی مجھ (معشوق) کو طعنہ دوگے کہ انھوں نے رقیب سے بیوفائی کی - عاشق جواب دیتا ہے کہ اطمینان رکھو میں ہرگز اسکا طعنہ نہ دونگا - تم خواہ مخواہ باتیں بناتے ہو اور فرضی بہانے نکالتے ہو دراصل تمھیں اُس سے بگاڑ کرنا ہی منظور نہیں - شعر میں ترتیب سے کام لیا ہے - ۷ مراد یہ ہے کہ محبوب اُسکے نصیحت سے برہم ہو کر اُٹھ گیا -
۸ میں مرگیا ہوں مگر وہ کافر یہ سمجھکر کہ یہ (عاشق) خواب راحت میں مصروف ہے - گور میں مرا شانہ ہلاتا ہے - آخر اس بدگمانی کا کیا علاج؟ حضرات شیعہ کے یہاں رسم ہے کہ تلقین کے وقت میت کا شانہ ہلاتے ہیں - مومن کا محبوب بھی اہل تشیع سے ہے اسلئے اس طرف اشارہ کیا -

۱۸۹

کیوں بنی خونتا بہ نوشی بادہ خواری آپ کی — کس لئے ہے بیخودی غفلت شعاری آپ کی

کیوں رم جانانہ کے بدلے ہے از خود رفتگی — کس لئے شوخی ہوئی ہے بے قراری آپ کی

منفعل سازِ دمِ ناہید نغمے کیا ہوئے — کیوں گذرتی ہے فلک سے آہ وزاری آپ کی

آشنا سے ہوگئے بیگانگی جاتی رہی — ہوگئی کس آشتی دشمن سے یاری آپ کی

بوئے گل سے ہو ملول کس کی بو آئی ہے یاد — خاک اُڑانے کیوں لگی بادِ بہاری آپ کی

عشق مہ رو میں تڑپتے ہو نہیں تو کس لئے — جوں کتاں ہر شب قبا ٹکڑے ہے ساری آپ کی

مجھکو حیراں دیکھکر حیران رہجاتے ہو کیوں — ایسی محوِ یاس ہے اُمیدواری آپ کی

جی جلا جاتا ہے کیوں ہر لحظہ کس پر دل گیا — لے گئی قابو سے جاں بے اختیاری آپ کی

کیوں ہے رنگِ زرد پر گلگونہ اشکِ سُرخ کا — کس لئے ملنے لگی رنگت ہماری آپ کی

ہائے کیا بیتاب ہوکر دھر لیا سینہ پہ ہاتھ — کھل گئی مہوش کہے سے دلفگاری آپ کی

۵۱ یہ پوری غزل بطور قطعہ بند ہے - اس میں شاعر نے معشوق کے کسی پر عاشق ہونیکا بیان لکھا ہے - اس قبیل کے واقعات اکثر ہوسناک شعرا کو پیش آئے ہیں - شعر کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی بادہ خواری خونتابہ نوشی (خونِ دل پینے) سے کیوں مبدّل ہوگئی اور تغافل کے عوض بیخودی کی خو کیوں ہوگئی -

۵۲ منفعل سازِ دم ناہید = ناہید کے زمزمے کو خجل کرنے والے - ناہید ستارہ زہرہ کو کہتے ہیں جس کا لقب مطربہ فلک ہے -

۵۳ آشتی دشمن = صلح و وفا کا دشمن - اضافت مقلوب ہے -

۵۴ کسی کی خاک اُڑانا = سبک کرنا - رسوا کرنا - بادِ بہاری کو خاک اڑانے والی قرار دیا کیونکہ وہ بوئے گل لائی جو محبوب کی کدورتِ خاطر کا باعث ہوئی -

۵۵ مشہور ہے کہ نورِ ماہ میں کتاں ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتی ہے - ۵۶ میں تمہاری تاثیرِ جمال سے حیران ہوں اور لُطف یہ ہے کہ تم میرے اندازِ تحیّر کو دیکھکر حیران رہجاتے ہو اور اتنا نہیں سمجھتے کہ یہ تمہارے ہی عشوہائے حُسن کا کرشمہ ہے - یعنی تمہاری اُمیدوں کے مطلع پر یاس کی گھٹا اس قدر چھائی ہے کہ اب تم کو اپنے حُسن کی دلاویزیوں کا بھی احساس نہ رہا - ۵۷ گلگونہ = غازہ - سُرخ پوڈر - ۵۸ میں نے تم کو مہوش کہا اور تم نے سُنکر سینہ پر ہاتھ رکھ لیا - جس سے شاید تمہارا مقصد یہ تھا کہ پیشتر میں مہوش ضرور تھا - اب تو دلفگار ہوں مہوش اور دلفگار میں مناسبت ہے کیونکہ ماہ کا دل داغوں سے فگار (زخمی) ہوتا ہے -

شرمہ[۹] دینے لگتے ہو جس وقت رونا آئے ہے
بارے ہے ابتک تو باقی شرمساری آپ کی

دل[۱۰] گیا دم پر بنی آنکھیں لڑیں کہتی ہے حال
بیقراری آہ و زاری اشکباری آپ کی

قطرہ ہائے اشک گنتے ہو اگر روتا ہوں میں
اس قدر خو ہو گئی اختر شماری آپ کی

کس[۱۱] صنم کی بندگی میں بُت پرستی چھوڑ دی
ہو گئی مومن کی سی کیوں دینداری آپ کی

صبر[۱۲] وحشت اثر نہ ہو جائے
کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے

رشک[۱۳] پیغام ہے عناں کش دل
نامہ بر راہبر نہ ہو جائے

دیکھو مت دیکھیو کہ آئینہ
غش تمھیں دیکھ کر نہ ہو جائے

ہجر[۱۴] پردہ نشیں میں مرتے ہیں
زندگی پردہ در نہ ہو جائے

[۹] عاشق ہو کر بھی تم میں اس قدر احساس شرم باقی ہے کہ جب رونا آتا ہے تو آنکھوں میں سُرمہ لگانے لگتے ہو۔ تاکہ لوگ اشکوں کو غم عشق کے بجائے سرمہ کے اثر پر محمول کریں۔

[۱۰] دونوں مصرعوں میں لف و نشر مرتب ہے۔ [۱۱] معشوق اعتقاداً بُت پرست تھا مگر کسی صنم (محبوب) کی بندگی میں مذہب بُت پرستی چھوڑ بیٹھا۔ اس حساب سے جس طرح مومن اپنی دینداری میں خام ہے معشوق اپنے مذہب (بُت پرستی) میں غیر استوار ہے۔ یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ اُسکی دینداری مومن کی سی ہے کیونکہ دونوں (معشوق اور مومن) بُت پرستی سے کنارہ کش ہیں۔

[۱۲] قاعدہ ہے کہ اگر انسان کسی چیز کا خوگر ہو جاتا ہے تو پھر اُس چیز کی دلآویزی زائل ہو جاتی ہے۔ میں جنونِ عشق میں گھر سے گھبرا کر صحرا میں آیا تھا۔ کہیں صحرا بھی میرے حق میں گھر نہ بن جائے۔ یعنی صحرا پر قناعت (صبر) کر کے بیٹھ رہا ہوں مگر ڈرتا ہوں کہ یہ قناعت وحشت کا اثر پیدا نہ کرے اور گھر کی طرح یہاں سے بھی دل اُچاٹ نہ ہو۔

[۱۳] میں نے نامہ بر کو دوست کے پاس بھیج تو دیا ہے مگر یہ رشک کہ "یہ پہونچا میں رہا جاتا ہوں" دل کو کھینچ رہا ہے۔ کہیں میں بھی اُسکے عقب میں دیارِ محبوب کو نہ چل کھڑا ہوں۔ اُس صورت میں اُسکی حیثیت ایک راہبر کی ہوگی وہ آگے آگے ہوگا میں پیچھے پیچھے۔ [۱۴] ہم اس خیال سے مرتے ہیں کہ اگر زندہ رہے تو رازِ عشق کی پردہ دری ہوگی۔

کثرتِ[۴] سجدہ سے وہ نقشِ قدم	۵	کہیں پامالِ سر نہ ہو جائے
میرے[۵] تغیّرِ رنگ کو مت دیکھ	۶	تجھکو اپنی نظر نہ ہو جائے
مرے آنسو نہ پونچھنا دیکھو	۷	کہیں دامان تر نہ ہو جائے
بات[۶] ناصح سے کرتے ڈرتا ہوں	۸	کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے
اٹھّے[۷] قیامت نہ آئیو جب تک	۹	وہ مری گور پر نہ ہو جائے
مانعِ[۸] ظلم ہے تغافلِ یار	۱۰	بختِ بد کو خبر نہ ہو جائے
غیر[۹] سے بے حجاب ملتے ہو	۱۱	شبِ عاشق سحر نہ ہو جائے
رشکِ دشمن کا فائدہ معلوم	۱۲	مُفت جی کا ضرر نہ ہو جائے
اے دل آہستہ آہ تابِ[۱۰] شکن	۱۳	دیکھ ٹکڑے جگر نہ ہو جائے

۱۴ موٗمن ایماں قبول دل سے مجھے
وہ بُت آزردہ گر نہ ہو جائے

۴ے راہ میں محبوب کا نقش قدم دیکھکر عشاق سجدے کرتے ہیں۔ شاعر کو خوف ہے کہ مبادا سجدوں کی کثرت سے اُسکا نشانِ پا بگڑ جائے مضمون شعر بہت لطیف ہے۔ پامالِ سر کی ندرتِ ترکیب ملاحظہ ہو۔ ۵ے چونکہ میرے رنگِ رُخ کا متغیر ہونا تیرے حسن کا کرشمہ ہے اسلئے مبادا میری حالت کو دیکھکر تجھے اپنے دلاویزی حُسن کا احساس ہو۔ جسکے اثر سے تجھے خود اپنی نظر لگ جائے ۶ے ناصح کی بات سے اثر ہوتی ہے۔ مبادا اُس سے ہم کلام ہو کر مجھپر بھی اُسکی نحوست اثر کرجائے۔ ۷ے یعنی میں خرامِ یار ہی سے زندہ ہو جاؤنگا۔ قیامت کی مجھے احتیاج نہیں۔ ۸ے تغافل = غافل بننا۔ بے پروائی جس میں نہ کرم ہو نہ ستم۔ مراد یہ ہے کہ جب تک محبوب مجھ سے غفلت شعاری برتتا ہے اُسکے ظلم سے امن رہتا ہے۔ اگر بخت بد کو خبر ہوگئی تو اس سے بھی محروم ہو جاؤنگا۔ یعنی محبوب تغافل چھوڑکر ظلم کرنے لگے گا۔ ۹ے یعنی مبادا صدمۂ رشک سے عاشق کی زندگی کی آ[خری] سحر ہو جائے۔ لیکن موٗمن کے رنگ سے زیادہ قریب جو معنی خیال میں آتے ہیں یہ ہیں کہ کہیں تمھارے جلوۂ بے حجاب کی روشنی سے عاشق کی شبِ تاریک بہمرنگ سحر نہ ہو جائے۔ یہ کرشمہ اداء موٗمن کا خاص انداز ہے۔ ۱۰ے تاب شکن = طاقت شکن۔

۱۹۱

جہاں سے شکل کو تیری ترس ترس گذرے — جو تجھ پہ بس نہ چلا اپنے جی سے بس گذرے

بنی ہے صور سرافیل[۱] آہ بے تاثیر — کہ میرے دم پہ قیامت نفس نفس گذرے

نہ جاؤں کیونکہ سوئے دام آشیاں سے جب[۲] — خیال حسرتِ مُرغانِ ہم قفس گذرے

ہو اور کو تو ہدایت جو خود ہوں آوارہ[۳] — یہ عمر کاش کے جوں نالۂ جرس گذرے

وفا سے غیرتِ[۴] شکرِ جفا نے کام کیا — کہ اب ہوس سے بھی اعدائے بوالہوس گذرے

یہ نیمجان[۵] و غمِ ہجر ہے وہی انصاف — جو تیرے دھیان میں اسے مرگ دادرس گذرے

دکھاؤں ناقۂ لیلیٰ خرام ناز تجھے — کبھی ادھر سے جو اُس شوخ کا فرس گذرے

نہ چھوسکے[۷] کیوں تنِ کاہیدہ کے پسینہ ہائے — طرف سے غیر کی جب نذر عطر خس گذرے

کہاں وہ ربط بتاں اب کہ اُسکو تو مومن[۸]
ہزار سال ہوئے سیکڑوں برس گذرے

سلہ حضرت اسرافیل ع کے صور پھونکتے ہی دنیا میں قیامت برپا ہو جائیگی۔ اسی بنا پر شاعر نے اپنی آہ بے تاثیر کو صور سرافیل سے تشبیہ دی ہے۔ سلہ مجھے مُرغانِ ہم قفس کی حسرت کا خیال ہے۔ اسلئے آشیاں سے پھر دام کی طرف جاتا ہوں تاکہ گرفتار ہوکر محبوس قفس ہو جاؤں اور اپنے رفیقوں کا شریک درد بنوں۔ ہم قفس کا لفظ بتا رہا ہے کہ کہنے والا بھی پہلے اسیر قفس تھا۔ اب رہا ہو چکا ہے۔ سلہ نالۂ جرس خود آوارہ ہے کیونکہ منتشر ہے اور کوئی مقصد نہیں رکھتا تاہم دوسروں کی رہنمائی کرتا ہے۔ کاش میرا حال نالۂ جرس ہی کا سا ہو۔ سلہ میں نے معشوق کی بیداد پر شکر کیا۔ میرے اس طرز عمل پر اعدائے بوالہوس (رقیبوں) کو غیرت آئی۔ جس سے اُن میں جذبۂ وفا پیدا ہوا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ اُنھوں نے ہوس ترک کردی۔ یعنی عشق صادق کی صلاحیت تو اُن میں کہاں تھی خیر وفا سے اتنا ہوا کہ ہوس چھوڑ بیٹھے۔ وفا اور ہوس میں تضاد ہے۔ سلہ مجھ سا نیم جاں غم ہجر اُٹھانے کے قابل نہ تھا۔ چاہئے تھا کہ اس صدمے سے مر جاتا۔ مگر اسے "مرگ وادرس" جو تیری مرضی۔ سلہ تنِ کاہیدہ کی مناسبت خس سے اور پسینے کی عطر سے ظاہر ہے۔ سلہ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ مومن کو ربط بتاں چھوڑے ہوئے (کعبہ سے اصنام کو نکالے ہوئے) ایک ہزار کئی سو برس گذر گئے۔ اسلئے کہ شعر کا زمانہ تصنیف ۱۲۰۰ ہجری کے بعد ہے۔

۱۹۲

نہ انتظار میں یاں آنکھ ایک آن لگی
نہ ہائے ہائے میں تالو سے شب زبان لگی

جلا جگر تپِ غم سے پھڑکنے جان لگی
الٰہی خیر کہ اب آگ پاس آن لگی

گلی میں اُس کی نہ پھر آتے ہم تو کیا کرتے
طبیعت اپنی نہ جنّت کے درمیان لگی

جفائے غیر کا شکوہ تھا تیرا اچھا کیا ذکر
عبث یہ بات بُری تجھکو بدگمان لگی

ہنسو نہ تم تو مرے حال پر میں ہوں وہ ذلیل
کہ جس کی ذلت و خواری سے تم کو شان لگی

کہاں[۱] وہ آہ و فغاں دم بھی لے نہیں سکتے
ہمیں یہ تیری دعائے بد آسمان لگی

میں[۲] اور اُس کو بلاؤں گا روزِ وصل میں تو
اجل بھی کرنے محبت کا امتحان لگی

سدا تمھاری طرف جی لگا ہی رہتا ہے
تمھارے واسطے ہے دل کو مہرباں[۳] لگی

ق

وہ کینہ[۴] ورز تھا مومن تو دل لگایا کیوں
کہو تو کیا تمھیں ایسی بھلی وہ آن لگی

برنگ صورتِ بُلبل نہیں نوا سنجی
یہ کیا ہوا کہ چپ اے گُلستاں بیان لگی

۱؎ یعنی بیشتر جب ہم آہ و فغاں کرتے تھے تو آسمان خوف سے کانپ اُٹھتا تھا۔ آخر اُس نے بد دعا کی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ فریاد تو درکنار۔ سانس لینے کی طاقت بھی ہم میں باقی نہ رہی۔

۲؎ عاشق ہجر میں موت کو بڑے اشتیاق سے بُلایا کرتا تھا۔ سو د اتفاق دیکھئے کہ اجل اُس کو اپنا عاشق جانکر وصل یار کے دن آموجود ہوئی۔ عاشق کہتا ہے۔ کہ لو اجل بھی مجھے اپنا مشتاق سمجھ کر میری محبت کا امتحان کرنے کے لئے آگئی۔ میں نے اس (اجل) کو بلایا ضرور تھا۔ مگر روز وصل میں بھلا کیوں بُلانے لگا تھا۔ مرزا غالب کے یہاں بھی یہی مضمون ہے۔ خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے + آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے۔

۳؎ دل کو لگی ہے یعنی دل متوجہ ہے۔ ۴؎ یہ اور شعر مابعد قطعہ بند ہیں۔ کینہ ورز = دشمنی اختیار کرنے والا۔ آن = ادا گُلستان بیان = رنگین بیان آخر شعر کا مطلب یہ ہے کہ اے رنگین بیان (مومن) عاشق ہوکر تیرا کیا حال ہوا کہ چُپ سی لگ گئی اور تو نے بُلبل تصویر کی طرح خاموشی اختیار کر لی۔

کیا مرے قتل پہ ہامی[1] کوئی جلاد بھرے — آہ جب دیکھ کے تجھ سا ستم ایجاد بھرے

خون[2] دل پیتے ہیں خوکردۂ محنت اے کاش — ساغرِ دہر میں ساقی مئے بیداد بھرے

کہیں ہو جائے وصال[3] آہ بلا سے چھوٹوں — ہجر کا دکھ کوئی کب تک دلِ ناشاد بھرے

تیشہ[4] کچھ دشنۂ شیرویہ نہیں اے غیرت — اپنے ہی خوں سے مگر دامنِ فرہاد بھرے

ہوں[5] میں وہ صید جگر خون اسیریٔ مشتاق — جو پسِ ذبح بھی ہر دم دمِ صیاد بھرے

پھر[6] تو سرگوشیٔ دشمن میں بھی تاثیر نہ ہو — گر نہ کان اسکے فغانِ گلہ ارشاد بھرے

چارہ[7] گر اسکی خطا کیا مرے تن میں نہ رہا — خون اتنا کہ سرِ نشترِ فصّاد بھرے

[1] ہامی بھرنا = اقرار کرنا - قبول کرنا - آمادہ ہونا - [2] ہم لوگ جو عشق میں رنج والم (محنت) کے خوگر ہو چکے ہیں جفائے یار کو ترستے ہیں اور ناچار خون دل پیکر رہجاتے ہیں - کاش ساقیِ روزگار دہر کے ساغر میں بیداد کی شراب بھردے کہ ہمارا حوصلۂ جفا پسندی پورا ہو - [3] وصال یہاں بمعنی موت ہے - وصال و ہجر میں ایہام تضاد ہے

[4] شیرویہ خسرو پرویز کے بیٹے کا نام ہے جس نے اپنے باپ کو خنجر سے ہلاک کرکے تخت ایران پر قبضہ کرلیا تھا - شاعر غیرت سے مخاطب ہوکر کہتا ہے کہ تیشۂ فرہاد کچھ شیرویہ کا دشنہ (خنجر) تو تھا نہیں کہ خسرو کو ہلاک کردیتا - ہاں فرہاد کو ہلاک کردینا اسکے اختیار میں تھا سو وہ کرگزرا - یعنی تقاضائے غیرت تو یہ تھا کہ فرہاد اپنے رقیب (خسرو) کا خاتمہ کردیتا - لیکن یہ اسکے بس میں نہ تھا - ناچار اپنا ہی خون کیا -

[5] جگر خون = وہ جس کا کلیجہ خون ہوگیا ہو اسیری مشتاق میں اضافت مقلوب ہے - یعنی مشتاقِ قید -

[6] فغانِ گلہ ارشاد = وہ فغاں جو شکایت کی طرف رہنمائی کرے یا جسے سنکر سامع متاثر ہونے کے بجائے الٹا شاکی ہو - اگر میری فغاں معشوق کو میرے خلاف نہ ابھار دیتی تو وہ دشمن کی سرگوشی پر بھی کان نہ دھرتا - یہاں معشوق کے ناشنوا ہونے پر زور دیا ہے - [7] چارہ گر نے عاشق دیوانہ کے لئے فصد کا علاج تجویز کیا چنانچہ فصاد نے آکر فصد لی مگر خون نہیں نکلا - اسپر شاعر فصّاد کی بے قصوری ثابت کرتا ہے -

دمبدم[۸] رنگ ہے تغیّر مرا حیراں ہے ‏— رنگ کیسا مری تصویر میں بہزاد بھرے

مومن[۹] اس شعلہ زبانی کی کہاں قدر مگر
مُنہ دُرِ آبلہ سے گرمیِ فریاد بھرے

۱۹۴

کرتا ہے قتل عام وہ اغیار کے لئے ‏— دس بیس[۲] روز مرتے ہیں دو چار کے لئے

دیکھا[۱] عذاب رنجِ دلِ زار کے لئے ‏— عاشق ہوئے ہیں وہ مرے آزار کے لئے

دل عشق[۲] تیری نذر کیا جان کیونکہ[۳] دوں ‏— رکھا ہے اُس کو حسرتِ دیدار کے لئے

قتل اُس نے جرم صبر جفا پر کیا مجھے ‏— یہ ہی سزا تھی ایسے گنہگار کے لئے

لے[۴] تو ہی بھیجدے کوئی پیغام تلخ اب ‏— تجویز زہر ہے ترے بیمار کے لئے

آتا نہیں ہے تو تو نشانی ہی بھیجدے ‏— تسکین اضطراب دلِ زار کے لئے

کیا دل دیا تھا اسلئے مَیں نے تمھیں کہ تم ‏— ہوجاؤ یوں عدو مرے اغیار کے لئے

چلنا تو دیکھنا کہ قیامت نے بھی قدم ‏— طرزِ خرام و شوخیِ رفتار کے لئے

جی میں ہے موتیوں کی لڑی اُسکو بھیجدوں ‏— اظہار حالِ چشم گہربار کے لئے

---

۸ بہزاد (مصوّر) حیران ہے کہ میرے تصویر میں کیا رنگ بھرے کیونکہ عشق کی بدولت ہر لحظہ میرے چہرے کا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ ۹ ایشیائی سلطنتوں میں بادشاہوں نے اکثر اہل کمال کے مُنہ موتیوں سے بھردیئے ہیں مومن کہتا ہے کہ میری شعلہ زبانی کی قدر کون کرے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ جب ناقدریٔ زمانہ پر فریاد کروں تو اسکی گرمی کے اثر سے میرا مُنہ آبلوں کے موتیوں سے بھر جائے۔ ورنہ اس دور میں قدردانی معلوم۔ شعلہ زبانی۔ آبلہ۔ گرمی میں ایہام تناسب ہے دُرِ آبلہ میں اضافت تشبیہی ہے۔

۱ وہ میرے ستانے کے لئے کسی دوسرے پر عاشق ہوئے ہیں۔ تاکہ مجھ سے بے اتفاقی اور دوسرے سے گرویدگی کا بہانہ ہاتھ آئے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ وہ صرف میرے دل زار کو رنج دینے کی غرض سے خود عذاب عشق میں مبتلا ہیں۔

۲ شعر میں عشق مخاطب ہے۔ ۳ کیونکہ بمعنی کیونکر۔ ۴ یعنی پیغام تلخ ہی زہر کا کام دے۔ زہر بھی تلخ ہوتا ہے۔

دیتا ہوں اپنے لب کو بھی گلبرگ سے مثال | بوسے جو خواب میں ترے رخسار کے لئے
جیتا[۴۸] اُمید وصل پہ ہجراں میں سہل تھا | مرتا ہوں زندگانیِ دشوار کے لئے

موٗمن[۴۹] کو تو نہ لائے کہیں دام میں وہ بُت
ڈھونڈھے ہے تار سبحہ کے زنار کے لئے

۱۹۲

کہاں تک دم بخود رہیے نہ ہوں کیجے نہ ہاں کیجے | کہاں تک کھائیے غم کب تلک ضبطِ فغاں کیجے
سوائے نقطۂ[۵۰] موہوم کیا وصفِ دہاں کیجے | بنا کر بات کیا کہئے جو کچھ ہو تو بیاں کیجے
موا[۵۱] گُل دیکھتے ہی یادِ رُخ میں یار کہتے تھے | ذرا بہلائیے جی چلئے سیرِ گلستاں کیجے

ق

عدو[۵۲] کے وہم سے تکتا ہوں بزمِ عیش میں منہ کو | نہیں ہے اور کچھ یوں آپ جو چاہیں گماں کیجے
غرض ہمسائے میں بھی اُس کا رہنا کیا قیامت ہے | کہ سُن لیتا ہے وہ گھر میں جو کچھ مذکور یاں کیجے
کہیں تو کیا کہیں اور بن کہے کیونکر دوا ہووے | بڑی مشکل پڑی کیا چارۂ دردِ نہاں کیجے
وہی ہجراں ہے غم کھانے پہ کب تک زندگانی ہو | بس اب مر جائیے کچھ کھا کے عیشِ جاوداں کیجے
رکھے سے ہاتھ سینے پر بھلا کب مانتا ہے دل | نہ جب تک روئیے دو چار آہِ خوں چکاں کیجے

---

۴۸ زندگانیٔ دشوار سے مراد وہ زندگی ہے جس میں اُمید وصل بھی نہ ہو۔ یعنی اگر ہجر میں اُمید وصل ہوتی تو زندگی بآسانی بسر ہو جاتی۔ مگر اب رشتۂ امید بھی منقطع ہو گیا مجبوراً اس زندگانی دشوار کے ہاتھوں جان دے رہا ہوں۔

۴۹ سبحہ = تسبیح۔ زنّار = جنیو۔ وہ بُت اپنے زنار کے لئے تسبیح کے تار تلاش کر رہا ہے۔ کہیں اس چال سے مومن کو پھانسنا مقصود نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ مومن تارِ تسبیح کو دیکھکر اُسکی طرف مائل ہو جائیگا۔

۵۰ دہن کو شعراً نقطۂ موہوم سے تشبیہ دیتے ہیں کہ دونوں کا وجود محض اعتباری مانا جاتا ہے۔ نقطہ کی تعریف ریاضی میں یہ کی گئی ہے کہ وہ مقدار جو تقسیم قبول نہ کرے۔ منتہائے خط۔

۵۱ مُوا کا فاعل خود عاشق ہے جو محذوف ہے "یار کہتے تھے" کا تعلق دوسرے مصرع سے ہے۔

۵۲ یہ اور شعر مابعد قطعہ بند ہیں۔ دوسرے شعر میں ضمیر کا مرجع عدو ہے۔ تقریباً اسی مضمون کا غالب کا شعر ہے:۔

میں مضطرب ہوں وصل میں بیمِ رقیب سے | ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

عدو[۱] اس اوج پر شاکی ہے شاید غصہ آجاوے
ملا دے خاک میں یہ تو بھی شکرِ آسماں کیجے

کچھ آخر حد بھی ہے جور و جفا و ظلم کی کب تک
تحمّل در گذر ہر لحظہ ہر دم ہر زماں کیجے

گلا ہم کاٹ لیں گے آپ تیغِ رشک[۲] سے اپنا
عدو کو قتل کیجے پھر ہمارا امتحاں کیجے

عذابِ ایزدی جانکاہ ہے مانا بس اب مومن
خدا کے واسطے ذکرِ ستم ہائے بتاں کیجے

۱۹۸

اجل سے خوش ہوں کسی طرح ہو وصال[۱] تو ہے
نہ آئے نعش پہ وہ پر یہ احتمال تو ہے

حنا[۲] کے رشک سے کیونکر نہ آئے جوش میں خوں
کسی سبب سے ہو پر وہ بھی پائمال تو ہے

ذرا[۳] ٹھہر اے دلِ مضطر کہ فکرِ وصل کروں
شبِ قلق نہ سہی خواب بھی خیال تو ہے

زمیں[۴] سے لگ گئیں آنکھیں تمھاری طرح نہیں
شریکِ قتل ہو گردوں کو انفعال تو ہے

[۱] اگر آسمان مجھے خاک میں بھی ملا دے تو بھی مجھے چاہئے کہ اُسکے ظلم پر شکر کرتا رہوں - نتیجہ یہ ہوگا کہ اُس (آسمان) کی عادت بگڑ جائے گی اور وہ اُس شکر کو اپنا حق سمجھنے لگے گا - ادھر رقیب کا یہ حال ہے کہ اس اوج کے باوجود آسمان کی شکایت کرتا رہتا ہے - بالآخر کسی دن آسمان شکایت پر بگڑ کر اُسکو نیچا دکھائے گا مطلب یہ ہے کہ آسمان تو مجھ ستم زدہ کی شکر گذاری کا خوگر ہوگا - رقیب کی شکوہ سنجی (اوج کے باوجود) اُس کو برہم کر دے گی - یہ شعر مکرِ شاعرانہ کی بہت لطیف مثال ہے -

[۲] رشک سے یہ مراد ہے کہ ہمیں یہ بھی گوارا نہیں کہ تم ہمیں چھوڑ کر عدو کو ہلاک کرو - نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت - مگر اصل میں مکرِ شاعرانہ ہے جیسا کہ دوسرے مصرع سے ظاہر ہے -

[۱] اجل سے "وصال" تو حاصل ہوگا - گو برا سے نام ہی سہی - وصال کے لفظ سے خاص فائدہ لیا ہے - [۲] مجھے حنا پر رشک آتا ہے کہ وہ بھی میری طرح پائمال ہے - گو اُسکا پائمال ہونا عاشقی کا نتیجہ نہیں - مطلب یہ کہ "شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری" - حنا کو پائمال اسلئے کہا ہے کہ اُس نگارِ رعنا نے پاؤں سے ملی ہے - [۳] شبِ قلق (شبِ ہجر) میں خواب نہ سہی (کہ معشوق کا جمال سوتے میں نظر آتا) خیال تو ہے (کہ تصور میں ملاقات کا لطف میسّر ہو) مگر شرط یہ ہے کہ دلِ مضطر ذرا ٹھہرے ورنہ خیال کی یکسوئی معلوم - [۴] مجھے اصل میں تم نے قتل کیا ہے مگر اللہ رے بے حیائی کہ نام کو نادم نہیں - گردوں کو دیکھو کہ شریکِ قتل ہو کر اُس کو اپنے فعل پر ندامت تو ہے جسکے باعث اُسکی آنکھیں زمین میں گڑ گئی ہیں آسمان کے خم ہونے کی خوب توجیہ کی ہے حسنِ تعلیل ہے -

کہاں تلک گلہ ہائے تغافلِ قاتل — ہم آپ کاٹ لیں آخر یہ سر وبال تو ہے

جفائے یار کو سونپا معاملہ اپنا — اب آ گئے ہو نہ ہو امیدِ انفصال تو ہے

وہ[8] اضطراب کہاں ضعف سے مگر اب بھی — ہو آؤں حضرتِ عیسیٰ تک اتنا حال تو ہے

شبِ[9] فراق میں بھی زندگی پہ مرتا ہوں — کہ گو خوشی نہیں ملنے کی پر ملال تو ہے

عبث ترقیِ فن کی ہوس ہے مومن کو

زیادہ ہوئے گا کیا اس سے بے مثال تو ہے

۱۹۶

تسلی[10] دمِ واپسیں ہو چکی — ہمیں ہو چکے جب نہیں ہو چکی

قلق[11] کشتۂ سخت جانی ہے پھر — امیدِ اجل آفریں ہو چکی

بلا اس سیہ روز کو بزم میں — شبِ عیش اے مہ جبیں ہو چکی

یہاں[12] دم نہیں شوق سے قتل کر — مرے خوں سے تر آستیں ہو چکی

[8] ضعف کے باعث اگلی سی بے قراری تو باقی نہیں۔ البتہ اتنی تڑپ اب بھی ہے کہ چرخِ چہارم کو چھو آتا ہوں۔ حضرت عیسیٰ (جو چرخ چہارم پر ہیں) کی تخصیص اسلئے ہے کہ مریضوں کو شفا دینے کا معجزہ اُن کو عطا ہوا تھا۔ [9] میں شبِ فراق میں بھی زندگی کو عزیز رکھتا ہوں اسلئے کہ گو معشوق سے ملنے کی خوشی حاصل نہیں۔ نہ ملنے کا ملال تو ہے۔ یعنی اُس سے یک گونہ نسبت تو حاصل ہے۔ گو اُسکی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

[10] جب تمھاری نہیں (انکار) ختم ہوئی ہم مرنے کے قریب ہوگئے۔ ایسی حالت میں تسلی بیسود۔ پہلے مصرع میں تسلی ہو چکی سے مراد یہ ہے کہ تسلی نہیں ہوسکتی۔

[11] اُمیدِ اجل آفریں = موت کو پیدا کرنے والی امید قلق سے اُمید بندھ چلی تھی کہ شاید اسکے اثر سے مجھے موت آجائے۔ مگر وائے محرومی کہ وہ قلق بھی سخت جانی کے ہاتھوں مٹ گیا۔ اب یہ توقع بھی نہ رہی کہ مرکر غمِ عشق سے نجات ملے گی۔ [12] دیکھو صفحہ ۲۲۸۔

مری تعزیت میں نہ لا غیر کو — کہاں تک ستم پیشہ کیں ہو چکی
کہو مرگ سے ہاں نوازش کرے — کہ اُس سے زیادہ نہیں ہو چکی
وہ ہمدوش ہوگا بھی تو غیر سے — مری قسمت اے شانہ بیں ہو چکی
اب اغیار سے ہاتھا پائی ہے کیوں — نزاکت بس اے نازنیں ہو چکی
خیالِ اجل سے تسلّی کروں — یہ طاقت بھی جانِ حزیں ہو چکی
ثوابت ہیں سیّار مثلِ شرر — مری آہ کُرسی نشیں ہو چکی
جنوں میں بھلا کوئی کیا خاک اڑائے — کہ اک جوش ہی میں زمیں ہو چکی

کمیں میں ہے مومن وہ کافر صنم
بس اب پاسبانِ دیں ہو چکی

۱۹۷

در بدر ناصیہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے — وہی ہوتا ہے جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے
اک نظر دیکھنے سے سر تن سے جدا ہوتا ہے — بے جگہ آنکھ لڑی دیکھئے کیا ہوتا ہے

۶ تم مجھے شوق سے قتل کرو اور اندیشۂ رسوائی سے مطمئن رہو۔ کیونکہ میں اس قدر ناتواں ہوں کہ میرے خون سے تمھارے آستین کا تر ہونا محال ہے۔ وہ ۔ کے لفظ میں ایہام ہے۔ ۷ موت کو میں نے بلایا مگر اس کا انکار معشوق کے انکار سے بھی بڑھ گیا۔ کوئی اُس سے کہدے کہ اب تو کرم کرے۔
۸ شانہ بیں = فال بتانے والا۔ اے شانہ بیں میری ایسی قسمت کہاں کہ وہ (معشوق) مجھ سے ہمدوش ہو۔ اگر ہوا کبھی تو غیر سے ہوگا۔ ۹ یعنی تمھاری نزاکت کے دعوے زبانی ہی تھے۔ ۱۰ ثوابت = وہ ستارے جو اپنی جگہ پر قائم ہیں ضد سیار۔ کرسی نشیں = مقصود تک پہونچنے والی۔ قائم الزام معلوم ہوتا ہے کہ میری آہ منزلِ مقصود تک پہونچ گئی جبکے اثر سے ثوابت چنگاریوں کی طرح اڑتے پھرتے ہیں۔ ثوابت سیار اور کرسی میں رعایت ہے۔

شوق[1] کم ملنے سے اندوہ فزا ہوتا ہے
ہائے پرہیز سے یہ درد سوا ہوتا ہے

چشم خونبار مری آپ نے تلووں سے ملی
ورنہ ایسا بھی کہیں رنگ حنا ہوتا ہے

جاں بلب ہوں خبر وصل سنا دے قاصد
لب ہلانے میں ترے کام مرا ہوتا ہے

ہوکے آزردہ پشیماں ہوں کہ میں عبث سے کہوں
وہی کہوے کوئی ایسے سے خفا ہوتا ہے

دل دیا جس نے وہ ناکام رہا تا دم زیست
فی الحقیقت کہ بُرا کام بُرا ہوتا ہے

وار ہیں حشر تلک بہر دعا گو لب زخم
پر ترا حق نمک کوئی ادا ہوتا ہے

زہر نوش[2] غم شیریں نے کہا خسرو سے
تلخیِ مرگ میں شکر کا مزا ہوتا ہے

واقعی سجدۂ در ایسی ہی تقصیر ہے باب
جور جو بندہ پہ ہوتا ہے بجا ہوتا ہے

اے دل آجانے دے اُس زلف مسلسل کا خیال
جان کر کوئی گرفتار بلا ہوتا ہے

دل[3] میں اتنا تو سمایا ہے کہ جل جاتا ہوں
سرو نوخیز جو انگشت نما ہوتا ہے

ناتوانی مری مت پوچھ کہوں کیا ہمدم
بات کہنے میں میرا دم ہی ہوا ہوتا ہے

چاک[4] پیراہن گُل پر تو نہ پھول اے بُلبل
جامہ یاران لباسی کا قبا ہوتا ہے

ہو نہ بیتاب غم ہجر بتاں میں مومن
دیکھ دو دن میں بس اب فضل خدا ہوتا ہے

---

[1] اندوہ فزا = غم بڑھانے والا۔ کم ملنے کو پرہیز سے اور شوق یا عشق کو درد سے تعبیر کیا ہے۔

[2] زہر نوش غم شیریں = شیریں کے غم میں زہر پینے والا یعنی فرہاد۔ زہر۔ شیریں۔ تلخی۔ شکر میں جو نسبت ہے مخفی نہیں۔ [3] تو اسقدر میرے دل میں سمایا ہے کہ ہر چہ آید در نظر اسے یار پندارد تو ئی، یہانتک کہ اگر کوئی سرو نوخیز کی طرف بطور تحسین انگلی اُٹھاتا ہے تو میں اُسکو تیرے قامت رعنا کی تشبیہ سمجھکر رشک سے جلجاتا ہوں کیونکہ میری غیرت اسکو بھی اپنے نہیں کرتی کہ لوگ میرے بلند بالا محبوب (یا اُسکی شبیہ) کا ذکر کریں۔

[4] نہ پھول = ناز نہ کر۔ لباسی = خوشامدی۔ قبا ہونا۔ قبا شدن (فارسی محاورہ) کا ترجمہ ہے یعنی پارہ پارہ ہونا۔ چاک ہونا۔ اے بلبل گل کے پیرہن کے چاک ہونے پر ناز نہ کر یعنی یہ نہ سمجھ کہ گل نے میری محبت میں جامہ دری کی ہے۔ کیونکہ پیرہن کا چاک کرنا تملق پیشہ لوگوں کا کام ہے۔ شاعر نے "لباسی" کے ایہام سے فائدہ اُٹھایا ہے۔

۱۹۸

اجل[۱] جاں بلب اُسکے شیون سے ہے | یہ نادم مرے زود کشتن سے ہے
[۲] وہ بدخواہ مجھ سا تو میرا نہیں | عبث دوستی تم کو دشمن سے ہے
[۳] یہ پردہ نہ ہو نیش زنبور کا | مشبک مرا سینہ چلون سے ہے
مرے داغ یاد آئے گُل دیکھکر | کہ بیزار وہ سیر گُلشن سے ہے
جلانے[۴] سے بھی تیرے شاکر ہوں میں | گلہ نالۂ آتش افگن سے ہے
شب[۵] غم موئے شمع کو دیکھکر | ہمیں خجلت اُس شوخ بدظن سے ہے
مرا خون کیا یار گردن ہوا | کہ بیتاب وہ درد گردن سے ہے
کھلائے[۶] نہ کیوں سرمہ گوسالہ کو | خجل سامری چشم پُرفن سے ہے

۱ شیون = شور ماتم۔ معشوق میرے جلد ہلاک کرنے سے اسقدر شرمندہ ہوا ہے کہ برابر مصروف شیون وفریاد ہے۔ اُسکی یہ حالت دیکھکر اجل (جیسی سنگدل) بھی جاں بلب ہوگئی ہے۔ اجل کے جاں بلب ہونے کی یہ وجہ ہے کہ وہ بھی شریک جرم تھی۔ جان بلب کی صفت اجل کے لئے خاص ندرت ہے معشوق کی شرمندگی وندامت کا سبب شاید یہ ہو کہ اُس نے عاشق کو جلد کیوں قتل کر دیا۔ اب مشق جفا کس پر ہوگی۔ ۲ دشمن (رقیب) سے تم کو دوستی ہے اور وہ میرا بدخواہ ہے۔ اسکے معنی یہ ہوے کہ تمھیں میرے بدخواہ سے محبت ہے۔ مگر یہ خیال رہے کہ وہ اس قدر میرا بدخواہ نہیں جس قدر میں خود اپنا بدخواہ ہوں۔ اسلئے مجھ سے تم کو بدرجہا اولی دوستی چاہئے۔

۳ نیش زنبور = بھِڑ کا ڈنک۔ مشبک = سوراخدار۔ میرا سینہ چلون (چلمن) کی بدولت چھد گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ در یار کا پردہ (تیلیوں کے بجائے) نیش زنبور سے بنا ہے۔ سینہ کے مشبک ہونے کی وجہ یہ ہے کہ چلمن نظارۂ دلدار سے مانع ہے۔ ۴ تیری نوازش تو درکنار۔ میں تیرے جلانے کا بھی شکر گذار ہوں۔ اگر شکایت ہے تو اپنے نالۂ آتش افگن سے ہے کہ دنیا میں آگ لگا دیتا ہے مگر تیرے دل پر اثر نہیں کرتا۔ ۵ شب ہجر میں شمع کو دیکھکر ہمیں اپنے نگار شعلہ رو کی یاد آئی اور جان نکل گئی۔ اب اُس بدظن سے شرمندگی ہے۔ مبادا وہ یہ خیال کرے کہ یہ شمع پر عاشق تھا جو اُسکو دیکھتے ہی پروانہ کی طرح نثار ہوگیا۔ ۶ سامری ایک کافر جادوگر تھا جس نے اپنی عیاری سے ایک سونے کا گوسالہ (بچھڑا) بنایا جو بولتا تھا۔ آخر اُس کے اغوا سے بنی اسرائیل اُسکی پرستش کرنے لگے۔ سامری محبوب کی چشم جادو کو دیکھکر شرمندہ ہے اور اپنے سحر کو باطل کرنے پر آمادہ۔ واضح رہے کہ سرمہ کھلانے سے آواز بیٹھ جاتی ہے۔ سرمہ کی مناسبت چشم کے ذکر کے ساتھ ظاہر ہے۔

جہاں۸ خاک اُڑائی وہیں دب رہے ہے — کدورت عبث فکر مدفن سے ہے
نئی کچھ نہیں اپنی جانبازیاں — یہی کھیل ہم کو لڑکپن سے ہے
بگڑتے ہو کیا اب بھی کہتا ہوں میں — عیاں صلح پھر کس کی چتون سے ہے

دلِ۹ مومن آتشکدہ کیوں بنے
لگاوٹ یہ طفلِ برہمن سے ہے

۲۰۱

ہے۱۰ دل میں غبار اُسکے گھر اپنا نہ کرینگے — ہم خاک میں ملنے کی تمنا نہ کرینگے
کیونکر یہ کہیں منتِ اعدا نہ کرینگے — کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کرینگے
ہنس ہنس کے وہ مجھ سے ہی مرے قتل کی باتیں — اس طرح سے کرتے ہیں کہ گویا نہ کرینگے
کیا نامہ میں لکھوں دلِ۱۱ وابستہ کا احوال — معلوم ہے پہلے ہی کہ وہ وا نہ کرینگے
غیروں۱۲ سے شکرلب سخنِ تلخ بھی تیرا — ہر چند ہلاہل ہو گوارا نہ کرینگے
بیمار۱۳ اجل چارہ کو گر حضرت عیسیٰ — اچھا بھی کرینگے تو کچھ اچھا نہ کرینگے

۸ جنوں میں جہاں خاک اُڑائی وہیں ہمارا مدفن ہوگیا۔ پھر فکر مدفن بیکار ہے۔ خاک اور کدورت میں جو خوبی ہے ظاہر ہے۔

۹ جب طفل برہمن سے محبت ہے تو کیا وجہ ہے کہ مومن کا دل سوزِ غم سے آتشکدہ بن گیا کیونکہ آتشکدہ کا تعلق برہمنوں سے نہیں بلکہ آتش پرستوں سے ہوتا ہے۔

۱۰ محبوب کے دل میں ہماری طرف سے غبار ہے۔ ایسی صورت میں ہم اُسکے دل میں گھر کرنا پسند نہ کرینگے۔ کیونکہ ایسا کرنا خاک میں ملنے کے مترادف ہوگا۔ غبار اور خاک میں رعایت ہے۔ ۱۱ وابستہ = دلگیر۔ مغموم۔ وابستہ اور وا میں ایہام تضاد ہے۔ ۱۲ شکرلب = شیریں لب ہمیں یہ گوارا نہیں کہ تو غیروں سے باتیں کرے۔ خواہ وہ زہر ہلاہل کی طرح تلخ کیوں نہ ہوں۔ ۱۳ بیمار اجل چارہ = وہ بیمار جس کا علاج صرف موت ہو۔ یہ مومن کی مخصوص تراکیب میں سے ہے ایسے بیمار کے لئے شفا اچھی نہیں مرنا ہی بہتر ہے۔

جھنجھلاتے ہو کیا دیجئے اک بوسہ دہن کا
ہو جائینگے لب بند تو غوغا نہ کرینگے

دیوار کے گر پڑتے ہی اُٹھنے لگے طوفاں
اب بیٹھ کے کونے میں بھی رُویا نہ کرینگے

گر سامنے اُسکے بھی گرے اشک تو دل سے[۵]
کیوں روز جزا خون کا دعویٰ نہ کرینگے

کس وقت کیا مردمکِ چشم کا شکوہ[۶]
اے پردہ نشیں ہم تجھے رسوا نہ کرینگے

ناصح کف افسوس نہ مل چل تجھے کیا کام
پامال کرینگے وہ مجھے یا نہ کرینگے

اُس کو میں ٹھہرنے نہ دیا جوش قلق نے
اغیار سے ہم شکوۂ بیجا نہ کرینگے

گر ذکر وفا سے بھی غصہ ہے تو اب سے[۷]
گو قتل کا وعدہ ہو تقاضا نہ کرینگے

مومن وہ غزل کہتے ہیں اب جس سے یہ مضموں
کھل جائے کہ ترکِ درِ بتخانہ کرینگے

۲۰۲

توبہ[۱] ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کرینگے
وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کرینگے

ٹھہری ہے[۲] کہ ٹھہرائینگے زنجیر سے دل کو
پر برہمیِ زلف کا سودا نہ کرینگے

اندیشۂ مژگاں میں اگر خوں نے کیا جوش
نشتر سے علاجِ دلِ دیوانہ کرینگے

[۵] اگر محبوب کے سامنے بھی میرے اشک گرے تو بھی وہ اشک اُس کو ملزم نہ ٹھہرائینگے بلکہ قیامت میں دل ہی پر اپنے خون کا دعویٰ کرینگے ۔ کیونکہ یہی تمام مصائب کا ذمہ دار ہے اب دل پر دعویٰ کرنا بولتے ہیں ۔ [۶] اس میں رعایت یہ ہے کہ مردمکِ چشم (پتلی) بھی پردہ نشین ہے ۔ [۷] یعنی اب ہم وفا سے وعدہ قتل پر بھی اصرار نہ کرینگے مگر شاعرانہ ہے ۔

[۱] شاعر عشق بتاں سے توبہ کر رہا ہے ۔ ابتک اُسکو یہ توفیق نصیب نہ ہوئی تھی ۔ آئندہ بھی اس (توبہ) کی نوبت نہ آئے گی ۔ کیونکہ جب گناہ (عشق) ہی نہ کرے گا تو توبہ کی کیا احتیاج ۔ پوری مسلسل غزل واسوخت کے رنگ میں ہے ۔

[۲] یعنی دل آشفتہ کو پابند تو کر رکھیں گے ۔ مگر زلف برہم کے دیوانے نہ بنیں گے مناسبت الفاظ ظاہر ہے ۔

گر آرزوے وصل نے بیمار کیا تو
پرہیز کرینگے پہ مداوا نہ کرینگے

تشبیہ[10] زبس دیتے ہیں لبہائے بتاں کو
مرجائیں گے پر منت عیسیٰ نہ کرینگے

پھر جائے نہ تا چشم صنم آنکھ کے آگے
سیر چمنِ نرگسِ شہلا[11] نہ کرینگے

رکھ لیوینگے پتھر مگر ان سنگدلوں کو
چھاتی سے لگانے کی تمنا نہ کرینگے

[12]گو دار پہ کھینچیں ہمیں دلدار نصاری
پر آرزوے زلف چلیپا نہ کرینگے

گر حسن[13] گلو سوز نے پھر آگ لگائی
کیوں آب دم تیغ سے ٹھنڈا نہ کرینگے

ہے عہد کہ پھر جا نہ پھریں کوئے بتاں میں
پھر جائیں اب اس عہد سے ایسا نہ کرینگے

کہتے ہیں یہ ہم چاٹ کے خاک آہ نہ ہوں گو خاک
پر اب تو زمیں بوس کلیسا نہ کرینگے

[15]جوں قبلہ نما گرچہ تڑپتے ہی کٹے عمر
پر منہ سوئے دیر صنم آرا نہ کرینگے

اے حضرتِ مومن یہ مسلم جو ہے ارشاد
بھولے سے بھی اب ذکر بتوں کا نہ کرینگے ق

لیکن جو بتوں نے ہی بھلا آپ کی بات
پھر آپ ہی فرمائیں کہ کیا کیا نہ کرینگے

[10] جاں بخشی کے اعتبار سے لبہائے بتاں کو حضرت عیسیٰ سے تشبیہ دیجاتی ہے۔ [11] نرگسِ شہلا نرگس جس میں زردی کے بجائے سرخی مائل سیاہی ہو۔ ضد عبہر۔ چشم صنم کو نرگس شہلا سے تشبیہ دیتے ہیں۔
[12] دار = سولی۔ دلدار نصاری = مسیحی معشوق۔ چلیپا = + صلیب جس پر عیسائیوں کے عقیدے میں جناب مسیح کو ہلاک کیا گیا تھا۔ زلف چلیپا = زلف پرخم۔ [13] حسن گلوسوز = حسن شیریں یعنی حسن صبیح۔ گلوسوز اسلئے کہا ہے کہ زیادہ شیرینی سے حلق جل جاتا ہے۔ اگر حسن گلوسوز نے آگ لگائی تو ہم اس (آگ) کو آب دم تیغ سے ٹھنڈا کرینگے یعنی اپنے آپ کو تیغ سے ہلاک کرکے جوش عشق کو فرو کرینگے۔
[15] قبلہ نما = ایک آلہ جس کی سوئی ہر طرف گھوم کر قبلہ کی سمت قائم رہتی ہے۔ دیر صنم آرا = وہ دیر جس کی زینت بتوں سے ہو۔

نہ کٹی ہم سے شب جدائی کی
کتنی ہی طاقت آزمائی کی

رشک[1] دشمن بہانہ تھا سچ ہے
مَیں نے ہی تم سے بیوفائی کی

کیوں بُرا کہتے ہو بھلا ناصح
مَیں نے حسرت سے کیا بُرائی کی

دائم[2] عاشق ہے دل دہی نہ ستم
دل کو چھینا تو دلربائی کی

آ گئے[3] وہ دست غیر میں دئے ہاتھ
آس ٹوٹی شکستہ پائی کی

گر نہ بگڑو تو کیا بگڑتا ہے
مجھ میں طاقت نہیں لڑائی کی

گھر تو اُس ماہوش کا دور نہ تھا
لیک طالع نے نارسائی کی

مر گئے پر ہے بے خبر صیّاد
اب توقّع نہیں رہائی کی

کوچۂ[4] غیر میں ملا وہ ہمیں
ہرزہ تازی نے رہنمائی کی

دل[5] ہوا خون، خیالِ ناخنِ یار
تونے اچھی گرہ کشائی کی

مومن آؤ تمھیں بھی دکھلادوں
سیر بتخانہ میں خدائی کی

---

[1] مَیں نے رشک دشمن کا محض بہانہ رکھکر تم سے دوستی ترک کی- در اصل مَیں ہی بیوفائی کا مجرم ہوں- شاعر نے محبوب کے الزام کو طنزاً درست مانا ہے۔ [2] دل دہی= دلجوئی- نوازش- عاشق کو گرویدہ کرنیکا ذریعہ مہربانی ہے نہ کہ ظلم- اگر تم نے دل چھینا تو اِس کو دُنیا دلربائی کہے گی- دلدہی نہ کہے گی۔ [3] میں شکستہ پا تھا اور اُمید رکھتا تھا کہ دوست شاید میری عیادت کو آئے- وہ آیا تو ضرور مگر رقیب کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے- آہ میری شکستہ پائی نے جو توقعات قائم کرلی تھیں سب نقش برآب ثابت ہوئیں- [4] ہرزہ تازی = آوارہ گردی- بیہودہ پھرنا- ہم آوارہ پھرتے پھرتے کوچہ غیر میں پہونچ گئے اور وہاں معشوق موجود ملا- اس طرح آوارہ گردی نے مقصود تک رہنمائی کی- [5] عشق کی بدولت میرے دل میں غم کی گرہ پڑ گئی تھی- ناخن یار کے تصور نے دل کو یکسر خون کر ڈالا اس طریقے دل کی گرہ تو کھل گئی مگر دل کا بھی خاتمہ ہوگیا- ناخن سے گرہ کشائی کا کام لیا جاتا ہے- شعر میں طنز کا پہلو ہے-

۲۰۳

شب[1] تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

پوچھا[2] کسی پہ مرتے ہو اور دم نکل گیا
ہم جان سے عناں بہ عنانِ صدا گئے

پھیلی[3] وہ بو جو ہم میں نہاں مثلِ غنچہ تھی
جھونکے نسیم کے یہ نیا گل کھلا گئے

اے[4] آب اشک آتشِ عنصر ہے دیکھنا
جی ہی گیا اگر نفسِ شعلہ زا گئے

مجلس[5] میں اُس نے پان دیا اپنے ہاتھ سے
اغیار سبز بخت تھے ہم زہر کھا گئے

اُٹھا[6] نہ ضعف سے گُلِ داغِ جنوں کا بوجھ
قاروں کی طرح ہم بھی زمیں میں سما گئے

غیروں[7] سے ہو وہ پردہ نشیں کیوں نہ بے حجاب
دمہائے بے اثر مرے پردہ اُٹھا گئے

تھی بد گمانی اب اُنھیں کیا عشقِ حور کی
جو آکے مرتے دم مجھے صورت دکھا گئے

---

۱ آنکھیں چُرانا = اغماض برتنا۔ کھویا جانا = خفیف ہونا۔ پا جانا = تاڑ جانا۔ یعنی تمھارے اغماض کرنے کیوجہ سے میں سب کے سامنے سبک ہوا اور رقیب بھی میری حالت کو تاڑ گئے۔

۲ پوچھا کا فاعل معشوق (محذوف) ہے۔ عنان بہ عنانِ صدا = آواز کے ساتھ ساتھ۔

۳ نسیم بہار کے جھونکوں نے یہ نیا گل کھلایا کہ اُنکے چلنے سے وہ بو (بوے جنون یا عشق) جو ہمارے دل میں غنچہ کی طرح چھپی ہوئی تھی دنیا میں پھیل گئی۔ جوش جنوں (جو لازمۂ عشق ہے) کا تعلق نسیم سے شعرا کے یہاں عامۃ الورود ہے۔ الفاظ کی مناسبت ملحوظ رہے۔

۴ عُنصُر = اصل۔ آتش و آب و خاک و باد کو عناصر کہتے ہیں۔ میری شعلہ انگیز آہیں میرے حق میں آتشِ عنصری کا حکم رکھتی ہیں۔ جس کی ترکیب پر نظام زندگی کا انحصار ہے۔ اے آب اشک دیکھ اس آگ (آہ) کو نہ بجھانا ورنہ میری زندگی محال ہے۔ ۵ پان دیا کا مفعول اغیار ہے۔ سبز بخت = خوش نصیب۔ پان کی رعایت نے سبز بخت اور زہر استعمال کیا ہے۔ ۶ داغِ جنوں = زخموں کے نشان جو دیوانگی میں جسم پر رہجائیں۔ داغ کی تشبیہ گُل سے عام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ناتوانی کے باعث ہم سے یہ بوجھ بھی نہ اُٹھا۔ آخر قارون کی طرح زندہ درگور ہوگئے۔

۷ معشوق کی بے حجابی کی خوب وجہ بیان کی ہے۔ کہتا ہے کہ میری بے اثر آہوں نے اُس کا پردہ اُٹھا دیا یعنی اُس کو بے پردگی پر دلیر کر دیا۔ آہ کو (جو ہوا کی طرح ہے) پردہ اُٹھانے کا باعث قرار دیا ہے ماحصل یہ ہے کہ اگر میری آہ میں تاثیر ہوتی تو یہ نوبت نہ آتی۔

تابندہ[8] وجوان تو بخت رقیب سے تھے		ہم تیرہ روز کیوں غم ہجراں کو بھا گئے
بیزار[9] زندگانی کا جینا محال تھا		وہ بھی ہماری نعش کو ٹھوکر لگا گئے
واعظ[10] کے ذکر مہر قیامت کو کیا کہوں		عالم شب وصال کے آنکھوں میں چھا گئے
جس وقت اُس دیار سے اغیار بوالہوس	ق	بدخوئیوں سے یار کی ہو کر خفا گئے
دنیا ہی سے گیا میں جو ہیں ناز سے کہا		اب بھی گمان بد نہ گئے تیرے یا گئے

اے مومن آپ کب سے ہوئے بندۂ بتاں
بارے ہمارے دین[11] میں حضرت بھی آگئے

ازبس[12] جنوں جدائی گل پیرہن سے ہے	۲۰۵	دل چاک چاک نغمۂ مرغ چمن سے ہے
سرگرم[13] مدح غیر دم شعلہ زن سے ہے		دوزخ کو کیا جلن مرے دل کی جلن سے ہے

۸ تابندہ = روشن - غم ہجراں کو چاہئے تھا کہ رقیب کو پسند کرتا - ہم سیاہ بختوں کو ناحق پسند کیا - ۹ محبوب کی ٹھوکر میں یوں تو جاں بخشی کی صفت مسلّم ہے مگر میں دراصل خود زندگی سے بیزار تھا - یہی وجہ تھی کہ اسکی ٹھوکر کے باوجود زندہ نہ ہوا - ۱۰ واعظ کے بیان پر مجھے "زمانۂ وصال کی تجلّی یار" (جو جلوہ آفتاب قیامت سے مشابہ تھی) یاد آگئی - ۱۱ دین سے یہاں مراد بُت پرستی ہے -

۱۲ مرغ چمن (بُلبُل) کے نغمے سنکر یہ خیال آتا ہے کہ یہ گُل پر عاشق ہے اور گُل سے مجھے اپنے گُل پیرہن کی یاد آتی ہے جس سے دل چاک چاک ہو جاتا ہے - دیوانہ را ہوئے بس است -

۱۳ دوزخ اپنے شعلوں کی لپٹوں سے رقیب کی مدح میں سرگرم ہے اور میرے سوز دل کی (جو دوزخ سے کہیں زیادہ ہے) تعریف نہیں کرتی - اسکی وجہ یہ ہے کہ اُس (دوزخ) کو میرے دل کی جلن پر رشک آتا ہے - یعنی چونکہ وہ سوز میں مجھ سے کمتر ہے اسلئے مجھ پر حسد کرتی ہے اور میرے جلانے کے لئے رقیب کی (جو سوز عشق سے خالی ہے) تعریفیں کرتی ہے -

روزِ جزا نہ دے جو مرے قتل کا جواب
وہم سخن رقیب کو اُس کم سخن سے ہے

یاد آگیا زبن کوئی مہ روئے مہروش
اُمید داغِ تازہ سپہرِ کہن سے ہے

۵۳ کچھ بھی کیا نہ یار کی سنگیں دلی کا پاس
سب کاوشِ رقیب بجا کوہکن سے ہے

۵۴ اُن کو گمان ہے گلۂ چینِ زلف کا
خوشبو دہانِ زخم جو مشکِ ختن سے ہے

۵۵ میں کیا کہ مرگِ غیر پہ داماں تر نہ ہو
وہ اشک ریز خندۂ چاکِ کفن سے ہے

۵۶ کیونکر نجات آتشِ ہجراں سے ہو کہ مرگ
آئی تو دور ہی تب و تابِ بدن سے ہے

۵۷ خودرفتگی میں چین وہ پایا کہ کیا کہوں
غربت جو مجھ سے پوچھو تو بہتر وطن سے ہے

۵۳ یار سے شیریں اور رقیب سے خسرو مراد ہے۔ کوہکن نے پتھر کاٹ کر نہر نکالی اور اپنی محبوبہ کی سنگدلی کا پاس کیا۔ یعنی پاس ادب کا تقاضا تو یہ تھا کہ پتھر کو دلِ یار سے مشابہ سمجھ کر اُس کا احترام کرتا۔ مگر نہ کیا۔ اسلئے خسرو کی دشمنی اُس سے بالکل حق بجانب ہے۔

۵۴ مشک زخم میں کاٹ کرتا ہے۔ عاشق ایذا پسند نے اپنے زخم پر مشک ختن لگایا جس سے دہانِ زخم میں خوشبو آنے لگی۔ مگر محبوب کو یہی گمان ہے کہ دہانِ زخم نے میرے زلفِ مشکیں کی شکن کا گلہ کیا ہے۔ جس کے اثر سے یہ بوئے خوش پیدا ہوگئی ہے۔

۵۵ چاک کفن کو لبِ خنداں سے تشبیہ دیجاتی ہے۔ عاشق کی میت پر آکر معشوق روتا ہے۔ جس سے لوگوں کو اُسکی نرم دلی کا گمان ہوسکتا تھا۔ مگر عاشق کہتا ہے کہ وہ اسقدر سخت دل ہے کہ میں تو کس شمار میں ہوں۔ رقیب کی موت پر بھی نہ روئے گا۔ دراصل وہ ظالم میرے چاک کفن کے ہنسنے پر اشک بار ہے کہ کم نصیب مرنے والے کو برائے نام مسرت بھی کیوں نصیب ہوئی۔

۵۶ آتشِ ہجراں سے نجات کی صورت یہ تھی کہ مرجاتا۔ مگر موت آئی بھی تو بدن کی گرمی (جو آتشِ ہجراں کا نتیجہ ہے) کے خوف سے دور ہی کھڑی رہی۔ ۵۷ خودرفتگی کو غربت سے تشبیہ دی ہے۔

رشکِ[۸] پری کہے سے عدو کے یہ وحشتیں
نفرت بلا تمھیں مرے دیوانہ پن سے ہے

داغِ[۹] جنوں کو دیتے ہیں گل سے بس مثال
مَیں کیا کہ عندلیب کو وحشت چمن سے ہے

کیوں[۱۰] یار نوحہ زن ہیں کہاں مرگ مجھکو تو
لب بستگی تصورِ بوسِ دہن سے ہے

کیا کیا جواب شکوہ میں باتیں بنا گیا
لو اب بھی دل درست اُسی دلشکن سے ہے

اپنا[۱۱] شریک بھی نہ گوارا کرے بتو
مومن کو ضد یہ کیشِ برہمن سے ہے

وہ کہاں[۱] ساتھ سُلاتے ہیں مجھے
خواب کیا کیا نظر آتے ہیں مجھے

اُس[۲] پری وش سے لگاتے ہیں مجھے
لوگ دیوانہ بناتے ہیں مجھے

یا رب اُن کا بھی جنازہ اُٹھے
یار اُس کو سے اُٹھاتے ہیں مجھے

ابروے[۳] تیغ سے ایما ہے کہ آ
قتل کرنے کو بُلاتے ہیں مجھے

بیوفائی[۴] کا عدو کی ہے گلہ
لُطف میں بھی وہ ستاتے ہیں مجھے

۸ بلا = بلا کی۔ غضب کی۔ تمھیں میرے دیوانہ پن سے بلا کی نفرت ہے کہ رقیب تک اگر تمھیں رشکِ پری کہہ دیتا ہے تو چراغ پا ہو جاتے ہو۔ یعنی چونکہ پری کا سایہ پڑنے سے آدمی دیوانہ ہو جاتا ہے۔ اس واسطے تمھیں اتنی نسبت بھی اپنے دیوانہ سے گوارا نہیں۔ پری۔ وحشت۔ بلا۔ دیوانہ میں جو نسبتیں ہیں ظاہر ہے۔ ۹ میری وحشت کا کیا پوچھنا۔ بلبل جو گل پر عاشق ہے اُس کو بھی میری نسبت کی وجہ سے جنون کا خلل ہو گیا اور چمن سے وحشت ہونے لگی ۱۰ مَیں مرا نہیں ہوں۔ بلکہ بوسہ دہانِ یار کے تصور میں میرے لب بند ہو گئے ہیں۔ "مجھکو تو" کا تعلق دوسرے مصرع سے ہے۔ ۱۱ مومن کو برہمن کے مذہب بد یعنی شرک سے اسقدر ضد ہے کہ خدا کا شریک تو درکنار۔ اُس (مومن) کو اپنا شریک بھی گوارا نہیں۔ اس میں لطافت یہ ہے کہ مومن بھی بتوں کا پرستار ہے اور برہمن بھی اس لحاظ سے دونوں ایک دوسرے کے شریک ٹھہرے۔

۱ خواب میں دیکھتا ہوں کہ دوست سے ملاقات ہوئی۔ مگر خواب کی بات کا کیا اعتبار؟ خواب سے مراد فرضی منصوبے بھی ہو سکتے ہیں۔ ۲ لگانا = متہم کرنا۔ ۳ تیغ کو خم کے اعتبار سے ابرو کہا ہے۔ اور ابرو کا کام ہے ایما (اشارہ) کرنا۔ ۴ مطلب یہ ہے کہ "ذکر اُس کا یہ بدی بھی مجھے منظور نہیں"۔

حیرتِ[۳] حُسن سے یہ شکل بنی — کہ وہ آئینہ دکھاتے ہیں مجھے

پھونک[۴] دے آتشِ دل داغ مرے — اُس کی خو یاد دلاتے ہیں مجھے

گر کہے غمزہ کسے قتل کروں — تو اشارت سے بتاتے ہیں مجھے

مَیں تو اُس زلف کی بو پر غش ہوں — چارہ گر مُشک سونگھاتے ہیں مجھے

شعلہ[۵] رو کہتے ہیں اغیار کو وہ — اپنے نزدیک جلاتے ہیں مجھے

جاں[۶] گئی پر نہ گئی جور کشی — بعد مردن بھی دباتے ہیں مجھے

وہ[۷] جو کہتے ہیں تجھے آگ لگے — مژدۂ وصل سُناتے ہیں مجھے

اب[۸] یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشیں — تجھسے احباب چھپاتے ہیں مجھے

مومن اور دیر خُدا خیر کرے — طور بیڈھب نظر آتے ہیں مجھے

۳ھ حیرتِ حُسن سے میری یہ صورت ہوگئی کہ مردہ کا دھوکا ہوتا ہے چنانچہ وہ زندگی اور موت کی تمیز و تحقیق کی غرض سے مجھے آئینہ دکھاتے ہیں - قاعدہ ہے کہ سکتہ کی حالت میں امتحان کی غرض سے آئینہ مُنہ کے قریب رکھا جاتا ہے - ۴ھ داغوں کی سوزش سے یار کی آتش خوئی یاد آتی ہے -

۵ھ میرے جلانے کے لئے وہ غیر سے اس طرح خطاب کرتے ہیں جیسے کوئی کسی حسین کو مخاطب کرے مثلاً شعلہ رو - ۶ھ مرنے کے بعد مٹی میں دبانے کو جور قرار دیا ہے - ۷ھ محبوب کے کوسنے کی توجیہ بطور تاویل الکلام بمالا یرضیٰ بہ قائلہٗ خوب کی ہے - چونکہ وہ آتشیں خو خود آگ ہے - اسلئے شاعر نے اس طرح تفاؤل کیا - ۸ھ میری ناتوانی اب اس حد تک پہونچ گئی کہ احباب مجھے معشوق سے چھپاتے ہیں کہ مبادا ضعف کے باعث جذبہ فرط مسرت کی تاب نہ لاسکوں اور مرجاؤں یا یہ کہ میری حالت اسقدر ردی ہے کہ معشوق دیکھنے کا تحمل نہ کر سکیگا

جذبِ[۵۱] دل زور آزمانا چھوڑ دے
پائے نازک کا ستانا چھوڑ دے

جان[۵۲] سے جاتی ہیں کیا کیا حسرتیں
کاش وہ دل میں بھی آنا چھوڑ دے

حال دکھلاتا ہوں شاید شرم سے
غیر اُس کو مُنہ دکھانا چھوڑ دے

گوش نازک پر کسی کے رحم کر
جوشِ افغاں غُل مچانا چھوڑ دے

داغ[۵۳] سے میرے جہنم کو مثال
تو بھی واعظ دل جلانا چھوڑ دے

پردہ کی کچھ حد بھی اے پردہ نشیں
کھُل کے مِل بس مُنہ چھپانا چھوڑ دے

ہوش[۵۴] وہ مجنوں گر مَیں زنداں میں ہوں
فصلِ گُل گلشن میں آنا چھوڑ دے

لب[۵۵] پہ حرفِ آرزو کا خوں ہوا
رنگِ پاں کا مُنہ لگانا چھوڑ دے

ہم نہیں اُٹھنے کے تیری بزم سے
پاس غیروں کا بٹھانا چھوڑ دے

اُس[۵۶] دہن کو غنچہ اے دل کیا کہوں
ڈر لگے ہے مُسکرانا چھوڑ دے

وصل میں بھی دل سے غم جاوے کہاں
کیا کوئی اپنا ٹھکانا چھوڑ دے

۵۱ میرے جذبۂ دل سے مجبور ہو کر وہ نازنین بے تابانہ میرے گھر آتا ہے اور مجھے اُسکے پائے نازک کی تکلیف شاق گزرتی ہے۔ ۵۲ کاش محبوب تصوّر میں بھی نہ آیا کرے۔ کیونکہ اُسکے آنے سے حسرتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور آخر کو فنا ہو جاتی ہیں۔ اگر وہ تصوّر میں نہ آئے تو یہ نوبت ہی کیوں آئے۔ ۵۳ مطلب یہ ہے کہ میرا داغِ دل سوزش میں جہنم سے کہیں زائد ہے۔

۵۴ یعنی فصلِ گُل گلشن میں محض اس غرض سے آیا کرتی ہے کہ میرے جوشِ جنوں کو برانگیختہ کرے۔ جب میں زنداں میں ہونگا تو بہار کے گلشن میں آنے کی کیا ضرورت ہوگی۔

۵۵ تونے اپنے لب سے میری التجا پر انکار کر دیا۔ گویا تیرے لب پر میرے حرفِ آرزو کا خون ہوگیا۔ ایسی حالت میں رنگِ پان کا مُنہ لگانا بیکار ہے۔ سُرخیِ لب کے لئے یہی خون کافی ہے۔

۵۶ محبوب کے دہن کو غنچہ کہنا درست نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اس حقیر تشبیہ سے برہم ہو کر مُسکرانا ترک کر دے۔ واضح رہے کہ غنچہ میں (جب تک وہ غنچہ ہے) مُسکراہٹ نہیں ہوتی۔

آہ ۵۷ میری کب دعائے نوح تھی
ناتوانی ۵۸ سے نزاکت ہے زیاد

چشم تر طوفاں اٹھانا چھوڑ دے
مجھ سے تو دامن چھڑانا چھوڑ دے

گر ہے ۵۹ مومن روزۂ وصلِ بتاں
تو غمِ فرقت بھی کھانا چھوڑ دے

پھر ۶۰ سینہ سوز داغ غمِ شعلہ فام ہے
پھر گرمجوشیِ دل وسودائے خام ہے

ہر ۶۱ مو پہ پھر ہے طائرِ مجنوں کا آشیاں
پھر فوج فوج سر پہ مرے ازدحام ہے

پھر ۶۲ زیبِ سر ہے شعلۂ داغِ جنوں سے تاج
پھر دورباش نالہ اثر اہتمام ہے

پھر ۶۳ دل ہے داغ مطلعِ خورشید دیکھ کر
از بسکہ یاد جلوۂ بالائے بام ہے

اس ۶۴ آہوئے رمیدہ کو پھر ڈھونڈتا ہے دل
رم کردہ شوق وصل پھر اک صید رام ہے

۵۷ جس طرح حضرت نوح علیہ السلام کی بددعا پر زمین سے پانی کا عالمگیر طوفان برپا ہوا تھا۔ اسی طرح عاشق کی آہ پر چشم تر سے سیلاب آگیا۔ اس پردہ اپنی چشم تر سے کہتا ہے کہ یہ طوفان کیوں اٹھایا ہے۔ کیا میری آہ دعائے نوح تھی۔ ۵۸ تو نازک ہے میں ناتواں ہوں۔ مگر تیری نزاکت میری ناتوانی سے بڑھی ہوئی ہے۔ اسلئے اگر تو نے مجھ سے دامن چھڑا لیا تو تیری نزاکت پر حرف آئے گا۔

۵۹ روزہ یہاں صوم کے لغوی معنی میں لکھا ہے۔ یعنی کسی چیز کے تمتع سے محرومی اگر وصلِ بتاں حاصل نہیں ہوتا تو غم جدائی بھی کیوں برداشت کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ روزہ میں کوئی چیز کھائی نہیں جاتی۔ ۶۰ سینہ سوز = سینہ جلانیوالا۔ شعلہ فام = نگار شعلہ رو۔ گرمجوشی = اختلاط۔ سودائے خام تمنائے لاحاصل۔ پھر ایک شعلہ رو کا داغِ عشق سینہ سوز ہے اور پھر دل اور سودائے خام میں اختلاط ہوا۔ پوری غزل مسلسل ہے۔ ۶۱ طائر مجنوں = مرغ مجنوں۔ تفصیل اوپر گذری۔ فوج فوج سے کثرت مقصود ہے ازدحام سے طائروں کا ازدحام مراد لیا ہے۔ ۶۲ داغ جنوں کے شعلے کو تاج سے تشبیہ دی ہے۔ میرے سر پر داغ کا تاج ہے اور نالے (کے نقیب) کی آواز دور باش تاثیر کا اہتمام کرنے میں مصروف ہے یعنی نالہ قرین اثر ہے دور باش اس نیزے کو بھی کہتے ہیں جسے لیکر نقیب آگے آگے چلتے ہیں۔ ۶۳ مطلع خورشید دیکھ کر جلوۂ بام یاد آتا ہے اور دل جلا جاتا ہے ۶۴ آہوئے رمیدہ = بھاگا ہوا غزال یعنی محبوب۔ رم کردہ = بھاگا ہوا۔ صید رام = شکار جو قابو میں آجائے۔ یعنی شوق وصل جو دل سے نکل گیا تھا۔ اب پھر قابو میں آگیا۔

پھر آگیا ہے کون سے بیباک کا خیال — یہ کیا ہوا کہ رخصتِ ناموس و نام ہے

جاں لوٹتی ہے پھر کہ وہی عیش ہو نصیب — ہم[۶] ہیں وہ مست ناز ہے اور دورِ جام ہے

جی[۷] چاہتا ہے پوچھے کوئی کیا وہ مر گیا — پھر ایک بات کہنے میں قصہ تمام ہے

پھر تلخ کامیوں نے کیا جان و دل سے کوچ — پھر آرزوے بوسہ کا لب پر مقام ہے

چلون[۸] سے کس پری کا نظارہ ہوا نصیب — پھر اپنے تنکے چُننے کی کیوں دھوم دھام ہے

پھر[۹] پردہ در ہے کس کی وہ اُنگلی ہلال سی — جو مثل صبح چاک گریبانِ شام ہے

پھر کس نے مُسکرا کے مجھے بیوفا کہا — کیوں کہہ رہا ہوں بندہ تو صاحب غلام ہے

پھر کس[۱۰] نے غیر کو نہ دیا ناز سے جواب — پھر خواہشِ پیامِ اجل کا پیام ہے

دیکھا[۱۱] نگاہِ ناز سے کس شوخ چشم نے — پھر مضطرب نظر کو جہاں نیم گام ہے

کس کم سخن نے دیکھ مجھے آہ کی کہ پھر — اپنے بھی[۱۲] چپکے رہنے میں کچھ کچھ کلام ہے

پھر کس[۱۳] ستم شعار نے پوچھا ہے میرا حال — پھر ناصحوں کو کیوں خطرِ انتقام ہے

---

۶ دوسرے مصرع میں عیش کی تفسیر کی ہے۔ ۷ جی چاہتا ہے کہ میں حالت نزع میں ہوں اور دوست آکر کسی سے دریافت کرے "کہ کیا وہ مر گیا" یا اُس کی اس پرسش پر میری تمام شکایات کا قصہ تمام ہو جائے ۸ چلون کی رعایت سے تنکے چننا لکھا ہے۔ تنکے چننا جنون کی علامت ہے ۔ ۹ محبوب نے اپنی ہلال نما اُنگلی سے پردہ (چلون) کو چاک کر دیا جس سے اُس کی تجلی آشکارا ہوئی اور گریبان شام صبح کی طرح چاک ہوگیا۔ یعنی شام میں صبح کی ضیا نظر آنے لگی ۔ ۱۰ معشوق نے غیر کو جواب نہیں دیا ۔ جس پر اُس (غیر) نے مایوس ہو کر یہ پیام کہلا بھیجا کہ میں اب پیام اجل کا خواہاں ہوں ۔ ۱۱ اُدھر اُس شوخ چشم نے میری طرف نگاہ کی ۔ اِدھر اُسکے اثر سے میری نظر میں اس قدر تڑپ پیدا ہوگئی کہ جس کے روبرو وسعت دُنیا نصف قدم کے برابر ہے ۔ ۱۲ کلام = شبہ ۔ اعتراض ۔ اب میرا بھی خاموش رہنا محل اعتراض ہے یعنی اب مجھے بھی نالہ و فریاد کرنی چاہیئے ۔ ۱۳ اُس ستم شعار نے میری پرسش حال کی ہے جس پر ناصحوں کو انتقام کا خوف پیدا ہوگیا ہے یعنی ناصحوں کو ڈر ہے کہ اب تک یہ (عاشق) ہماری تلخ نوائی برداشت کرتا تھا ۔ اب اسکی بن آئی ہے ۔ اُلٹا ہمیں ہدفِ ملامت بنا سکے گا۔

پھر کیوں نہ کام ہووے کہ اس کہنے پر کہا پھر کچھ صدائے پاسے دلِ مردہ جی اٹھا		سو بار مجھ کو تم سے تمھیں مجھ سے کام ہے پھر جلوہ ریز کون قیامت خرام ہے

پھر دوریٔ بتاں میں نہیں خواب کا خیال
مومن مرے بھی دین میں سونا حرام ہے[۵۱]

میں احوالِ دل مرگیا کہتے کہتے مجھے[۵۲] چپ لگی مدعا کہتے کہتے زباں گنگ ہے عشق میں گوش کر ہے شبِ ہجر میں کیا ہجومِ بلا ہے گلہ[۵۳] ہرزہ گردی کا بیجا نہ تھا کچھ صد[۵۴] افسوس جاتی رہی وصل کی شب	تھکے تم نہ بس بس سنا کہتے کہتے رکے ہیں وہ کیا جانے کیا کہتے کہتے برا سنتے سنتے بھلا کہتے کہتے زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے وہ کیوں مسکرائے بجا کہتے کہتے ذرا ٹھہرائے بیوفا کہتے کہتے

۵۱ دین سے دینِ عشق مراد ہے۔ "سونا" کے لفظ سے خاص فائدہ لیا ہے۔

۵۲ میں عرض مدعا کر رہا تھا کہ انھوں نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر رک گئے۔ اس فکر میں کہ نہ جانے وہ میرے موافق کہنے والے تھے یا خلاف۔ مجھے چپ لگ گئی۔ ۵۲ کر = بہرا۔

۵۳ عاشق نے معشوق سے اسکی ہرزہ گردی (آوارہ گردی) کا گلہ کیا۔ اس نے مسکرا کر (طنزاً) جواب دیا "بجا"۔ اس سے عاشق نے ستم ظریفی سے یہ نتیجہ نکالا کہ میرا شکوہ بیجا نہ تھا ورنہ وہ "بجا" کہکر اعتراف کیوں کرتا۔

۵۴ ہم شبِ وصل سے برابر کہتے رہے۔ کہ "اے بیوفا۔ ذرا ٹھہر"۔ مگر وہ چل دی۔

چلیے[9] تم کہاں میں نے تو دم لیا ہے | فسانہ دلِ زار کا کہتے کہتے
بُرا ہو ترا محرمِ راز تو نے | کیا اُن کو رسوا بُرا کہتے کہتے
ستمہائے گردوں مفصّل نہ پوچھو | کہ سر پھر گیا ماجرا کہتے کہتے

نہیں[10] یا صنم مومن اب کفر سے کچھ
کہ خو ہو گئی ہے صنم کہتے کہتے

سدا

مشورہ کیا کیجے چرخِ پیر سے | دن نہیں پھرتے کسی تدبیر سے
کس[11] طرح مایوس ہوں تاثیر سے | دم رُکے ہے نالۂ شبگیر سے
میری وحشت کے لیے صحرا ہیں | تنگ تر ہے خانۂ[12] زنجیر سے
کیوں[13] نہ ٹپکے آب جب ٹپکے لہو | برق کٹتی ہے تری شمشیر سے
وہ مٹا دے نامۂ مضمونِ وصل | گر ہو خطِ کاتبِ تقدیر سے
یوں بنا کر حال دل کہنا نہ تھا | بات بگڑی میری ہی تقریر سے
انگلیوں میں خامہ جم کر رہ گیا | نامہ ہائے شوق کی تحریر سے

[9] یعنی ابھی افسانۂ دل ختم نہیں ہوا ہے۔ [10] میرا "یا صنم" کہنا کفر کی نیت سے نہیں بلکہ ہمیشہ کہتے کہتے عادت ہو گئی ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ ندائے غیر اللہ کفر ہے۔

[11] نالۂ شبگیر (پچھلے پہر کا نالہ) سے سانس رُکنے لگتی ہے۔ پھر میں تاثیر سے مایوس کیوں ہوں۔ یعنی نالے کی یہ تاثیر کیا کم ہے کہ میری جان پر بن گئی۔ شعر میں طنز ہے۔

[12] خانۂ زنجیر = حلقۂ زنجیر۔

[13] تیری شمشیر سے خون ٹپکتا دیکھ کر برق کٹتی ہے (خجل ہوتی ہے) اور یہ پانی جو آسمان سے برستا ہے برق کا عرقِ خجالت ہے۔

قہر ہے پھرنا نگاہِ یار کا
وحشتِ چشمِ پری رو دیکھنا
لے گئی جاں یاد رونقہائے وصل

الاماں اس بازگشتی تیر سے
پھر گیا جی سرمۂ تسخیر سے
گھر مرا ویراں ہوا تعمیر سے

اے صنم مومن ہوں آخر کس طرح
مجھکو تسکیں ہو تری تصویر سے

کیونکہ پوچھے حال تلخی عاشقِ دلگیر سے
جوشِ وحشت کشمکش اُس ناتواں دلگیر سے
کام ہوتے ہیں جوانوں کے سپہرِ پیر سے
دوستو لے آؤ قاتل کو کسی تدبیر سے

ہو گئے ہیں بند لب شیرینیٔ تقریر سے
جو نہ در تک پہونچے صحن خانۂ زنجیر سے
لے گیا ہے پشتِ خم شاید تری شمشیر سے
سر کٹا دینگے کہ اب تو جنگ ہے تقدیر سے

سکہ بازگشتی تیر۔ نگاہ کو تیر سے تشبیہ دیتے ہیں اور چونکہ نگاہ "پھر جاتی ہے" اسلئے اُسکو "بازگشتی" تیر کہا گیا۔ شہ میں نے اپنے آنکھ میں سرمۂ تسخیر لگایا کہ معشوق پریرو اُسکی تاثیر سے مسخر ہو جاے۔ مگر اُلٹا اثر ہوا کہ وہ اور وحشت کرنے لگا۔ آخر سرمۂ تسخیر سے میرا جی بیزار ہو گیا۔ ٹہ جان جانے کو خانہ ویرانی اور رونقہائے وصل کو تعمیر سے تعبیر کیا ہے۔ ٹہ اہل ایمان تصویر رکھنا شرعاً ناجائز سمجھتے ہیں۔ ماحصل یہ ہے کہ تو خود آ اپنی تصویر نہ بھیج۔

لہ اُس شکرلب کے ہونٹ شیرینیٔ تقریر کی وجہ سے بند ہو گئے ہیں۔ پھر میرا حال کیونکر پوچھے۔
ٹہ اے جوش وحشت ایسے ناتواں (عاشق) سے کشمکش نہ کر جو حلقۂ زنجیر سے نکلکر در زنداں تک نہ پہونچ سکے
ٹہ آسمان پیر ہے اور اُسکی پُشت خم ہے۔ مگر اسکے باوجود جوانوں کے سے کام کرتا ہے۔ شاید تیری شمشیرِ خمیدہ سے پُشت خم مستعار لے گیا ہے جو یہ حال ہے۔ یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ اُسکے ہاتھ جوانوں کے کام تمام ہوتے ہیں۔

صبحدم جاتا ہے پہلو سے مرے وہ مہ جبیں — دن سیہ ہوتے ہیں کیا کیا مہر کی تنویر سے

وہم میخواری سے دل کو نشۂ بنگ آگیا — ہوش جاتے ہیں تری بہکی ہوئی تقریر سے

فرط ضعف و جوش بیتابی ہے میرا حال دیکھ — اشک خوں جاری ہیں چشم ہر جوان و پیر سے

ہوں غضب سے اُسکے سرگرم فغانِ شعلہ زن — جل گیا جی احتراقِ زہرہ کی تاثیر سے

لذتِ وحشت سے جلتا ہوں کہیں بھاگے نہ دل — ہیں مشابہ آپ کی زلفیں بہت زنجیر سے

کام جز اُلفت نہیں اے کاتبِ اعمال یاں — فائدہ حرفِ مکرر کی بھلا تحریر سے

طوطیاں سیکھیں کہاں سے نالۂ رشک آفریں — ہو نہ زیبِ پشت آئینہ تری تصویر سے

ہوں سزاوارِ ستم میں نے کیا ہے جرمِ عشق — بوالہوس ہیں بیگنہ پھر کیوں ڈریں تعزیر سے

---

۳ آفتاب کی روشنی میرے حق میں سیاہ روزی کا حکم رکھتی ہے کیونکہ صبح ہوتے ہی وہ مہ جبین پہلو سے رخصت ہو جاتا ہے

۴ تو نے بہکی بہکی باتیں کیں اور مجھے وہم ہوا کہ کہیں بزم غیر میں میخواری نہ کی ہو۔ اس وہم نے میرے ہوش اس طرح اڑا دئے جیسے بنگ کے نشہ سے اُڑ جاتے ہیں۔ ۵ دیکھ = دیکھ کر۔ ۶ احتراق جل جانا منجموں کی اصطلاح میں قمر کے سوا کسی سیارہ کا برج واحد میں جمع ہونے کی وجہ سے شعاع خورشید کے نیچے چھپ جانا احتراق کہلاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب خورشید رو برسرِ عتاب ہے گویا میرا طالع سعد (زہرہ) زیر شعاع آگیا ہے (اُسکی سعادت معدوم ہو گئی ہے) یہی سبب ہے کہ میں جل کر فغان آتشیں کرتا ہوں۔ ۸ میں لذت وحشت (بادیہ گردی) کا دلدادہ ہوں اور زنجیر سے بھاگتا ہوں۔ مگر چونکہ آپ کی زلفیں زنجیر سے مشابہ ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ دل زلفوں سے بھی بھاگنے لگے۔ باز آیا ایسی لذت وحشت سے

۹ میرے نامۂ اعمال میں اُلفت کے سوا کوئی عمل نہیں۔ پھر ایک ہی بات کو بار بار لکھنے سے فائدہ ؟۔

۱۰ آئینہ کی پشت پر طوطی کی تصویر بنا دیتے ہیں اور جاندار طوطی کو آئینہ کے سامنے بٹھا دیتے ہیں جس پردہ اپنی شبیہ کو دیکھکر بولنا سیکھ جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پشت آئینہ پر تیری تصویر ہی ہوئی ہے۔ جس کو دیکھکر طوطیاں نالۂ رشک آفریں سیکھ گئیں۔ نالۂ رشک آفریں = نالہ جس پر مجھے بھی رشک آتا ہے۔ ۱۱ بیگنہ = جس نے جرم (عشق) نہ کیا ہو۔ تاکید الذم بما یشبہ المدح کی اچھی مثال ہے۔

اے[۱۲] فسونگر چشم جادو پر نہیں چلتا عمل
دیکھنا بھی چھٹ نہ جائے سرمۂ تسخیر سے

حسن[۱۳] کی نیرنگیوں سے کم نہیں ارژنگ عشق
تو بنو جلوہ ملا لو رنگ کی تغئیر سے

رشکِ دامانِ جواہر اور لکھی ہے غزل
جس کو مفلس بھی نہ بدلے نسخۂ اکسیر سے

جل[۱] گئے اختر یہ کس کے حسن کی تنویر سے
ہے منور تر شب غم مہر عالمگیر سے

رو دیا بے اختیار اس شوخ نے تاثیر سے
دود دل[۲] بھی کم نہیں ہے سرمۂ تسخیر سے

چین ہو خواب عدم میں تو کسی تدبیر سے
میرے[۳] بالش کے لئے پر لاد و اسکے تیر سے

ہوگئی[۴] ساری زمیں صرف حروف نو رقم
اک جہاں ویراں ہے میرے نامہ کی تحریر سے

کیوں[۵] کہا تھا یہ کہ بکتے بکتے سر پھرنے لگا
اب تو باندھونگا میں ناصح اسکو بھی زنجیر سے

۱۲ کسی فسونگر نے عاشق کو سرمۂ تسخیر دیا کہ دوست مسخر ہو جائے۔ وہ جواب دیتا ہے کہ مبادا اس عمل کی الٹی تاثیر ہو اور محبوب میری جانب دیکھنا بھی چھوڑ دے۔ ۱۳ نیرنگ = عجائبات۔ ارژنگ = نگارخانہ۔ یعنی اگر تمھارا جمال ہر وقت نئی ادا سے جلوہ گر ہوتا ہے تو میرا رنگ رخ بھی ہر دم دگرگوں ہوتا رہتا ہے۔ ۱ معشوق آیا اور اسکے حسن کی روشنی سے میری شبِ غم مہرِ عالمگیر سے زیادہ روشن ہوگئی (یعنی مبدل بروز ہوگئی) اور شدت نور کے باعث ستارے جل گئے۔ ۲ دودِ دل (آہ) کی مشابہت سرمۂ تسخیر سے ظاہر ہے۔ ۳ بالش = تکیہ۔ تکیہ میں اکثر پر بھرے جاتے ہیں۔ تیر کا پر مشہور ہے۔ ۴ میں نے دوست کو اس قدر اشتیاق نامے لکھے کہ حروف تازہ کے خشک کرنے میں تمام زمین کی مٹی ختم ہوگئی اور دنیا ویران ہوگئی ۵ ناصح نے کہیں کہدیا کہ تجھے نصیحت کرتے کرتے میرا سر پھرنے لگا مگر تجھپر اثر نہیں ہوتا۔ عاشق دیوانہ جواب دیتا ہے کہ جب میں آوارہ پھرتا تھا تو میرے پاؤں میں زنجیر ڈالی گئی تھی۔ اب تیرا سر پھرتا ہے تو اس کو میں زنجیر سے باندھونگا۔

کیوں[۵۶] نہ مجھ سے رم وہ مہوش اب زیادہ تر کرے
بدگماں ہے سبعۂ سیّارہ کی تسخیر سے

یاس[۵۷] محوِ قطعِ آز اور شوق بیتابِ جواب
باندھتے ہیں نامہ بالِ ہدہدِ تصویر سے

جی رُکے ہے ضبط کرتے کرتے میں تو مر گیا
ناک میں آیا دم اس آہِ ستم[۵۸] تاثیر سے

صبح[۵۹] کیونکر ایک دم میں ہوگئی شامِ فراق
کیا اثر ہوتا تھا تم کو نالۂ شبگیر سے

کہتے[۶۰] ہیں سب یہ رہا آوارہ بعدِ قتل بھی
ہوگئی کتنی مری نام آوری تشہیر سے

اُن کو جلدی جانے کی مجھکو عذابِ جانکنی
دونوں کا دم ناک میں ہے موت کی تاخیر سے

میں[۶۱] نے سوچا آپ اپنے خونِ ناحق کا جواب
نام اُس کا سینے پر لکھا ہے نوکِ تیر سے

[۵۶] سبعہ سیارہ کی تسخیر = ساتوں سیاروں کو قابو میں لانے کا عمل۔ جب سے میں نے تسخیر سیارہ کا عمل پڑھا ہے وہ ماہوش بدگمان ہوکر مجھ سے اور زیادہ وحشت کرنے لگا ہے۔ کیونکہ وہ "ماہوش" ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو بھی سبعۂ سیارہ میں سے سمجھتا ہے۔ [۵۷] آز = حرص۔ "خواہش" مایوسی اُمید کے قطع کرنے میں مصروف ہے اور شوق جواب نامہ کے حصول کے لئے بیتاب ہے۔ اسلئے ہم تصویر کے ہدہد کے بازو سے اپنا خط باندھتے ہیں۔ ہدہد تصویر کا وجود و عدم برابر ہے اُس کے بازو سے خط باندھنے کی وجہ یہ ہے کہ مایوسی نے جواب سے بے نیاز کر دیا ہے۔ مگر چونکہ شوق بے تاب ہے۔ اسواسطے دل کو بہلانے کے لئے باندھ دیتے ہیں۔ ہدہد کی نامہ بری کا قصہ مشہور ہے۔ [۵۸] ستم تاثیر = جو ستم کا اثر رکھے۔ آہ کو ستم تاثیر اسلئے کہا کہ جو ستم یار کا نتیجہ ہے (یعنی موت) وہی آہ کا نتیجہ ہے۔ [۵۹] میں نے پچھلے پہر نالہ کیا اور شام فراق غیر متوقع طور پر اچانک صبح سے مبدل ہوگئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم پر میرے نالے نے اثر کیا اور تم نے گھبرا کر نالہ کے ختم یا صبح کے آغاز ہونے کی دعا کی۔ ورنہ میری فریاد میں تاثیر کہاں۔ [۶۰] مرنے کے بعد میری نعش کو تشہیر کرایا گیا جس پر لوگوں نے کہا کہ یہ (عاشق) زندگی میں تو آوارہ تھا ہی۔ "مرنے کے بعد بھی وہی آوارگی رہی"۔ عاشق اس چرچے کو ذریعۂ ناموری سمجھتا ہے۔ [۶۱] میں نے آپ اپنے خونِ ناحق کے سوال کا جواب سوچ لیا۔ یعنی قاتل کا نام اپنے سینہ پر نوک تیر سے لکھ رکھا کہ تفتیش کرنیوالوں کو زحمتِ جستجو نہ ہو۔

غیر کے خط لکھنے کو تم نے تراشی ہے قلم[۱۱] | ورنہ میرے استخواں کیوں ہوگئے قطگیر سے[۱۲]
مار ڈالا ہم کو جورِ گردشِ ایام نے[۱۳] | بڑھ گئی رات اپنی روزِ حشر کی تقصیر سے

مومنؔ اب پڑھتا ہوں وہ مضمونِ بسمل کی غزل[۱۴]
شوخیوں کو جس کے دعویٰ ہو رمِ نخچیر سے

کہئے[۱۵] فسانہ سا تھ سوئے کب کسی تدبیر سے | نیند آتی ہے ہمارے خواب کی تعبیر سے
ہائے پھر مر نے لگا میں لطف کی تقریر سے | اُس کا دم[۱۶] بھی کم نہ تھا ہرگز دمِ شمشیر سے
بزمِ دشمن سے نہ اُٹھے وہ کسی تدبیر سے | مل گئے ہم خاک میں محشر تری تاخیر سے
میرے[۱۷] لکھے کو مٹا یا آپ نے اچھا ہوا | تھا شگوں ہی مدعایاں نامہ کی تحریر سے

[۱۲] قطگیر = قط زن یعنی ہڈی کا پتلا سا ٹکڑا جس پر قلم کو رکھکر قط دیتے ہیں۔ استخوان کو لاغری کے لحاظ سے قطگیر سے تشبیہ دی ہے۔ [۱۳] میری شبِ فرقت اس قدر طویل و مہیب ہے کہ اُس کی صبح اگر ہوسکتی ہے تو صبح روزِ حشر ہی ہوسکتی ہے۔ جس قدر روزِ حشر کے آنے میں کوتاہی ہوئی میری شبِ ہجر دراز ہوئی۔ اگر گردشِ ایام مخالف نہ ہوتی تو یہ نوبت کیوں آتی۔

[۱۴] مضمونِ بسمل = پھڑکتا ہوا مضمون۔ رمِ نخچیر = شکار کا بھاگنا۔ ایسا مضمونِ بسمل پڑھتا ہوں جسکی شوخی کو صیدِ رم کردہ کی شوخی سے برابری کا دعویٰ ہو۔

[۱۵] ہم نے دوست سے ہمخواب ہونے کا خواب دیکھا اور اُس سے جاکر تعبیرِ خواب بیان کرنے لگے۔ مگر وہ ستم ظریف اُس کو افسانہ سمجھکر سوگیا اور ہمارا خواب بے تعبیر رہ گیا۔ قاعدہ ہے کہ افسانہ سُنکر نیند آجاتی ہے۔ افسانہ میں پہلو یہ ہے کہ یہ امید افسانہ کی طرح بے اصل ہے۔ [۱۶] پہلے دم کے معنی گفتگو اور دوسرے کے معنی دھار۔ [۱۷] میرے لکھے (نامہ) کو محبوب نے مٹا دیا۔ میں نے اُسکے طرزِ عمل سے یہ فالِ نیک لی کہ وہ میرے لکھے (نوشتۂ تقدیر) کو مٹا دیگا اور میرے بھلے دن آئینگے یعنی خط سے مقصود عرضِ حال نہ تھا بلکہ شگون لینا منظور تھا۔

جا[۴] ئے شربت مرتے دم بھی خوں پلایا ہائے ہائے
مُنہ مرا کھولا ستم پیشہ نے نوکِ تیر سے

ایسے[۵] نازک کے شمائل کیوں نہ دل میں نقش ہوں
کھنچ گیا سینہ پہ نقشہ غیر کی تصویر سے

کب[۶] لگا اے کاسہ گر اُس لب سے جام اس خاک کا
کام ہونے کا نہیں پھر فائدہ تدبیر سے

کاٹتا[۷] ہوں عرض سوزش میں زباں کو دمبدم
میرے وندانِ ندامت کم نہیں گلگیر سے

اٹھے[۸] جنوں اپنی اسیری بعد مردن بھی ہی
حلقۂ ماتم میں آئے حلقۂ زنجیر سے

کب[۹] ہمارے ساتھ سوتے ہیں کہ دیکھیگا کوئی
اُن کو بیتابی ہے کیوں اس خواب بے تعبیر سے

تم[۱۰] سے وہ کرتا ہے باتیں رشک سے روتا ہوں میں
سچ کہا جھڑتے ہیں موتی غیر کی تقریر سے

---

[۴] حالت نزع میں پیاس زیادہ ہوتی ہے اس لئے شربت پلایا جاتا ہے - ظالم نے آخر وقت بھی ظلم میں کمی نہ کی - یعنی میرا مُنہ کھولا تو نوک تیر سے - اور پلایا تو خون - [۵] شمائل = شکل - اُسکی نزاکت کا یہ عالم ہے - کہ جب اُس نے غیر کی تصویر اپنے سینے سے لگائی تو سینہ پر غیر کا نقشہ کھنچ گیا - بھلا ایسے نازک کی شکل کیوں نہ دل میں کھُب جائے - واضح رہے کہ نازک چیز جلد اثر قبول کر لیتی ہے اسلئے غیر کا نقشہ کھنچ گیا - [۶] کاسہ گر = کسگر - پیالہ بنانے والا - مراد یہ ہے کہ میری خاک کا جام بنے تو بھی معشوق مُنہ سے لگانے والا نہیں - [۷] مجھے ندامت ہے کہ میں نے کسی سے سوزش محبت کا بیان کیوں کیا - اسی لئے ہنگام عرضِ سوزش اپنی زبان کو وندانِ ندامت سے کاٹتا ہوں - جس طرح گلگیر سے شمع کو کاٹا جاتا ہے - زبان کو شمع اور دندان کو گلگیر سے تعبیر کیا ہے - [۸] یعنی زندگی میں حلقہ زنجیر میں اسیر تھے - مرنے پر نعش احباب کے حلقہ ماتم میں گھری ہوئی ہے - [۹] وصال یار کی تمنا خواب بے تعبیر ہے جس کے پورا ہونے کی اُمید نہیں - اسلئے اس (معشوق) کی بے تابی لا حاصل ہے - کیونکہ جب ہمخوابی اَمر محال ہے تو اندیشہ رسوائی بے بنیاد - [۱۰] معشوق نے تعریف کے طور پر کہا کہ غیر (رقیب) کی تقریر سے موتی جھڑتے ہیں - عاشق جواب دیتا ہے کہ یہ سچ ہے - کیونکہ جب وہ تم سے باتیں کرتا ہے تو میں رشک سے روتا ہوں - چونکہ میرے آنسو موتی ہیں - اسلئے اس لحاظ سے ضرور اُسکی تقریر سے موتی جھڑتے ہیں -

نالہ[۱۱] ہائے بوالہوس نے کھو دیا آزارِ شوق
لو ہم اچھے ہو گئے درمانِ بے تاثیر سے

ساتھ[۱۲] سونا غیر کے چھوڑا اب تو اے سیمیں بدن
خاک میری ہو گئی نایاب تر اکسیر سے

عشق[۱۳] اُس قاتل کا بعدِ قتل بھی ہم کو رہا
ہے یہ کیسا جرم جو جاتا نہیں تعزیر سے

سر پٹکتا ہے قلق میں مومنِ خانہ خراب
مسجدیں رہتی نہیں کیا فائدہ تعمیر سے

مومن[۱] سوئے شرق اُس بُتِ کافر کا تو گھر ہے
ہم سجدہ کدھر کرتے ہیں اور کعبہ کدھر ہے

بیہوش[۲] ہے عاشق پہ سیہ مست سے کمتر
تم مجھکو تو کہتے ہو کچھ اپنی بھی خبر ہے

کھاتا[۳] ہوں محبت میں اس آداب سے میں گُل
گویا شجرِ وادیِ ایمن کا ثمر ہے

حسرت[۴] سے میں دیکھوں تو فلک کیونکہ نہو رام
اُس نرگسِ جادو کی نگہ پیشِ نظر ہے

[۱۱] رقیب نے دوست کی محبت ظاہر کرنے کے لئے نالے کیئے۔ ہم نے اس رشک میں آزارِ محبت ہی سے پرہیز اختیار کیا اور بیماریِ (عشق) سے شفا پائی۔ رقیب کے نالوں کو درمانِ بے تاثیر قرار دیا ہے درمان اسلئے کہا کہ اُنکی بدولت آزارِ شوق جاتا رہا۔ بے تاثیر اسلئے کہ اُسکے نالے خلوص سے خالی تھے۔ درمانِ بے تاثیر سے اچھا ہو جانا نئی بات ہے
[۱۲] عشق میں مٹ کر میری خاک اکسیر سے بھی زیادہ نایاب ہو گئی۔ اب تو رقیب سے اختلاط چھوڑ۔ سونا۔ سیمیں بدن۔ اکسیر۔ خاک میں شاعرانہ رعایت ہے۔ [۱۳] قاتل نے ہمیں جرمِ عشق میں قتل کیا۔ مگر قتل ہو کر بھی عشق (جُرم) نہ گیا
[۱] یعنی اُسکے گھر کی سمت سجدہ کرنا چاہئے تھا کہ وہی اپنا کعبہ ہے۔ [۲] اگر میں بیہوش ہوں تو تم سیہ مست ہو۔ نہ تم مجھے الزام دے سکتے ہو نہ میں تم کو۔ [۳] گُل کھانا = داغ کھانا۔ شجرِ وادیِ ایمن = وہ درخت جہاں سے حضرت موسیٰ کو تجلی الہیٰ نظر آئی تھی۔ وادی کوہ طور کے سیدھی طرف تھی۔ اسلئے وادی ایمن (جانب راست) کہلاتی ہے [۴] محبوب کی نرگسِ جادو (چشمِ سحر فن) کی نگاہ ہر وقت میری آنکھوں میں پھرتی ہے۔ اسوجہ سے میری آنکھوں میں تسخیر کا اثر پیدا ہو گیا ہے۔ یہانتک کہ اگر عالمِ حسرت میں آسمان کی طرف دیکھوں تو وہ بھی مطیع و مسخر ہو جائے

خط کی مجھے قاصد کو ہے انعام کی خواہش
میں دست نگر خود ہوں وہ کیا دست نگر ہے

ارمان[5] نکلنے دے بس اے بیم نزاکت
ہاں ہاتھ تصور میں مرا زیر کمر ہے

رندوں[6] پہ یہ بیداد خدا سے نہیں ڈرتا
اے محتسب ایسا تجھے کیا شاہ کا ڈر ہے

ایسے[7] دم آرام اثر خفتہ کب اٹھا
ہم کو عبث امید دعا ہائے سحر ہے

ہم حال کہے جائینگے سنئے کہ نہ سنئے
اتنا ہی تو یاں صحبت ناصح کا اثر ہے

وہ ذبح کرے اور یہاں جان فدا ہو
ایسے سے نبھے یوں یہ ہمارا ہی جگر ہے

اب بھی نہیں جاتی ترے آجانے کی امید
گو پھر گئیں آنکھیں پہ نگہ جانب در ہے

دل کھول کے مل لیجئے مومن صنموں سے
اس سال میں گر سوئے حرم عزم سفر ہے

دل[8] میں اس شوخ کے جو راہ نہ کی
ہم نے بھی جان دی پر آہ نہ کی

پردہ[9] پوشی ضرور تھی اے چرخ
کیوں شب بوالہوس سیاہ نہ کی

تشنہ[10] لب ایسے ہم گرے مے پر
کہ کبھی سیر عیدگاہ نہ کی

[5] شاعر بیم نزاکت یار سے (جو تصور میں بھی ارمان نکلنے دینے سے مانع ہے) مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ میرا ہاتھ تصور میں اُسکے زیر کمر ہے - اب تو کوئی اندیشہ کی بات نہیں۔ [6] یعنی بادشاہ کے ڈر سے تو خدمت احتساب بجالاتا ہے مگر رندوں کی دل شکنی کرنے میں خوف خدا نہیں کرتا۔ [7] صبح کا وقت آرام کا ہوتا ہے۔ اسلئے ایسے وقت اُٹھنا ناگوار ہوتا ہے۔ ہمیں "دعاے سحر" کی اجابت کی توقع ناحق ہے۔ کیونکہ ایسے آرام کے وقت سویا ہوا اثر بھلا کیوں جاگنے لگا۔ [8] آہ سے ہم ایسے متنفر ہو گئے کہ جان دیدی مگر آہ نہ کی۔ راہ نہ کی کا فاعل "آہ" ہے۔ [9] اے چرخ اگر تجھے بوالہوس کی طرفداری منظور تھی تو اُسکی شب وصل کو سیاہ کرنا چاہئے تھا۔ تاکہ اُسکا پردہ نہ کھلتا۔ شب کے سیاہ ہونے سے شب کا منحوس ہونا مراد ہے۔ شعر میں مکر شاعرانہ ہے۔ [10] چونکہ رمضان بھر سے تشنہ لب تھے۔ اسلئے عید آتے ہی شراب پر گرے

اُس[۴] کو دشمن سے کیا بچائے وہ چرخ
جس نے تدبیر خسفِ ماہ نہ کی

کون ایسا کہ اُس سے پوچھے کیوں
پرسشِ حالِ دادخواہ نہ کی

تھا[۵] بہت شوق وصل تو نے تو
کمی اے حسن تابکاہ نہ کی

عشق[۶] میں کام کچھ نہیں آتا
گر نہ کی حرص مال و جاہ نہ کی

تاب کم ظرف کو کہاں تم نے
دشمنی کی عدو سے چاہ نہ کی

مَیں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

محتسب یہ ستم غریبوں پر
کبھی تنبیہ بادشاہ نہ کی

گریہ[۷] و آہ بے اثر دونوں
کس نے کشتی مری تباہ نہ کی

تھا[۸] مقدر میں اُس سے کم ملنا
کیوں ملاقات گاہ گاہ نہ کی

دیکھ[۹] دشمن کو اُٹھ گیا بے دید
میرے احوال پر نگاہ نہ کی

مومن اس ذہن[۱۰] بے خطا پر حیف
فکر آمرزشِ گناہ نہ کی

۴ خسف یا خسوف = چاند گرہن - ضد کسوف - جب آسمان اپنے ماہ کی خسوف کی روک تھام نہ کر سکا تو اُس سے یہ اُمید رکھنا کہ میرے ماہوش کو رقیب سے دور رکھے بیہودہ ہے - چرخ از تو ہزار بار بیچارہ تر است -
۵ تاب کاہ = تاب شکن - طاقت گھٹانے والا - اے حُسن یار تو نے تو ہماری ہمت توڑنے میں اپنی سی کمی نہ کی - مگر چونکہ یہاں شوق وصل حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا اسلئے ہم عشق میں نباہ کرتے رہے -
۶ مال و جاہ کا اگر کوئی مصرف ہو سکتا تو یہ ہوتا کہ عشق میں کام آتا - مگر ایسا نہیں لہذا اُس کی حرص بے سود - ۷ آب و ہوا دونوں کشتی کی رفتار میں مُعین ہیں - مگر جب پانی اور ہوا طوفان خیز ہوتے ہیں تو کشتی تباہ ہو جاتی ہے - میری کشتی حیات بھی پانی (گریہ) اور ہوا (آہ) کی مخالف ہونے کی بدولت تباہی میں آئی - ۸ تقدیر میں محبوب سے کم ملنا لکھا تھا - ہم آغاز عشق ہی میں اس قدر مل لئے کہ جو مقدار مقدر ہو چکی تھی پوری ہو گئی - اسلئے اب ہجر کے صدمے اُٹھانے پڑے - اگر گاہ گاہ ملاقات کرتے تو یہ نوبت نہ آتی - ۹ مَیں دوست کو اپنا حال دکھا رہا تھا کہ رقیب آگیا اور وہ بیمروت اُس (رقیب) کو دیکھ کر اُٹھ گیا اور میری جانب توجہ نہ کی - ۱۰ ذہن بے خطا = غلطی نہ کرنے والا ذہن - آمرزش = بخشش -

بندھا خیال جناں[1] بعد ترک یار مجھے — کیا ہے یاس نے کیا کیا اُمیدوار مجھے

نہ آسمان کا رُخ پھیر دوں جدھر چاہوں — دیا ہے کیا طپشِ دل نے اختیار مجھے

وہ شام وعدہ جو آئے تو بیخود و سرمست — رہا وصال میں بھی وہی انتظار مجھے

وہ رند خمکدہ[2] کش ہوں کہ زہر دیتے ہیں — بتنگ آکے حریفانِ بادہ خوار مجھے

نہ ہو[3] وہ بات کہ جس سے وفا میں آئے خلل — کہیں نہ کیجیو ناصح سے شرمسار مجھے

بقدرِ[4] جوش تڑپنے کو تھا وے پسِ قتل — وہ بے قرار ہوئے آگیا قرار مجھے

اُمیدِ[5] مرگ پہ ہر فتنہ راحتِ جاں ہے — شبِ فراق میں کیا بیم روزگار مجھے

قِرانِ[6] انجم سیّارہ بُرجِ آبی میں — ڈبوئے گی مری چشمِ ستارہ بار مجھے

---

[1] یعنی "عشق صنم" (جو بمنزلہ کفر ہے) چھوڑ کر مجھے جنت کی امید بندھی - گویا اس طرف سے مایوسی ہوئی تو اُس طرف کی توقع پیدا ہوئی - [2] خمکدہ کش = میخانہ کا میخانہ پی جانے والا - حریفان بادہ خوار اسلئے تنگ آکر مجھے زہر دیتے ہیں کہ مَیں اُنکے حصّہ کی بھی پی جاتا ہوں - خمکدہ کش مومن کی خاص ترکیب ہے - [3] ناصح تمھیں بیوفا بتاتا ہے اور مَیں اُسکی تکذیب کرتا ہوں - خدا کے لئے کہیں اب بیوفائی نہ کرنا کہ اُس کا قول سچ ہو جاے اور مجھے اُس سے قائل ہونا پڑے - [4] یعنی وہ میرے تڑپنے پر بیقرار ہوئے اور مجھ سے اُن کی بیقراری نہ دیکھی گئی - [5] شبِ فراق میں مجھے فتنہ ہاے روزگار کا ڈر نہیں - کیونکہ جو فتنہ برپا ہوگا میری موت میں معین ہوگا - اور موت تو مَیں خدا سے چاہتا ہوں اور اسی امید پر ہر فتنہ کو راحت جان سمجھتا ہوں - [6] قِران = شمس کے سوا دو ستاروں کا ایک برج میں جمع ہونا - برج آبی = سرطان وعقرب و حوت - شاعر نے اپنے اشکوں کو انجم سیارہ سے اور اپنی چشم ستارہ بار (ستارہ برسانے والی) کو برج آبی سے تشبیہ دی ہے - میری آنکھوں میں آنسو جمع ہیں - گویا انجم سیارہ کا برج آبی میں قِران ہے جو کثرت باراں کی علامت ہے - یقین ہے کہ میری چشم اشکبار اس طوفان میں مجھی کو ڈبو کر رہے گی - کہا جاتا ہے کہ جب طوفان نوحؑ آیا تھا تو ساتوں سیارے برج سرطان میں جمع تھے -

اگر[۷] حساب وفا امتحاں کے بعد نہ ہو
قبول عذر ستمہائے بیشمار مجھے

شب[۸] وصال میں سب قطرہ قطرہ مَے پی لی
رہا نہ وسوسۂ چارۂ خمار مجھے

رقیب[۹] کھائے قسم تو وفا کا آئے یقیں
تو میری جان ہے کیا تیرا اعتبار مجھے

نہ سیرِ گُل نہ قدح نوشی اُسکے ساتھ ہوئی
غم خزاں ہے نہ کچھ حسرت بہار مجھے

پس[۱۰] شکستن خم زجر محتسب معقول
گنا ہگار نے سمجھا گنا ہگار مجھے

لبوں پہ جان ہے ایسی بھی کیا ہے بے دردی
نہ قرض دیتے ہو بوسہ نہ مستعار مجھے

نہ کام زور سے نکلا نہ عجز کام آیا
بس اب تو چین دیے لے شوق ہرزہ کار مجھے

خدا[۱۱] کرے ملک الموت اُنسے پہلے آئے
بہت سی لینی ہیں جانیں پہ نثار مجھے

کئے[۱۲] ہیں طول امل نے تمام کام خراب
ہمیشہ نظم جہاں کے ہیں کاروبار مجھے

ہر[۱۳] آن آن دگر کا ہوا میں عاشق زار
وہ سادہ ایسے کہ سمجھے وفا شعار مجھے

تو اب ترک صنم سچ سہی و لے مومن
یہ کیا سبب کہ سُناتے ہو بار بار مجھے

۷ تم امتحان کے نام سے مجھ پر ستمہائے بیشمار کرتے ہو۔ مجھے یہ عذر قبول ہے ۔ مگر شرط یہ ہے کہ امتحان کے بعد (جب میں وفا کی آزمائش میں پورا اتروں) مجھ سے وفا کی پابندی کا مطالبہ نہ کیا جائے۔
۸ میں نے تمام شراب پی لی اور یہ خیال نہ رہا کہ جب نشہ کے بعد اعضا شکنی (خُمار) ہوگی تو کیا پیونگا مئے سے اغلباً مئے عیش مراد ہے ۔ ۹ جان (زندگی) اعتبار کے قابل نہیں اور چونکہ تو میری جان ہے ۔ اِس لئے میں تیرا بھی اعتبار نہیں کر سکتا ۔ شوخی ملاحظہ ہو۔
۱۰ محتسب نے خود تو گناہ کیا کہ خم مئے توڑ کر ہم رندوں کی دل شکنی کی ۔ اُس پر مستزاد یہ کہ بجائے نادم ہونے کے اُلٹا ہمیں کو گنا ہگار سمجھکر ملامت کرنے لگا ۔ زجر = سرزنش ۔ جھڑکی ۔ ۱۱ اُدھر محبوب نے آنے کا وعدہ کیا ہے ۔ اِدھر میں موت کی گھڑیاں گن رہا ہوں ۔ خدا کرے ملک الموت اُس سے پہلے آئے ۔ کیونکہ اُس سے مجھے بہت سی جانیں اُس (محبوب) پر نچھاور کرنے کے لئے لینی ہیں ۔ ۱۲ طول امل = خواہشوں کی کثرت نظم جہاں = دنیا کا بندوبست ۔ طول امل کی بدولت میں نے اپنے ذمہ دنیا بھر کی فکریں لگا لی ہیں ۔ جن کی وجہ سے وہ کام جو میری ذات سے متعلق ہیں تمامتر نظر انداز ہو گئے ۔ ۱۳ آن = وقت ۔ نیز ادا ۔ میں تلوّن سے ہر بار معشوق کی نئی ادا پر عاشق ہوا ۔
مگر وہ سادگی سے مجھے وفا شعار سمجھتا رہا یعنی وفا شعاری کا اقتضا تو یہ تھا کہ ہمیشہ ایک ہی ادا کی پرستش کرتا رہتا ۔

دعا[۱] بلا تھی شبِ غم سکونِ جاں کے لئے — سخن بہانہ ہوا مرگِ ناگہاں کے لئے
نہ پائے[۲] یار کے بوسے نہ آستاں کے لئے — عبث میں خاک ہوا میل آسماں کے لئے
خلافِ[۳] وعدۂ فردا کی ہم کو تاب کہاں — امید یک شبہ ہے یاسِ جاوداں کے لئے
سنیں[۴] نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں — کہ سخت چاہیئے دل اپنے رازداں کے لئے
حجاب چرخ بلا ہے ہوا کرے بیتاب — فغاں اثر کے لئے اور اثر فغاں کے لئے
ہے[۵] اعتماد مرے بختِ خفتہ پر کیا کیا — وگرنہ خواب کہاں چشمِ پاسباں کے لئے
مزا[۶] یہ شکوہ میں آیا کہ بیمزہ ہوئے وہ — میں تلخکام رہا لذتِ زباں کے لئے

[۱] شبِ ہجر میں ضعف کی اس قدر شدت تھی کہ دعا کرنی غضب تھی - اِدھر بات کی - اُدھر دم نکل گیا -

[۲] میل = خواہش - آسماں کی خواہش تو پوری ہوگئی - کہ میں مٹکر خاک ہوگیا - لیکن اگر خاک ہوئے پائے یار یا آستانِ یار کا بوسہ نصیب ہوتا تو میں بھی سمجھتا کہ عشق کا مقصود حاصل ہوا۔

[۳] معشوق نے کل کے ملنے کا وعدہ کیا ہے - اگرچہ میں جانتا ہوں کہ اُس کا وعدہ پورا ہونے کے لئے نہیں ہوا کرتا - تاہم برائے نام آج رات بھر اُمید رہے گی - کل اگر وہ نہ آیا (جیسا کہ یقین ہے) تو یاسِ جاوداں شروع ہوجائیگی - اور میں جان دیدونگا کیونکہ مجھے خلافِ وعدہ فردا کی تاب نہیں - مطلب یہ ہے کہ باوجود ناامیدی کل تک اور اُمید سے نباہ ہونگا کیونکہ ابھی وعدہ کی میعاد نہیں گذری ہے -

[۴] نرم دل شخص میرا حال سُننے کی تاب نہیں لاسکتا - سخت دل صرف تم ہو یا رقیب ہے - اگر تم نہیں سنتے تو رقیب سے کہونگا -

[۵] پاسبان کا فرض ہے کہ شب بھر بیدار رہے - مگر پاسبانِ درِ یار اطمینان کی نیند سو رہا ہے کیونکہ اُسے میرے سوئے ہوئے مقدر پر بھروسہ ہے اور جانتا ہے کہ عاشق خود اپنی کم طالعی کی وجہ سے کاشانۂ دلدار تک نہ پہونچ سکے گا - پھر پاسبانی کی کیا ضرورت ہے

[۶] مجھے دوست سے شکایت کرنے میں اسقدر مزہ آیا - کہ برابر شکایت کئے گیا یہانتک کہ دوست بےمزہ (برہم) ہوگیا - گویا چٹورپن (شکایت کا لطف) کی بدولت مجھے یہ زہر کے گھونٹ پینے پڑے (یعنی یار کا صدمہ اُٹھایا)

لیا ہے[۸] دل کے عوض جاں دے رقیب تو لے
میں اور آپ کی سوداگری زیاں کے لیے

وہ لعل[۹] روح فزا دے کہاں تلک بوسے
کہ جو ہے کم ہے یہاں شوق جاں فشاں کے لیے

ملے[۱۰] رقیب سے وہ جب سنا وصال ہوا
دریغ جان گئی ایسے بدگماں کے لیے

کہاں وہ عیش اسیری کہاں وہ امن قفس
ہے بیم برق بلا روز آشیاں کے لیے

جنون[۱۱] عشق ازلی کیوں نہ خاک اڑائیں کہ ہم
جہاں میں آئے ہیں ویرانی جہاں کے لیے

بھلا[۱۲] ہوا کہ وفا آزما ستم سے موئے
ہمیں بھی دینی تھی جاں اسکے امتحاں کے لیے

رواں[۱۳] فزائی سحر حلال مومن سے
رہا نہ معجزہ باقی لب بتاں کے لیے

(۷۸)

اگر غفلت[۱۴] سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

موئے آغاز الفت میں ہم افسوس
اسے بھی رہ گئی حسرت جفا کی

۸ میں نے تمھیں دل کے عوض لیا ہے۔ اگر رقیب واقعی تمھارا خریدار ہے تو اپنی جان دے ورنہ میں اس سے تمھارا معاملہ کرنے اور خسارہ برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اچھا ہے اسی طرح رقیب ٹھکانے لگے۔ ۹ لعل روح فزا = لب جاں فزا۔ ۱۰ محبوب ایسا بدگمان ہے کہ میرے وصال (موت) کی خبر سنکر رقیب سے ملنے لگا۔ یعنی اس کو گمان ہوا کہ اس (عاشق) کا کسی دوسرے سے وصال ہوا ہے۔ وصال کے لفظ سے فائدہ لیا ہے۔ ۱۱ ہمارا جنون عشق ازلی (ہمیشہ سے) ہے پھر ہم کیوں نہ خاک اڑائیں الخ۔ ۱۲ وفا آزما ستم = ظلم جو وفا کی آزمائش کے لئے کیا جائے۔ ہمیں آخر تو جان دینی تھی ہی کہ دوست کی ستم شعاری کا امتحان کریں۔ اگر ہم اسکے ستم سے مرے تو اچھا ہوا کہ اسکو بھی ہماری وفا کا امتحان ہوگیا۔ مطلب یہ کہ دونوں کا مقصد حاصل ہوگیا۔ ۱۳ رواں فزائی = جاں فزائی۔ سحر حلال = وہ جادو جو جائز ہو یعنی کلام فصیح۔ مومن کے کلام پر جاں بخشی کی صفت ختم ہوگئی۔ کیونکہ اس نے اپنے کلام سے اس قدر مردے جلائے ہیں کہ اب لب بتاں کو جاں بخشی دکھانے کا موقع نہ رہا۔ ۱۴ ظالم نے پہلے تو عاشق سے غفلت کی جب متوجہ ہوا تو عنایت کے بجائے جفا شروع کر دی۔ غفلت کی تلافی جفا سے کرنا ستم ظریفی نہیں تو پھر کیا ہے

کبھی[۱] انصاف ہی دیکھا نہ دیدار — قیامت اکثر اُس کو میں بپا کی

فلک[۲] کے ہاتھ سے میں جا چھپوں گر — خبر لا دے کوئی تحت الثریٰ کی

شبِ[۳] وصل عدو کیا کیا جلا ہوں — حقیقت کھل گئی روزِ جزا کی

چمن[۴] میں کوئی اُس کوچے سے نہ آیا — گئی برباد سب محنت صبا کی

کشادِ[۵] دل پہ باندھی ہے کمر آج — نہیں خیر آپ کے بندِ قبا کی

کیا جب التفات اُس نے ذرا سا — پڑی ہم کو حصولِ مدعا کی

کہا[۶] ہے غیر نے تم سے مرا حال — کہے دیتی ہے بیباکی ادا کی

تمھیں[۷] شورِ فغاں سے میرے کیا کام — خبر لو اپنی چشمِ سرمہ سا کی

دیا علم و ہنر حسرت کشی کو — فلک نے مجھ سے یہ کیسی دغا کی

غمِ[۸] مقصد رسی تا نزع اودھر — اب آئی موت بختِ نارسا کی

---

[۱] قیامت میں مخلوق کو انصاف اور خالق کا دیدار ہوگا۔ معشوق کے کوچہ میں قیامت تو اکثر برپا ہوئی مگر "انصاف" یا "دیدار" ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔ [۲] اگر زمین کے نیچے کی کوئی خبر لا دے کہ وہاں تو آسمان اور اُسکے مظالم نہیں۔ تو میں فلک کے ہاتھ سے بچکر وہاں جا چھپوں۔

[۳] یعنی اس رات کی جلن آفتاب قیامت یا نار دوزخ کی جلن سے کم نہ تھی۔ [۴] صبا کی تمام تگ و دو کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اسکی ترغیب سے چمن میں جا کر بہار چمن دیکھیں مگر کوچہ یار کی دلاویزی ایسی نہ تھی کہ کوئی اسکو چھوڑ کر چمن کی طرف رخ کرتا۔

[۵] میں نے اپنے دل کی گرہ کھولنے پر کمر باندھی ہے اب آپکی بند قبا کی خیر نہیں [illegible] آزادی کھل کھیلوں گا۔ [۶] تمھاری اداؤں کی بے باکی صاف کہہ رہی ہے کہ میرا حال تمھیں غیر کی زبانی معلوم ہوا ہے۔ اگر تم کسی صحیح ذریعہ سے سنتے تو اس قدر بے دردی سے کام نہ لیتے۔ [۷] یعنی میرا شور فغاں تمھاری چشم سرگیں کی شوخیوں کا نتیجہ ہے۔ [۸] حصول مقصد کی حسرت ہمارے ساتھ نزع تک رہیگی۔ ادھر ہم مرے اُدھر یہ حسرت ختم ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ بخت نارسا (جو غم و حسرت کا باعث ہوا ہے) کا وجود بس ہمارے دم تک ہے

مجھے اے دل تری جلدی نے مارا
نہیں تقصیر اُس دیر آشنا کی
جفا سے تھک گئے تو بھی نہ پوچھا
کہ تو نے کس توقع پر وفا کی

کہا اُس بُت سے مرتا ہوں تو مومن
کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

۲۱۹

نہ ربط[1] اُس سے نہ یاری آسماں سے
جفا بہرِ عدو لاؤں کہاں سے

یہ حالت ہے تو کیا حاصل بیاں سے
کہوں کچھ اور کچھ نکلے زباں سے

قیامت[2] مرتے دم آئی فغاں سے
جہاں لے کر چلے ہیں ہم جہاں سے

شبِ وصل آپ کا عذرِ نزاکت
بجا ہے پر نہ مجھ سے نیم جاں سے

بُرا[3] ہے عشق کا انجام یا رب
بچانا فتنۂ آخر زماں سے

رہی[4] شب کی سی بیتابی تو ہر روز
چھپائیں گے ہم آنکھیں پاسباں سے

وہ[5] آیا خاک پر تو بھی نہ اُٹھے
ہوئے ہم کیا سبک خوابِ گراں سے

[1] جفا میں کامل اگر کوئی ہے تو معشوق ہے یا دوسرے درجہ پر آسمان۔ اور بدقسمتی یہ کہ مجھ سے دونوں سے تعلق نہیں ایسی صورت میں رقیب کے لیے جفا کہاں سے لاؤں۔ مراد یہ ہے کہ معشوق یا آسمان موافق ہوتے تو اُنکو رقیب کے ستانے پر مسلط کر دیتا۔ [2] ہم نے مرتے دم فغاں کی جس سے قیامت برپا ہو گئی اور قیامت کے آتے ہی دُنیا فنا ہو گئی۔ گویا ہم ملکِ عدم کو اپنے ساتھ ایک جہان لیکر جا رہے ہیں۔ [3] آخر زمانہ میں (قریب قیامت میں) ہزاروں فتنے اُٹھ کھڑے ہونگے جن سے احادیث کریمہ میں ڈرایا گیا ہے عاشق جو اپنے خیال میں محو ہے عشق کے انجام کو فتنۂ آخر زماں سمجھتا ہے اور اُس سے پناہ مانگتا ہے۔ [4] رات ہم بے تاب ہو کر دربار پر پہونچ گئے اور اظہارِ اضطراب کیا جس پر پاسبان سے محجوب ہونا پڑا۔ اگر یہی حالت رہی تو روز اُس سے خفیف ہونا پڑیگا [5] موت کے خوابِ گراں (گہری نیند) کا یہ اثر تھا کہ ہم معشوق کے آنے پر بھی قبر سے نہ اُٹھے اور بالآخر سبک (خفیف) ہوئے۔ گراں اور سبک میں ایہام تضاد ہے۔

مرا بچنا بُرا ہے آپ نے کیوں ۔۔۔ عیادت کی لب معجز بیاں سے

ملے دشمن سے کیونکر بیحجاب آپ ۔۔۔ نہ شرم آئی مرے شوقِ نہاں سے

مرے گھر آپ یوں جاتے تھے کس دن ۔۔۔ اُٹھانا مدعا ہے آستاں سے

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر آپ ۔۔۔ تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

گرا پنے وہم ہی سے اُس نے پوچھا ۔۔۔ (ق) مرا احوال میرے رازداں سے

نہ بولوں گا نہ بولوں گا کہ میں ہوں ۔۔۔ زیادہ بدگماں اُس بدگماں سے

نہ نکلی ہائے یوں بھی حسرتِ دل ۔۔۔ بہے سو بحر چشمِ خونفشاں سے

نہ تجلّی جلوہ فرما ہے نہ صیّاد ۔۔۔ نکل کر کیا کریں ہم آشیاں سے

اُٹھے دیوار کیا جب خانۂ غیر ۔۔۔ بنے میرے غبارِ ناتواں سے

جہاں سے تنگ تر جنت نہ ہو جائے ۔۔۔ بہت حسرت بھرا جاتا ہوں یاں سے

بُرا انجام ہے آغاز بد کا ۔۔۔ جفا کی ہو گئی خو امتحاں سے

۱۹ خدا کی بے نیازی ہائے مومن

ہم ایماں لائے تھے نازِ بتاں سے

لب معجز بیان سے عیادت کرنے کا یہ اثر ہوگا کہ میں اچھا ہو جاؤنگا اور بدستور مصائب عشق میں مبتلا ہونا پڑیگا۔ شہ میں آپ کے آستاں پر پڑا تھا۔ آپ گھر سے باہر نکلے ہیں جس سے یہ ظاہر کرنا منظور ہے کہ آپ میرے (عاشق کے) گھر جا رہے ہیں۔ مگر اصل مقصد یہ ہے کہ میں اس دھوکے میں آ کر آپ کے آستانہ سے چلا جاؤں۔ شہ یعنی کاش آنسوؤں ہی کے ذریعہ سے حسرت نکل جاتی۔ شہ شاعر نے اپنی ایذا پسندی پر زور دیا ہے۔ ثلہ میری خاکِ ناتواں خانۂ غیر کی تعمیر میں صرف ہو رہی ہے مگر ناتوانی کا اثر اب بھی باقی ہے کہ اُسکے گھر کی دیوار کا اُٹھنا دشوار ہو گیا ہے۔ اُٹھنے کے لفظ سے شاعر نے فائدہ اُٹھایا ہے۔ للہ محبوب نے پہلے عاشق پر محض امتحان کے طور پر جفا کی تھی۔ اب جفا کی عادت پڑ گئی۔ تلہ ہم بتوں کے ناز سے عاجز آ کر خدا پر ایمان لائے تھے۔ مگر خدا نے وہ بے نیازی برتی جسکی کوئی حد نہیں۔

فردیات

قلق نے شب یہ گھبرایا نہ جب وہ ماہرو آیا
کہ جب اُچھلا زمیں سے دامن گردوں کو چھو آیا

اُس ستم کیش نے یہ اپنے نصیبوں کا لکھا
خط بھی لکھا تو سلام اُس میں رقیبوں کا لکھا

(۱) جوڑا کھلا تو زلف سیہ فام میں پھنسا
چھوٹا تھا دل قفس سے سو پھر دام میں پھنسا

(۲) سینۂ مجنوں کی جانب دیکھکر رخ کیجیو
محمل لیلیٰ کہیں مت سنگ طفلاں توڑنا

(۳) عطر ملتا تھا وہ عذر بد دماغی کے لئے
دور سے دیکھا عدو کو ہاتھ مل کر رہ گیا

(۴) نہ کیونکر دیکھ مجھکو رنگ بدلے اُس پری رو کا
پلٹنا اُن نگاہوں کا اُلٹ جانا ہے جادو کا

(۵) بدایوں میں مجھے جوش جنوں لایا دلی سے
یہ کیونکر چارۂ پند خردمنداں کا ہوش آیا

(۶) وقت وداع یار عجب اپنا حال تھا
کیا کرتے ہم رہی کہ ٹھہرنا محال تھا

جانباز مومن اُس نے دیا غیر کو خطاب
ہم جان پر بھی کھیلے پہ نام اور کا ہوا

---

(۱) جوڑے کو قفس سے اور زلف کو دام سے تشبیہ دی ہے۔ (۲) یعنی جسے تم سینۂ مجنوں سمجھتے ہو وہ دل میں محمل لیلیٰ ہے کیونکہ اس میں لیلیٰ رہتی ہے۔ (۳) محبوب پہلے مجھ سے بد دماغی (بد مزاجی) کر چکا تھا۔ اب اُسکے عذر یا تلافی کے طور وہ میرے بدن میں عطر ملنے لگا۔ سو اتفاق سے سامنے رقیب نظر آگیا۔ محبوب نے اُسکے دکھانے کے لئے ہاتھ ملنے شروع کیئے تاکہ وہ سمجھے کہ عطر نہیں مل رہا ہے۔ بلکہ اُسکی (رقیب کی) محبت میں کف افسوس مل رہا ہے۔ (۴) محبوب کی نگاہوں نے مجھے دیکھا۔ جنکے اثر سے میری حالت غیر ہوگئی۔ اس پر اُسکی نگاہیں اپنی طرف پلٹیں (یعنی اپنی دلاویزی حسن کا احساس ہوا) بالآخر اس پلٹنے نے وہی تاثیر دکھائی جو جادو کے اُلٹ جانے میں ہوتی ہے (قاعدہ ہے کہ جادو اُلٹ کر جادو کرنے والے کو ضرر پہونچاتا ہے) یہی وجہ ہے کہ مجھے تباہ حال دیکھ کر اُسکا رنگ فق ہو جاتا ہے۔ (۵) حیرت ہے کہ مجھے جنوں میں ناصحوں کی نصیحت سے بچنے کی تدبیر کیسے سوجھی جو دہلی سے بھاگ کر بدایوں آیا۔ (۶) یعنی جوش بے تابی سے ٹھہرنا محال تھا پھر سفر میں محبوب کی ہمراہی کیونکر ہو سکتی

رحم کرنے کا نہیں مومن وہ کافر کیش بھی — فائدہ رونے سے سر پھوڑے سے حاصل توڑنا

تجھے ہمیں مومن کی خودداری پہ کیا کیا اعتماد — کیا خبر تھی یہ کہ یوں محوِ بتاں ہو جائے گا

تمہیں ملنا تھا دشمن سے تو ملتے — ولے یک چند ترسایا تو ہوتا

بارے[۷] محشر میں بگڑنا تو ہمیں بن آیا — کہ اُٹھے خاک سے جب وہ سرِ مدفن آیا

جان[۸] دی اور اس وفا پر امتحاں باقی رہا — حشر کی فریاد کا اُس کو گماں باقی رہا

بیٹھے[۹] زمیں سب فتنہ خیز اُس کے خرامِ ناز سے — یہ قیامت کیسی آئی آسماں باقی رہا

خیال نرگسِ میگوں[۱۰] میں مر گئے ہیں ہم — نہ کیونکہ لوگ پئیں اپنی بزمِ غم میں شراب

چلا

محروم ہوا مومن ناکام محبت — اے اہلِ محبت یہ ہے انجام محبت

در بت خانہ پر کھڑا تھا آج — مومن دیں دار کیا باعث

جس[۱۱] سے ہمیں ہے کام اُسی خودکام کے باعث — ہم نام سے صحبت ہے تو کیوں نام کے باعث

بھیج قاصد اسے دیجو و معتمد سا بھیج — تیرے واسطے میں نے دل رکھا ہے ہنگو بھیج

---

۷ بن آیا = بن پڑا۔ یعنی ہم محشر کے اُٹھائے نہ اُٹھے۔ ۸ ہم نے عشق میں جان دی مگر اس وفا کے باوجود دوست کو یہ امتحان کرنا باقی رہا کہ عاشق حشر میں میری شکایت کرے گا یا نہیں۔ ۹ اس کے خرام ناز کے فتنوں سے زمین پر قیامت آگئی مگر حیرت ہے کہ اس قیامت کے باوجود آسمان سلامت رہا۔ حالانکہ قیامت کے دن آسمان پارہ پارہ ہو جائے گا۔

اتنا ہے۔ چونکہ خرام یار کا اثر زمین تک محدود ہے۔

۱۰ نرگس میگوں = وہ آنکھ جس میں شراب کے رنگ کے گلابی ڈورے ہوں۔

۱۱ شعر کی نثر کر دینا کافی ہے۔ ہمیں جس (کسی) سے کام ہے اُسی خودکام (معشوق) کے باعث ہے۔ اگر ا...ے ہم نام سے (ہماری) صحبت ہے تو کیوں ہے (اُسی کے) نام کے باعث۔

۱۲ اُسے غیر کے پاس سنتے نہیں ہیں — زیادہ ہمیں ہوش سے بھائے ہے غش

میں تو دیوانہ ہوں مومن کا کہ ہے اس شخص کو — اس قدر وحشی مزاجی پر بھی اک عالم سے ربط

چکھتے ہیں شور محبت کا مزا لذت نصیب — تجھ سے اے ناصح کہے کیا کوئی غم کھانے کا حظ

مجھ پہ ہنستے تو ہیں پر دیکھنا روئیں گے رقیب — لبِ خنداں کی قسم دیدۂ گریاں کی قسم

خوش نہ کیونکر ہوں میں کافر کو مسلماں کر کے — مومن اُس بت نے دلائی مجھے ایماں کی قسم

بیجا کدورتوں سے تری دم ہے ناک میں — مل جاؤں کاش پر اسی کوچے کی خاک میں

۱۳ مضمون بسمل ان کے کہوں کیا عتاب میں — قاصد کی لاش آئی ہے خط کے جواب میں

۱۴ دستِ جنوں کے جایئے صدقے کہ جیب سے — پھیلائے پاؤں ہم نے گریباں کے چاک میں

۱۵ ساقیا زہر دے ہجراں میں کہ بیہوش ہوں میں — کاسۂ عمر ہو لبریز تو مے نوش ہوں میں

نہ کیوں اُٹھ جائیں اس محفل سے جب یہ طور ہم دیکھیں — لڑائے آنکھ تو غیروں سے بیٹھا اور ہم دیکھیں

ہے لطف بناوٹ کا ہم خوب سمجھتے ہیں — یہ طور لگاوٹ کا ہم خوب سمجھتے ہیں

مجھکو کیا وہم کہ آئینہ کی حیرت دیکھوں — دیکھ تو آئینہ اور میں تری صورت دیکھوں

جیوں یا مر چکوں یوں نزع کب تک — ادھر ہو جاؤں یارب یا اُدھر میں

نہ ہو تو بیٹھے بٹھائے خراب اے مومن — لڑا نہ اُس بتِ خانہ خراب سے آنکھیں

---

۱۲ ہمیں ہوش سے زیادہ غش پسند ہے۔ کیونکہ حالت غش میں محبوب کا رقیب سے اختلاط تو سننے میں نہیں آتا۔

۱۳ اُس سفاک نے میرے خط کے جواب میں بگڑ کر قاصد کی لاش بھیجی ہے اس سے زیادہ پھڑکتا ہوا مضمون اور کیا ہوگا۔ ۱۴ یعنی دست جنوں کے طفیل میں گریبان کا چاک بڑھکر پاؤں تک پہونچ گیا ہے

۱۵ یعنی ہجر میں شراب کی کسے خواہش ہے۔ زہر دے کہ بیہوش ہوجاؤں غرض میرا مے نوش ہونا یہی ہے کہ عمر کا پیالہ لبریز ہوجائے

مری تربت پہ کیا ہے کام شمع و گل کا اے یارو[۱۶] | یہاں پروانہ و بلبل کے اک دو چار پر رکھ دو

خوش آئے مجھکو صبا کب گلوں کی باغ میں بو | بھری ہوئی ہے یہاں اور ہی دماغ میں بو

بہائیں کیا کہیں اب دیدۂ اعدا سے ہم آنسو[۱۷] | کہ بن کر بہ گئی اے شوق گریہ چشم نم آنسو

یارو کسی صورت سے تو احوال جتا دو | دروازے پہ اُسکے مری تصویر لگا دو

میں تو بولا ہی نہیں کس نے کیا ہے شکوہ | جھوٹ طوفاں نہ اُٹھا خیر ہے برہم مت ہو

گریۂ شب نے بھگویا ہے اب اے آہ سحر[۱۸] | تیری گرمی سے جو بستر نہ جلے خشک تو ہو

یہ حالت بن گئی مومن ذرا کچھ منہ سے تو پھوٹو | تمھیں کیا ہو گیا یہ دل دیا کس شوخ کا ذکرو

ہو صورت خاک دل لگنے کی جنت میں بھلا مومن | مری نظروں میں ہے شاہجہاں آباد کا نقشہ

سنگ مرقد سے مرے فیض ہے سب کو مومن[۱۹] | ہوں تہِ خاک بھی طوطیِ پس آئینہ

یہ جان و دل پیام یار کی تعظیم کی ہم نے | سلام اُسکا کہا قاصد نے جاں تسلیم کی ہم نے

اے ماتم فراق اجل سے بچا بچا[۲۰] | رکھا تھا میں نے جان کو کیا تیرے واسطے

اُس نے نامہ لکھا نصیب پھرے | نامہ بر کیسا بھرا [illegible] پھرے

جہاں سے جوں خاک ہم کو روندا نہ تم سے ملتے نہ ایسے بنتے | ہوئی ہے مٹی خراب کیا کیا نہ تم سنبھالتے نہ ایسے بنتے

---

۱۶ پروانہ و بلبل کے پر اس امر کی علامت ہونگے کہ یہ عاشق کی قبر ہے۔ شمع و گل سے عاشق کو کیا کام؟

۱۷ ہماری چشم نم آنسو بن کر بہ گئی۔ اب کیا ہم رقیبوں کی آنکھوں سے روئیں۔

۱۸ گریۂ شب کے باعث میرا بستر بھیگ گیا ہے۔ اے آہ سحر اگر تجھ میں اتنی گرمی نہیں کہ بستر کو جلا دے تو کم از کم اس کو خشک ہی کر دے۔ ۱۹ اپنے سنگ مرقد کو آئینہ اور اپنے آپکو طوطی قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے مزار کی برکت سے لوگ سخن سنجی سیکھ جاتے ہیں۔ ۲۰ شاعر ماتم فراق سے (جو اجل کا سبب ہے) مخاطب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جان نذر دوست کے لئے رکھی ہے۔ تیرے لئے نہیں۔

بہا کب[21] اشک آ کر اسکی چشم سرمگیں میں ہے
عصائے آبنوسی دست بیمار حزیں میں ہے

چھیڑ دیکھو جو سُنا نالۂ موزوں میرا
غیر سے شوخ نے اشعار فغانی[22] مانگے

ستمگر پوچھتا ہے حال کیا بیمار کا اپنے
کوئی دم کا گھڑی کا لحظہ کا ساعت کا مہماں ہے

خدا کے واسطے اب تو جنوں ہو سلسلہ جنباں
کوئی دیوانۂ وحشت زدہ تا دست[23] و پا کھولے

چاک کر کھول دیا گرچہ یہ سینہ تو نے
تو بھی دل کی نہ گرہ ناخن شمشیر کھلی

جنبش[24] نہ دیجے ابروے خوش خم کو دیکھئے
تیغ ستم کو دیکھئے اور ہم کو دیکھئے

دیکھا ہے خواب میں کیس آرام جاں کو ہائے
غش پہروں آپ جان کے رہتے ہیں ہم پڑے

ہجر کی شب اور یاد زلف نے لوٹا مجھے
جی وہ آ کر لے گئی اور دل یہ آ کر لے گئی

لچھے ریشم کے نہ ہاتھوں میں پہن
دیکھ نازک ہے کلائی تیری

باقی نہیں رہا ہے کچھ تن میں حال اپنے
اک ایک موے سر ہے سر کا دبال اپنے

جو بعد مرگ بھی اُلفت کا کچھ اثر ہو جائے
ہماری خاک پہ ہو جائے یار پر ہو جائے

یاں[25] یہ ٹھہری ہے کہ اب بیڑی پنہائی چاہیئے
اُنکو مقناطیس کی چوکھٹ لگانی چاہیئے

کافر اتنے بنا نا تھا یہ کیا کیا بتو
مومن سے مل کے تم بھی مسلمان ہو گئے

دو ہی دن ہے شب و روز غم و شادی مومن
کچھ ہمیشہ نہ رہے گا نہ رہا یاد رہے

---

[21] چشم یار کو بیمار سے اور اُسکے سرمہ آلود اشک کو جو آنکھ سے بہ کر آیا ہے عصائے آبنوسی سے تشبیہ دی ہے

[22] فغانی - ایران کے مشہور شاعر کا تخلص ہے - مراد یہ ہے کہ میری فغاں سے مقابلہ کرنے کے لئے محبوب نے کلام فغانی طلب کیا - [23] تاکہ ہاتھ کو آزادی سے جامہ دری کا اور پاؤں کو صحرا نوردی کا موقع ملے -

[24] یعنی کہاں تیغ ستم (ابرو) اور کہاں ہم ناتواں - [25] میرے احباب نے میرے لئے بیڑی تجویز کی ہے تاکہ در یار پر نہ جا سکوں - اب اگر محبوب کا آستانہ سنگ مقناطیس کا ہوا تو کام بنجائیگا کیونکہ میری آہنی زنجیر خود بخود کھنچ کر وہاں جا لگے گی -

مُعَمّیات

(۱) مُعمّا بہ اسم مومن

کیفیّتِ وصال بس اب کچھ نہیں رہی	کیونکر نہ ہوں ملول میں شب کچھ نہیں رہی

(۲) ایضاً

ازل سے جی ہے لگا سینہ سیر حاصل ہے	یم سرشک سے شاداب گلشنِ دل ہے

(۳) مُعمّا بہ اسم غلام علی خاں

قید بے حد ہے خانہ بے در ہے	تو بھی صاحب غلام سے ملئے

(۴) مُعمّا بہ اسم میر محبوب علی

مرحبا رقیب رشک سے گو ہے وصال یار	ہے اُس کی چشم شوخ ادا میرے واسطے

حل - مُعمّا نمبر(۱) - ''ملول میں'' سے شب (یعنی ''لیل'') نکال دیجائے تو مومن باقی رہے گا۔
اس طرح - م ل ہ ل م ی ن

ل ل ی

م و م ن

مُعمّا نمبر(۲) - ازل کے اعداد (۳۸) میں جی کے اعداد (۱۳) ملا دئے جائیں تو ۵۱ ہوتے ہیں علیٰ ہذا یم کے عدد (۵۰) میں سرِ اشک یعنی (ا) اور دل کے عدد (۳۴) جوڑے جائیں تو ۸۵ ہوں - (۵۱) اور (۸۵) کی میزان ۱۳۶ ہے جو مومن کی ہم عدد ہے۔
مُعمّا نمبر(۳) - قید کی حد یعنی د دور کرنے سے قیـ رہ جاتی ہے - اس کے اعداد (۱۱۰) لفظ علی کی اعداد کے برابر ہیں - خانہ کا در (حرف آخر) گرانے سے خاں بنتا ہے - اب علی خاں کو غلام سے ملا دیجئے
مُعمّا نمبر(۴) مرحبا یعنی میر (امراز مدن) ہے یہاں سیّد مراد ہے - یار کو عربی میں محبوب کہتے ہیں - اسی طرح چشم کی عربی عین (ع) اور میرے واسطے کی عربی لی ہے - ع اور لی کے ملانے سے علی ہوتا ہے۔

(۵) مُعمّا بہ اسم مہتاب رائے

بنے کیونکر کہ ہے سب کار اُلٹا
ہم اُلٹے بات اُلٹی یار اُلٹا

(۶) مُعمّا بہ اسم نواب مصطفٰے خاں بہادر

نوا بلبل کی بے بس کر رہی ہے
بہار اک جام بے جا بھر رہی ہے

صدا بے درد قمری کی بلا ہے
سرِ طاقت بھی جس کا نقشِ پا ہے

فلک کو کل نہیں بے جور و بیداد
سرِ مے کیا ہو گو ہے فصلِ خورداد

کہ وہ سروِ خراماں یاں نہیں ہے
سرور اپنا تو اب امکاں نہیں ہے

بہار سبز پا کے پاؤں لوٹیں
کہ دردِ بیحد حسرت سے چھوٹیں

مُعمّا نمبر (۵) - لفظ ہم کو اُلٹنے سے مہ بنجاتا ہے اسی طرح بات اور یار کے اُلٹنے سے تاب رائے

مُعمّا نمبر (۶) - بُلبل کے اعداد (۶۴) میں سے بس کے اعداد (۶۲) منہا کرنے سے ۲ باقی بچتے ہیں - یہی ب کے عدد ہیں - نوا میں ب شامل کرنے سے نواب ہوا - جام میں سے جا خارج کرنے سے م حاصل ہوئی - اب صدا میں سے درد (یعنی دا جو عربی میں درد کا مترادف ہے) خارج کیا ص بچا - سرِ طاقت سے حرف ط مراد ہے - فلک سے کل دُور کرنے سے ف اور سرِ مے کاٹنے سے یے حاصل ہوئی - ان سب حروف کا مجموعہ مصطفٰے ہوا اب (سروِ خراماں) میں سے سرور اپنا (یعنی سرور ما) خارج کر دیا جاسے تو خان رہجاتا ہے اسی طرح بہار کا پاؤں (ر) اور درد کی حد (آخری د) دور کرنے سے لفظ بہادر بنتا ہے -